مسائل

زکوٰۃ

www.KitaboSunnat.com

مولانا محمد ایوب صاحب

ناشر
مکتبہ قہر الساجد
اردو بازار ــــ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کی جدوجہد آزادی

مسائل، افکار اور تحریکات

ڈاکٹر معین الدین عقیل

www.KitaboSunnat.com

ناشر

مکتبۂ تعمیرِ انسانیت

اُردو بازار ـــــ لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

بار اول : ۱۹۸۴ء

ناشر : مکتبہ تعمیر انسانیت۔ اردو بازار لاہور

مطبوعہ: سندھ ساگر پرنٹرز۔ لاہور
۲۲/۱۰ ۔ ریٹی گن روڈ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتساب

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء

اور

۱۵ر نومبر ۱۹۷۹ء

کے نام

○ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء ـــــ سقوط مشرقی پاکستان کے المیہ کی تاریخ ہے ـــ جو ہمیں بہت کچھ سوچنے اور سنبھلنے کی دعوت دیتی ہے۔

اور

○ ۱۵ر نومبر ۱۹۷۹ء ـــــ میرے والد سید ضمیر الدین[1] کی تاریخ رحلت ہے ـــ جنہیں اس کتاب کے موضوع اور اس کی اشاعت سے بہت دلچسپی تھی۔

---

[1] پیدائش ۲۵ر جولائی ۱۹۱۲ء، بیدر (حیدرآباد دکن) جامعہ عثمانیہ سے فراغت تعلیم (۱۹۳۲ء) کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی اور مختلف مقامات حیدرآباد دکن، بیدر، اودگیر اور احمد پور میں تعینات رہے۔ ۲۷ر مارچ ۱۹۵۲ء کو پاکستان (کراچی) ہجرت کی اور نیم سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوئے۔ تمام عمر نہایت نیک نفسی، بردباری، گوشہ نشینی اور شغف علمی میں گزاری۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معروضات

زیرِ نظر کتاب میری اس کاوش پر مشتمل ہے، جس کے تحت جنوبی ایشیا میں ایک آزاد اسلامی مملکت (یا پاکستان) کے قیام کی جدوجہد کے تمام اہم محرکات اور عوامل کو ان کے عہد بہ عہد ارتقاء اور تدریجی مراحل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں بالخصوص یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے تمام مسائل، افکار اور تحریکات کے تمام ضروری پہلو اپنی سب تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ سامنے آجائیں۔

اس میں ان عوامل اور محرکات کو بھی مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی اور تحریکِ پاکستان کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو یا تو اب تک قابلِ توجہ نہیں سمجھے گئے تھے یا نظروں سے اوجھل تھے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کے قارئین کو بعض اہم عنوانات اور موضوعات و مسائل پہلی مرتبہ اس کتاب میں دیکھنے میں آئیں گے۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رکھی گئی ہے کہ تمام اہلِ علم اور طلبہ اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکیں اور ان کی دلچسپی برقرار رہے۔

دراصل یہ کتاب میری ان تقریروں کا مجموعہ ہے، جو ریڈیو پاکستان کراچی سے "تحریکِ پاکستان ـــــ منزل بہ منزل" کے عنوان سے سلسلہ وار ۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۸ء سے ۱۲ر جون ۱۹۷۹ء تک نشر ہوتی رہی ہیں۔ ان تقریروں کا دورانیہ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ پر مشتمل ہوتا تھا، اس لیے تمام موضوعات اور عنوانات کو انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کرنا ضروری تھا۔ لیکن کوشش کی گئی ہے کہ کوئی عنوان اور موضوع تشنہ اور نامکمل نہ رہ جائے۔ چونکہ حوالوں اور اسناد کی گنجائش نہیں تھی، اس لیے متعدد مؤقر مؤرخین اور مصنفین کی تصانیف سے استفادہ کرنے کے باوجود حوالوں سے احتراز کیا گیا ہے۔ عنوانات اور موضوعات کا انتخاب تمام تر میری صوابدید پر منحصر تھا، لیکن بعض مقامات پر سرکاری مشورت اور ہدایت بھی ترمیم و تخفیف کا باعث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنی ہے، لیکن ایسا محض "قائدین" کی فہرست کی ترتیب میں ہوا ہے۔ بعض قائدین اس فہرست میں لازمی شمولیت کے حقدار تھے، لیکن سرکاری مصلحتیں آڑے آ رہی تھیں ——— اور چونکہ یہ منصوبہ بنیادی طور پر ریڈیو پاکستان کا تیار کردہ تھا اس لیے ان مصلحتوں سے مفر ممکن نہ تھا۔ پھر بعض قائدین اس فہرست میں بعد میں اس طرح شامل ہو گئے کہ ۳ ستمبر تا ۸ ستمبر ۱۹۷۹ء تحریک پاکستان کے صوبائی قائدین کے تذکروں پر مشتمل میری تقاریر کا ایک اور سلسلہ نشر ہوا، جسے میں نے موضوع کی مناسبت سے پہلے سلسلہ کے قائدین کے ساتھ شامل کرنا مناسب سمجھا ہے۔ بعض قائدین قیامِ پاکستان کے بعد بھی سرگرمِ عمل رہے، لیکن ان کی خدمات کے تذکرہ کو قیامِ پاکستان کے وقت تک ہی محدود رکھا گیا ہے۔

میرے لیے اس منصوبہ کے محرک میرے عزیز دوست ڈاکٹر وقار احمد زبیری (اردو سائنس کالج کراچی) اور جناب عبدالرب شجیع (ریڈیو پاکستان کراچی) ہیں۔ شجیع صاحب نے اس منصوبہ میں غیر معمولی دلچسپی لی ہے، جس سے اس موضوع اور اس کے مقاصد سے ان کی دلی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر اس کی تکمیل کے دوران کارپردازانِ ریڈیو پاکستان میں سے جناب شمس الدین بٹ اور جناب سلیم ملک کا مستقل اور جناب مسعود چشتی کا جزوی تعاون حاصل رہا ہے۔ میں ان حضرات کا مشکور ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت برادرم ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری صاحب کی ذاتی دلچسپی کے سبب ممکن ہوئی ہے، میں ان کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۱ء — عقیل

۴۸۳/۵۱-بی، کورنگی۔ کراچی ۳۱

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست موضوعات

۱- آزاد اسلامی مملکت کے قیام کی جدوجہد ۱۳

۲- شاہ ولی اللہ کی تحریک ——— ۱۶

(۱) مقاصد و اثرات ۱۶

(۲) ان کے خاندان کی سیاسی جدوجہد ۱۹

۳- سید احمد شہید کی تحریک ۲۲

(۱) نظریات و مقاصد ۲۲

(۲) سیاسی جدوجہد ۲۵

(۳) رفقاء کی طویل جدوجہد ۲۸

۴- بنگال کی اسلامی تحریکیں ——— اور ان کے سیاسی مقاصد ۳۱

۵- انگریزوں کے خلاف خاص اہمیت کی جنگیں ——— ۳۴

(۱) جنگِ پلاسی ——— اور اس کے عالمی اثرات ۳۴

(۲) ٹیپو سلطان کی جدوجہد آزادی ۳۷

(۳) جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء ———

ا- جنگِ آزادی کے حقیقی مقاصد ۴۰

ب- جنگِ آزادی کے ممتاز قائدین ۴۳

ج- جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا خاص حصہ ۴۶

د- جنگِ آزادی کے اثرات ——— مسلمانوں پر ۴۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی تحریکیں ـــــ ۱۸۵۷ء تک ۵۱

۷۔ مسلمان مصلحین کی تحریکیں ـــــ ۱۸۵۷ء کے بعد ۵۳

۸۔ سرسید کی تحریک ـــــ

(۱) مجموعی مقاصد ۵۵

(۲) تعلیمی تحریک ۵۷

(۳) ادبی تحریک ـــــ اور اس کے سیاسی مقاصد ۵۹

(۴) سیاسی تحریک ۶۱

۹۔ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی تحریکیں ـــــ سرسید کے عہد میں ۶۳

۱۰۔ اردو ہندی تنازعہ ـــــ اور اس کے اثرات ۶۶

۱۱۔ تقسیمِ بنگال ـــــ اسباب و نتائج ۶۹

۱۲۔ جداگانہ انتخابات کا مسئلہ ۷۲

۱۳۔ مسلم لیگ کا قیام ۷۵

۱۴۔ عالمِ اسلام کی صورتِ حال ـــــ بیسویں صدی کے آغاز میں ۷۸

۱۵۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری ـــــ عالمِ اسلام کے پس منظر میں ۸۱

۱۶۔ میثاقِ لکھنؤ ـــــ مسلمانوں کی پہلی سیاسی کامیابی ۸۴

۱۷۔ علماء کی مذہبی و سیاسی تحریکوں کا پس منظر ۸۷

۱۸۔ تحریکِ ردِ عیسائیت ۹۰

۱۹۔ تحریکِ ریشمی رومال ۹۳

۲۰۔ تحریکِ ہجرت ـــــ اور علماء کی دیگر تحریکیں ۹۶

۲۱۔ تحریکِ خلافت ۹۹

۲۲۔ تحریکِ خلافت کے اثرات ـــــ ہندو مسلم سیاست پر ۱۰۲

۲۳۔ ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ ۱۰۴

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۴۔ ہندوؤں کی اسلام دشمن تحریکیں ۱۰۷

۲۵۔ آئین کا مسئلہ ـــــ اور نہرو رپورٹ ۱۰۹

۲۶۔ آئین کا مسئلہ ـــــ اور مسلمان ۱۱۱

۲۷۔ گول میز کانفرنس ـــــ اور مسلمانوں کا موقف ۱۱۳

۲۸۔ ۱۹۳۵ء کا قانون ـــــ اور مسلم لیگ کا ردعمل ۱۱۵

۲۹۔ مسلم لیگ کی تشکیلِ نو ۱۱۷

۳۰۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات ۱۱۹

۳۱۔ کانگریس کا رویہ اور مسلمان ۱۲۱

۳۲۔ وطنی قومیت اور اسلامی قومیت کا مسئلہ ۱۲۳

۳۳۔ مسلمانوں کی بیداری میں اقبال کا حصہ ۱۲۵

۳۴۔ مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا حل ـــــ اقبال کی نظر میں ۱۲۷

۳۵۔ آزاد اسلامی مملکت کے تصور کا ارتقاء ۱۲۹

۳۶۔ قراردادِ پاکستان ۱۳۲

۳۷۔ مسلم لیگ کی جدوجہد کا نیا دور ۱۳۴

۳۸۔ کرپس مشن کی تجاویز ـــــ اور مسلمان ۱۳۶

۳۹۔ "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک ـــــ اور مسلمان ۱۳۸

۴۰۔ جناح گاندھی گفت و شنید ـــــ پس منظر اور اثرات ۱۴۰

۴۱۔ شملہ کانفرنس ۱۴۳

۴۲۔ عام انتخابات ۱۴۵

۴۳۔ کیبنٹ مشن کی تجاویز ـــــ لیگ اور کانگریس کا ردعمل ۱۴۸

۴۴۔ مسلم لیگ کا راست اقدام ۱۵۱

۴۵۔ عبوری حکومت ـــــ اور مسلم لیگ ۱۵۴

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۶۔ دستور ساز اسمبلی اور لندن کانفرنس سے مسلم لیگ کا بائیکاٹ ۱۵۷

۴۷۔ مسلم کش فسادات ۱۶۰

۴۸۔ تقسیم ہند کا منصوبہ ۱۶۲

۴۹۔ قیامِ پاکستان ـــــ اور تقسیم کے مسائل ۱۶۵

۵۰۔ فسادات ـــــ اور مسلمانوں کی ہجرت ۱۶۷

۵۱۔ قیامِ پاکستان ـــــ اور بھارت کی مسلم اقلیتیں ۱۶۹

۵۲۔ کشمیر کا مسئلہ ۱۷۱

۵۳۔ سقوطِ حیدرآباد ۱۷۴

۵۴۔ جوناگڑھ اور دیگر مسلم ریاستیں ۱۷۷

۵۵۔ نظریۂ پاکستان اور اس کا ارتقاء ۱۸۰

۵۶۔ قراردادِ مقاصد ۱۸۳

۵۷۔ تحریکِ پاکستان ـــــ بطور تحریکِ اتحادِ اسلامی ۱۸۵

۵۸۔ قیامِ پاکستان کا اثر ـــــ عالمِ اسلام پر ۱۸۸

۵۹۔ تحریکِ پاکستان میں علماء کا حصہ (۱) ۱۹۱

(۲) مولانا اشرف علی تھانوی ۱۹۴

(۳) مولانا شبیر احمد عثمانی ۱۹۶

(۴) مولانا ظفر احمد عثمانی ۱۹۹

(۵) مولانا مفتی محمد شفیع ۲۰۱

۶۰۔ تحریکِ پاکستان میں صحافیوں کا حصہ ۲۰۳

۶۱۔ تحریکِ پاکستان میں اردو زبان کا حصہ ۲۰۶

۶۲۔ تحریکِ پاکستان میں شاعروں کا حصہ ۲۰۸

۶۳۔ تحریکِ پاکستان میں ادیبوں و افسانہ نگاروں کا حصہ ۲۱۱

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۴۔ تحریکِ پاکستان میں طلبہ کا حصہ	۲۱۴
۶۵۔ تحریکِ پاکستان میں خواتین کا حصہ	۲۱۷
۶۶۔ تحریکِ پاکستان میں قائدین کا حصہ	۲۱۹
(۱) نواب محسن الملک	۲۱۹
(۲) نواب وقار الملک	۲۲۱
(۳) نواب سلیم اللہ خان	۲۲۴
(۴) سید امیر علی	۲۲۶
(۵) آغا خاں	۲۲۹
(۶) عبداللہ ہارون	۲۳۱
(۷) مولانا محمد علی جوہر	۲۳۴
(۸) مولانا ظفر علی خاں	۲۳۷
(۹) مولانا حسرت موہانی	۲۴۰
(۱۰) مولوی فضل الحق	۲۴۳
(۱۱) علامہ اقبال	۲۴۶
(۱۲) مولانا بہادر یار جنگ	۲۴۹
(۱۳) چودھری رحمت علی	۲۵۲
(۱۴) قاضی محمد عیسیٰ	۲۵۵
(۱۵) پیر صاحب مانکی شریف	۲۵۷
(۱۶) میر جعفر خاں جمالی	۲۵۹
(۱۷) نواب محمد خاں جوگیزئی	۲۶۱
(۱۸) شیخ غلام حسین ہدایت اللہ	۲۶۳
(۱۹) نواب شاہنواز خاں ممدوٹ	۲۶۵

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲۰) چودھری خلیق الزماں	۲۶۸
(۲۱) نواب لیاقت علی خاں	۲۷۰
(۲۲) چودھری محمد علی	۲۷۲
(۲۳) خواجہ ناظم الدین	۲۷۴
(۲۴) حسین شہید سہروردی	۲۷۶
(۲۵) نواب صدیق علی خاں	۲۷۸
(۲۶) سردار عبدالرب نشتر	۲۸۰
۲۷۔ قائداعظم	۲۸۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزاد اسلامی مملکت کے قیام کی جدوجہد

انسانی زندگی کی تشکیل و تکمیل میں ریاست کا حصہ بڑا اہم ہے۔ اجتماعی زندگی یا معاشرے کے لئے اس کا وجود لازمی ہے۔ معاشرے کو استحکام اور صحت مند ارتقاء اس وقت حاصل ہوا ہے جب آئین اور قانون معاشرے کے اخلاقی اصولوں اور اس کے اجتماعی ضمیر کے مطابق رہے۔ اسلام اخلاق و سیاست کے اس فطری تعلق کو ایک بنیادی حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کے نظامِ فکر و عمل میں اس تصور کے لئے کوئی گنجائش نہیں کہ مذہب اور سیاست دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ ریاست کا مقصد انصاف قائم کرنا ہے اور یہ کام مذہب کا ہے کہ وہ ان اصول انصاف اور ضابطۂ اخلاق کو فراہم کرے جسے ریاست نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ انبیائے کرام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی اصول ہی یہ تھا کہ شرک ہر صورت میں ختم کر دیا جائے اور اقتدار صرف خدا کے ہاتھ میں رہے۔ خدا کے برگزیدہ بندوں نے بھی زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کی جدوجہد کی تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ مسلمانوں کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ غلامی کی حالت میں اپنے دین کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ اسلام نے مسلمانوں کا جو مزاج بنایا ہے، اس کے تحت وہ مجبور ہیں کہ باطل کے اقتدار کی، چاہے وہ اقتدار کسی نوعیت کا ہو، کھل کر مخالفت کریں اور اسے کسی صورت میں برداشت نہ کریں اور خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو سیاسی حیثیت سے عملاً قائم کرنے اور اس کے قانون کو زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری کرنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں یہی کشمکش اور جدوجہد نظر آتی ہے۔

برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے تک صورتِ حال یہ تھی کہ ساری خرابیوں کے باوجود ملک کا قانون شریعتِ اسلامی پر مبنی تھا۔ مسلم معاشرے میں ہماری ثقافت و تہذیب کی روایات بڑی مضبوط اور مستحکم تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ملک کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجتماعی نظام اسلام کے مطابق نہ تھا۔ چنانچہ اس وقت کے مسلمانوں کی کوششوں کا مقصد معاشرے میں مزید اصلاح و تبدیلی اور اجتماعی نظام کی خرابیوں کو دور کرنا تھا۔ مغربی سامراجیوں کے آنے کی وجہ سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا اور نئے حکمرانوں کی تمام کوشش اب اس بات پر تھی کہ مسلمانوں کی قومی زندگی میں جو نظریاتی زوال پیدا ہو رہا تھا اس کی رفتار کو مزید تیز کر دیں، اور اسے اس کی انتہا تک پہنچا دیں تاکہ مسلمان سیاسی، مذہبی، تہذیبی ہر حیثیت سے غلام بن جائیں اور ان کا قومی وجود باقی نہ رہے۔

ہندوستان میں یہ مسئلہ مسلمانوں کے پیش نظر اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بہت نمایاں ہو کر ابھرا۔ اس لئے کہ برطانوی سامراج کے ساتھ ساتھ اب ہندو بھی اس مقصد میں ان کے شریک ہو گئے تھے۔ ابتداءً ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے وجود کو خلط ملط ہونے سے روکنے کی ایک مؤثر اور مفید تحریک حضرت مجدد الف ثانیؒ نے شروع کی۔ ان کی تحریک احیائے دین شہنشاہ اکبر کی اس حکمتِ عملی کے ردعمل میں شروع ہوئی تھی جس کے تحت وہ چاہتا تھا کہ اسلام اور ہندو مذہب کو ملا کر ایک نیا مذہب بنائے اور اسے نافذ کرے تاکہ وہ اس طرح زیادہ عرصے تک حکمرانی کر سکے۔ مجدد الف ثانی نے اکبر کی اس حکمتِ عملی کا شدت سے رد کیا۔ اپنی کوششوں کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اس فرق کو، جو تصوف کی بعض غیر اسلامی تعلیمات کے باعث مٹنے لگا تھا، واضح کیا۔ انہوں نے اکبر کی حکمتِ عملی کے سبب ہندوؤں اور ان کی تہذیب سے مسلم معاشرے کی سالمیت اور مسلمانوں کے قومی وجود کو جو خطرہ درپیش تھا، اس کی نشاندہی کی۔ ان کی تحریک کا اہم مقصد ہی یہ تھا کہ اسلامی عقائد کو ہندومت کے ساتھ خلط ملط ہونے سے روکیں۔ اس طرح ان کی اس تحریک کی نوعیت سیاسی اثرات کی حامل ہے۔ اور بعد میں اس سے ایسی مزید تحریکیں شروع ہوئیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کے قومی وجود کو مزید استحکام بخشا۔ انہی کا اثر تھا کہ سید احمد شہید نے جہاد کا اعلان کیا اور تحریکِ مجاہدین نے ایک طویل عرصے تک دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی مسلمانوں ہی کے دم قدم سے شروع ہوئی اور انہی کے خون سے سینچی گئی۔ اس میں ناکامی کے بعد بھی اسی اضطراب اور بے چینی کے نتیجے میں کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی غلامی کو کسی صورت قبول نہیں کر سکتے، انہوں نے گاہے گاہے اسلام کے اس مزاج کا مختلف تصوراتِ آزادی اور ایک آزاد اسلامی مملکت کے تصور کی شکل میں اظہار کیا۔ اس طرح فی الحقیقت مجدد الف ثانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے لے کر تصورِ پاکستان تک ایک ہی فکر اور ایک ہی مقصد مختلف صورتوں اور مختلف تحریکوں میں کارفرما رہا اور اس سلسلے کی تمام تحریکیں دراصل اسی ایک واحد مقصد کے تحت تھیں کہ مسلمانوں کے لیے غیر اللہ کی غلامی سے نجات اور حاکمیتِ الٰہی کے حصول کے لیے جدوجہد کی جائے تاکہ یہ ملک اگر کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ ولی اللہ کی تحریک ـــــ مقاصد و اثرات

شاہ ولی اللہ کی تحریک اس وقت شروع ہوئی جب برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کا سیاسی اور اخلاقی زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اور ہندوستان میں یہ بات قریب قریب طے پا چکی تھی کہ اب یہاں مسلمانوں کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر مختلف غیر اسلامی طاقتوں کے عروج کو روک سکے اور ایک مستحکم اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لا سکے۔ غیر مسلموں کا تسلط اور بڑھتے ہوئے قدم مسلمانوں کے وجود ہی کو ختم کر دینے کے درپے تھے۔ اس کے باوجود اس وقت قوم کے خود غرض عناصر اپنی مذموم سرگرمیوں سے باز نہ آتے۔ انہوں نے معاشرے کی اخلاقی حالت کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی۔ اس صورتِ حال میں مسلمانوں کے لیے کوئی امید، کوئی مستقبل اور کوئی علاج نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اس قسم کے انتشار اور زوال میں ایسے مفکرین پیدا ہو جاتے ہیں جو واقعات کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور قوم پر طاری ہونے والے مرض کا علاج تجویز کرتے ہیں چنانچہ اقوام کی اس صورتِ حال نے شاہ ولی اللہ کو پیدا کیا۔

شاہ ولی اللہ کو قدرت نے حکیمانہ بصیرت اور ہمہ گیر ذہن عطا کیا تھا۔ انہوں نے اٹھارویں صدی کے وسط میں ہندوستانی مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کا جائزہ لیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بہت جلد آ گئی کہ سلطنت کا زوال معاشرتی نظام کی خرابی کا نتیجہ ہے اور یہ خرابی اس معاشرے کی اخلاقی تباہی کا سبب ہے جو خود غرضانہ مزاج سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس لئے ان کے خیال میں اخلاقی بہتری کی غرض سے ایک تحریک کا اجراء اس وقت کی بنیادی ضرورت تھی۔ وقت کا یہی تقاضا تھا کہ اس نظامِ حکومت کی برتری کو ختم کر کے اس کی جگہ ایسے نظام کی تعمیر کی جائے جو صحیح نظریات کا حامل ہو۔ وہ ظلم و استحصال کے نظام کو ختم کر کے عادلانہ نظام قائم کرنا اور اس کے لیے ایک منظم جماعت تیار کرنا چاہتے تھے۔ ان کے انقلابی نظریے کا مقصد "ہر بوسیدہ نظام کا خاتمہ" تھا۔ اس کے لیے آپ حسبِ ضرورت جہاد بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اپنی جدوجہد کی ابتداء میں انہوں نے بادشاہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر انہوں نے امراء کو مخاطب کیا، لیکن امراء کسی سنجیدہ اور معقول مشورے کو سننے کی صلاحیت کھو چکے تھے۔

اس کے بعد انہوں نے مایوس ہو کر نظام الملک آصف جاہ کو متوجہ کیا جو ایک تجربہ کار مدبر اور منتظم تھا، لیکن جانتا تھا کہ دہلی کا دربار اب اصلاح کے مرحلے سے گزر چکا ہے اور اسے اب کم سے کم دکن ہی کو بچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس پر شاہ صاحب کی پر درد استدعا کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس صورتِ حال میں شاہ صاحب کے سامنے روہیلوں کی ابھرتی ہوئی طاقت ہی واحد ذریعہ تھی جو اس گرتی ہوئی حالت میں مسلمانوں کے لیے نجات کا سبب ہو سکتی تھی۔ شاہ صاحب نے مسلم اقتدار کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے انہیں ذریعہ بنانا چاہا۔ ان کی نظر میں روہیلہ سردار نجیب الدولہ پر پڑیں جو اپنی مدبرانہ اور دور اندیشانہ حکمتِ عملی کے سبب یکساں مقبول تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ واحد مسلم قوت جو کچھ مدد دے سکتی تھی وہ افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی قائم کردہ نئی مملکت تھی۔ شاہ صاحب روہیلوں کے ساتھ احمد شاہ ابدالی کے تعاون کی امید کر سکتے تھے۔ انہوں نے احمد شاہ ابدالی سے بھی خط و کتابت کی جس میں مسلمانوں کے مصائب بیان کیے اور غیر مسلموں کے پنجے سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لیے جو فرائض اس پر ایک مسلمان فرماں روا کی حیثیت سے عائد ہوتے تھے، ان کی طرف توجہ دلائی۔ آخر کار نجیب الدولہ اس قابل افغان فرماں روا کی قیادت میں شمالی ہند کی مسلم حکومتوں کا اتحاد، اس وقت کی غالب قوت مرہٹوں کے خلاف منظم کرنے میں کامیاب ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ پانی پت میں عظیم فتح حاصل ہوئی۔ اس طرح شاہ صاحب کی سیاسی جد و جہد غیر اسلامی عناصر کی غارت گری سے مسلمانوں کو نجات دلانے میں، تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، کامیاب ہوئی۔

شاہ صاحب کی حقیقی عظمت اس بنا پر ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے زوال کے بنیادی اسباب پر غور کیا اور ان کا علاج معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ان کے خیال میں برعظیم کے مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کا سبب خود اسلام سے ان کی ناواقفیت ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرآن حکیم کے اصولوں پر عمل کر کے انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ ان کے تجزیے کے مطابق اس وقت کا معاشرہ عدمِ توازن کا شکار تھا۔ انہوں نے کسانوں اور دستکاروں کی معاشی فلاح و بہبود پر زور دیا۔ کیونکہ اس زمانے میں صحت مند معاشیات کی بنیاد یہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ لوگ اخلاقی اصولوں سے لاپرواہ ہو جائیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ آزادی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت اور اچھی زندگی سب کا دارومدار انصاف اور اصولِ عدل پر ہے۔ شاہ صاحب کے مقاصد میں سیاسی تدابیر کے علاوہ بعض فوری اصلاحات بھی تھیں جو خاص طور پر مسلمانوں کو ان غیر اسلامی رسوم سے نجات دلانے کے لیے تھیں، جو ان کی اخلاقی اور قومی زندگی میں معاشرے اور اس کے عقائد سے روابط کی وجہ سے رواج کے طور پر داخل ہو گئی تھیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان برعظیم کے عام ماحول کا جزو بن کر رہ جائیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ دنیائے اسلام سے ان کے تعلقات برقرار رہیں۔ ان کی نظر میں ایک اچھے اور مفید معاشرے کا حصول اسلام کی اخلاقی اور روحانی قدروں پر زور دیئے بغیر ممکن نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک قوم کی صحت کے لئے سیاسی اقتدار ضروری ہے۔ ان کی قوم کو سیاسی قوت کے زوال سے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، وہ ان کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے وقت میں سیاسی زوال کو روک نہیں سکے لیکن انہوں نے قوم کے اندر ایسی امنگیں پیدا کر دیں اور اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے عقائد کی پاکیزگی کو برقرار رکھ سکے اور اپنے عظیم ماضی سے بہتر مستقبل کی تعمیر کا عزم حاصل کر سکے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ ولی اللہ کے خاندان کی سیاسی جدوجہد

شاہ ولی اللہ کی تحریک نے برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ پر گہرے اور وسیع علمی، فکری، تہذیبی اور سیاسی اثرات مرتب کیے ہیں۔ اپنی تصانیف کے ذریعے انہوں نے اسلامی فکر اور جدوجہد کے بہت سے میدانوں میں نمایاں اثرات چھوڑے۔ وہ جانتے تھے کہ اس امر کا بندوبست کرنا ضروری ہے کہ ان کے بعد برعظیم کے مسلمانوں کے اخلاقی و سیاسی احیاء کا لائحہ عمل، جو انہوں نے ترتیب دیا تھا، جاری رہ سکے۔ یہ کام اتنا وسیع تھا کہ وہ تنہا اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے، چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے صاحبزادوں اور ایسے علماء کی ایک جماعت ترتیب دی جو ان کے نظریات سے بخوبی واقف تھے اور ان کے بلند حوصلوں سے متاثر و فیض یاب تھے۔ انہوں نے قوم کے ساتھ اپنے روابط کو وسعت دی۔ اس کی متعدد صورتیں اختیار کی گئیں شاہ صاحب کے پیروکاروں نے ان کی تصانیف کے مطابق اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لیے عام جلسے منعقد کیے اور ان کی تعلیمات کو اردو زبان میں لکھنا شروع کیا جو اس وقت کی عام فہم اور مقبول زبان بن چکی تھی۔ خود شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے اپنی تمام زندگی اپنے والد کے بلند اصولوں اور افکار و آراء کی نشر و اشاعت میں گزار دی۔ اس وقت کے عام پڑھے لکھے فرد کے لئے شاہ ولی اللہ نے قرآنِ حکیم کی جو پہلی فارسی تفسیر "فتح الرحمان" لکھی تھی اسے مزید عام فہم بنانے کے لئے شاہ عبدالعزیزؒ نے "فتح العزیز" لکھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو ان کے والد کے خیالات پر مبنی تھیں، لیکن ان کی زبان ایسی تھی کہ انہیں اوسط درجے کا تعلیم یافتہ شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا تھا۔ ان کے بیٹے اس سلسلے میں ان کی مدد کرتے۔ شاہ عبدالقادر نے قرآنِ حکیم کا ترجمہ "موضح القرآن" بامحاورہ اردو میں کیا تاکہ جو لوگ فارسی سے زیادہ واقف نہیں وہ اس کے معنی اردو میں سمجھ سکیں۔ اور شاہ رفیع الدین نے قرآنِ حکیم کا ایک اور آسان لفظی ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ دو کتابیں "اسرار المحبہ" اور "تکمیل الاذہان" تصنیف کیں، جو دراصل شاہ ولی اللہ کے فلسفے کی شرحیں تھیں۔ شاہ ولی اللہ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلسفے کی باریکیوں کے تفصیلی اور آسان تعارف کے لیے شاہ اسمٰعیل شہید نے "عبقات" نامی کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب "تقویۃ الایمان" شاہ ولی اللہ کے نظریات کی روشنی میں مسلمانوں کی ذہنی اصلاح کے لیے خاصی اہم اور معروف تصنیف ہے۔ تصنیف و تالیف کا کام اس وقت اس حد تک وسیع اور دور رس اثرات کا حامل تھا کہ اس کام کو خاصی اہمیت دی گئی اور اس خاندان کے دوسرے تربیت یافتہ علماء نے اس مقصد اور موضوع پر لاتعداد کتابیں اور رسالے لکھے اور اچھا خاصا ادب پیدا کر دیا۔ اس کام میں شاہ صاحب کے نامور فرزند شاہ عبدالعزیز اور دوسرے فرزندوں نے انکی اس روایت کو برقرار رکھا کہ دین کی تعلیم میں قرآنِ حکیم کے درس کو مرکزی حیثیت دی جائے اور اصل مذہب میں ہر طرح کے الحاق اور اضافے اور مذہبی اعمال میں ہر قسم کی بدعتوں کو، جو قرآنی تعلیم اور سنت کے ساتھ ٹکراتی ہوں، رد کر دیا جائے۔

شاہ عبدالعزیز، جو مسندِ درس پر شاہ ولی اللہ کے جانشین ہوئے، اپنے بیشمار شاگردوں کو دینی معاملات میں شدید احتیاط پسندی کی تعلیم دینے کے علاوہ ان معاشی اور سیاسی تصورات کی تبلیغ کرتے رہے جو شاہ ولی اللہ کا مطمح نظر تھیں۔ شاہ ولی اللہ کی زندگی میں سلطنتِ مغلیہ چاہے کتنی کمزور ہو گئی ہو، کم سے کم شمالی ہند میں اس کا اقتدار برائے نام رہا اور وہی ان کی تنقید کا نشانہ تھی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد انگریزوں کا سیاسی اثر بنگال کے علاوہ شمالی ہند کے دوسرے حصوں میں بھی تیزی سے بڑھ گیا تھا اور برطانیہ برعظیم میں ایک بالادست قوت بن چکا تھا۔ کوئی ایسی ریاست یا حکمران نہ تھا جو اسے دعوتِ مقابلہ دے سکتا۔ مسلم سلطنت اس طرح ختم ہو رہی تھی کہ اس کے سنبھلنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس نئی مغربی طاقت نے سلطنتِ مغلیہ کی جگہ لے لی اور کوئی مسلمان ریاست ایک باجگزار سے بہتر نہ تھی۔ اس لیے شاہ ولی اللہ کے جانشین اور پیروؤں کو اب سلطنتِ مغلیہ سے نہیں بلکہ ایک غیر ملکی قوم کی حکومت سے مقابلہ کرنا تھا۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز نے فتویٰ دیا کہ برعظیم اب دارالاسلام، یعنی وہ ملک جہاں اسلام کو برسرِ اقتدار یا کم سے کم آزاد سمجھا جا سکے، نہیں رہا۔ اس واقعے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انگریزوں نے مخصوص اسلامی شعائر میں مداخلت نہیں کی ہے، مسلمان اب دارالحرب میں ہیں۔ یعنی ایک ایسے علاقے میں ہیں جس پر اقتدار سے انہیں محروم کر دیا گیا ہے۔ اور انگریزوں کی حکومت میں مسلمان پوری آزادی سے مذہبی فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ اس لئے ان کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے!"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چونکہ اس فتوے کے وقت مغل شہنشاہ بے بسی کی حالت میں انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو گیا تھا، اور مسلمانوں کی کوئی علیحدہ منظم تحریک نہ تھی، اس لیے اس فتوے کا کوئی فوری عملی نتیجہ نہیں نکلا۔ تاہم اس نے ایک انقلابی تحریک کو جنم دیا ـــــ جس کا مقصد حکومتِ الٰہیہ کا قیام تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سید احمد شہید کی تحریک (۱)

نظریات و مقاصد:

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلمانوں نے اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں کو اختیار کرنے کی تحریک چلائی، وہاں انہیں ایک لحاظ سے حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت بھی کرنی پڑی۔ کیونکہ بالعموم حکمرانوں کو مصلحتہً یا ملکی ضروریات کے مطابق شریعت میں تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ اس ضمن میں یہ خیال درست تھا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بدقسمتی رہی کہ مذہبی اصلاح، کافر فاتحوں کے خلاف نفرت و حقارت کے ساتھ لازم و ملزوم ہوگئی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے علماء جس قسم کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے اور جس طرح کی سیاسی آزادی چاہتے تھے، اس کے لئے اب جبکہ ملک کے حالات بدل چکے تھے، اور مغربی طاقت کے قدم شمالی ہند تک پہنچ گئے تھے، صرف اصلاحی تحریک کافی نہ تھی بلکہ ایک طاقتور انقلابی تحریک کی ضرورت تھی۔ شاہ ولی اللہ کے فکر اور ان کی تعلیمات نے بیشمار افراد کے ذہن و فکر میں اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ پھر شاہ عبدالعزیزؒ کے فتوے نے الگ ہلچل مچادی تھی کہ ہندوستان اب دارالحرب ہے اور انگریزوں سے جہاد مسلمانوں کے لئے فرض ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے ایک شاگرد سید احمد شہید نے شاہ ولی اللہ کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے اور ایک ایسا نظام جو اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو، قائم کرنے کے لیے ایک انقلابی تحریک شروع کی جس کا اصل مقصد حکومتِ الٰہیہ کا قیام تھا۔

اپنی تحریک کی ابتداء میں اولاً وہ ان تعلیمات کی تبلیغ کرتے رہے جو شاہ ولی اللہ کا مطمحِ نظر تھیں۔ اس میں وہ مسلمانوں کو احکامِ شریعت کی پابندی کرنے اور غیر اسلامی رسوم اور بدعتوں اور فرسودہ رواجوں کو ترک کرنے کی تلقین کرتے اور اس طرح دراصل جہاد کی دعوت کے لیے راہیں ہموار کرتے رہے۔ دعوت و تبلیغ کے لئے ایک مخصوص طریقہ شروع کیا گیا تھا جو "محمدیہ" کہلایا۔ اس کی بنیاد ہی اسلام کی اصلیت قرار دی گئی، جو نجد کے محمدؒ بن عبدالوہاب اور بنگال کے حاجی شریعت اللہ اور تیتو میر میں بھی مشترک تھی۔ اس بنا پر تمام مغربی مصنفین اور برطانوی حکومت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوستان کی ان تحریکوں کو بھی "وہابی تحریکیں" قرار دیتی رہی۔ ان تحریکوں میں چونکہ شدید احتیاط پسندی اور سیاست میں انقلاب پسندی مشترک تھی اور نجدی تحریک اور تحریک مجاہدین نے سیاسی جدوجہد کے میدان میں بھی کام کیا ہے، اس لئے سطحی نظر سے دیکھنے والے دھوکا کھا گئے کہ دونوں ایک ہی سلسلے کی تحریکیں ہیں۔ چونکہ ان دونوں تحریکوں کی مخالفت، دونوں ملکوں میں ایک کثیر طبقے نے کی، اس لئے انگریزوں نے اس صورتِ حال سے خوب فائدہ اٹھایا اور ہندوستان کی ہر اصلاحی اور مذہبی نوعیت کی تحریک کو، جو انگریزوں کے مفاد کے خلاف ہو سکتی تھی، بدنام اور غیر مقبول کرنے کے لیے اسے "وہابی تحریک" قرار دیا، تاکہ عوام نہ صرف اس سے دور رہیں بلکہ انگریزی مفاد کی صورتِ حال پیدا کریں۔ حالانکہ نجدی مجاہدین اور ہندوستانی مجاہدین کی تحریکوں کے فکر و عمل میں کئی لحاظ سے اس قدر فرق تھا کہ ان دونوں کو ایک نوعیت کی تحریک قرار دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مثلاً وہابی علماء صرف شریعت کے قائل تھے اور انہوں نے طریقت یا تصوف کو غیر اسلامی سمجھ کر رد کر دیا تھا۔ ان کے برعکس مجاہدین شریعت اور طریقت دونوں سے وابستگی رکھتے تھے اور دونوں میں مناسب مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے۔

ان مجاہدین میں، جو سید احمد کے ساتھی تھے، اکثر پرجوش مصلحین بھی تھے۔ حقیقت میں جہاد کے لیے ان کا جوش و خروش ان کے مذہبی عقائد ہی کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے بعض ایسی اصلاحات کی تلقین کی تھی جو ہر ایک کی نظر میں قابلِ تعریف تھیں مثلاً بیواؤں کا نکاحِ ثانی، یا ایسی غیر اسلامی رسومات کو ترک کرانا جو مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر اختیار کر لی تھیں۔ یہ ان کی سرگرمیوں کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس میں خاص طور پر صالح زندگی گزارنے اور اسلامی اصولوں پر شوق اور دلجمعی کے ساتھ عمل کرنے کی تعلیم و تلقین کی جاتی تھی اور جہاد، یعنی نیک مقصد کے لئے مسلح جدوجہد کے تصور پر زور دیا جاتا تھا۔ ان کی دعوت و تبلیغ میں مسلمانوں کے لیے بے پناہ جاذبیت اور کشش تھی۔ چنانچہ ملک کے ہر گوشے سے انہیں افرادی تعاون حاصل ہونے لگا۔ مسلمانوں کی طرف سے انہیں دعوت نامے ملنے لگے کہ وہ ان کے شہروں میں جا کر ان سے بیعت کریں۔ یہ دعوت نامے منظور کر لیے گئے اور ایک کثیر تعداد نے سید احمد کی قیادت کو قبول کر لیا۔ سید احمد نے ملک کے بہت سے حصوں کا سفر کیا اور بیشتر مقامات پر قیام کیا۔ وہاں وہ بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو ان کی تقریر سننے کے لئے جمع ہوتے تھے، وعظ و تلقین کرتے۔ بہت سے لوگ ان کے مریدوں کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ لوگوں کا یہی جوش و خروش تھا جو سید احمد کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوا اور جس نے جہاد کی تنظیم کو زیادہ مستحکم اور مؤثر بنا دیا۔ انہوں نے اپنے سفر سے واپسی کے بعد دہلی میں جہاد کے منصوبے کی نوک پلک درست کی اور اس مقصد کے لیے مستعد ہو گئے۔

---

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سید احمد شہید کی تحریک (۲)

سیاسی جدوجہد:

سید احمد شہید نے اپنی سیاسی جدوجہد کا منصوبہ دراصل اسی وقت بنا لیا تھا جب وہ ڈیڑھ سال عرب میں مقیم رہے۔ ایک اطلاع کے مطابق وہ قسطنطنیہ بھی گئے تھے۔ لیکن ترکوں کے حالات اس زمانے میں ایسے نہیں تھے کہ وہ کسی قسم کی مدد کر سکتے۔ اور نہ کسی دوسری اسلامی حکومت کے حالات اس قسم کے تھے۔ چنانچہ خود سید احمد کو اپنے بل بوتے پر جہاد کے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ ان کی سیاسی جدوجہد کا رخ اولین مرحلے پر پنجاب کی سکھ حکومت کی طرف تھا۔ وہ علاقہ انکے خیال میں دارالحرب ہو چکا تھا اور جہاں سکھوں کے مسلمانوں پر ظلم کرنے اور ان کی مذہبی آزادی میں خلل انداز ہونے کی خبریں عام تھیں۔ انگریزی حکومت نے مجاہدین کی مہم میں کسی قسم کی مزاحمت یا رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ حالانکہ جہاد کی تمام تیاریاں انگریزی علاقوں میں ہو رہی تھیں۔ انگریزوں کا رویہ بظاہر غیر جانبدارانہ رہا لیکن درپردہ وہ خوش تھے۔ کیونکہ اس جنگ سے انہیں ہندوستان کی دو طاقتوں یا کم از کم ایک طاقت کے ختم ہو جانے یا کمزور ہو جانے کی توقع تھی جس کے بعد وہ فاتح اور مفتوح دونوں پر آسانی سے غلبہ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن شاید وہ سید احمد کے حقیقی ارادوں سے باخبر نہیں تھے کہ کسی طرح وہ چاہتے تھے کہ سکھوں کو شکست دے کر ان کے علاقے میں اپنی آزاد حکومت قائم کریں تاکہ اسے بعد میں چھاؤنی بنا کر انگریزوں کے خلاف مزاحمت کریں اور جہاد کریں اور انہیں ہندوستان سے نکال دیں۔

پنجاب کی سکھ حکومت سے جنگ کا فیصلہ کافی غور و خوض کے بعد کیا گیا تھا۔ سکھوں کی حکومت ظالم تھی اور اسلام اور مسلمانوں سے انتہائی درجہ عداوت رکھتی تھی۔ ان کی حکومت کا بہت بڑا حصہ ان علاقوں پر مشتمل تھا جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ بلکہ سکھ آئے دن اس کوشش میں سرگرم تھے کہ اپنی حکومت کی سرحدوں کو پٹھانوں کے وطن تک وسیع کر دیں۔ مجاہدین کا خیال تھا کہ مسلم اکثریت والے علاقے اور پٹھانوں کی مملکت کو آزاد کرا لیا جائے تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی مزید سرگرمیوں کے لیے یہ علاقہ مرکز اور محفوظ پناہ گاہ بن جائے گا۔ اس حکمتِ عملی کے تحت مجاہدین نے سکھوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ابتدا میں انہیں حوصلہ افزا کامیابی حاصل ہوئی لیکن جلد ہی رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔ سکھوں نے قبائلی سرداروں میں سازشیں کیں اور پشاور کے سردار یار محمد کو مجاہدین سے منحرف کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یار محمد پہلے تو سید احمد کو زہر دلانے میں کامیاب ہو گیا اور اس کے بعد اس نے میدانِ جنگ میں اپنے اتحادیوں سے غداری کی۔ سید احمد کو جو زہر سے محفوظ رہے تھے، اپنی مدافعت کے لئے قبائلیوں سے جنگ لڑنی پڑی۔ مخالفین کو شکست ہوئی اور پشاور نے سید احمد کی قیادت کو دوبارہ تسلیم کیا۔ سکھوں سے پھر بھوگرمنگ اور مظفر آباد کے مقامات پر لڑائی ہوئی جس میں مقامی آبادی نے سید احمد کا ساتھ دیا مگر اس مہم کا خاتمہ قریب آگیا۔ کسی مقامی شخص نے سکھوں کو بالاکوٹ کا، جو ان دنوں مجاہدین کا صدر مقام تھا، ایک متروک اور خفیہ راستہ بتا دیا اور وہ اس راستے سے ان پر حملہ آور ہوئے۔ مجاہدین نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنا دفاع کیا مگر چونکہ سکھوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ خود اس حملہ کے لیے تیار نہیں تھے، پھر سکھوں کے پاس سامانِ جنگ بھی وافر تھا، چنانچہ چھ سو مجاہدین شہید ہوئے، جن میں سید احمد اور ان کے خاص نائب اور رفیق شاہ اسمٰعیل بھی شامل تھے۔

یہ جہاد برعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں بے مثال کہا جا سکتا ہے۔ یہ پہلی عوامی تحریک تھی جو سیاسی فرض شناسی اور اضطراب سے پیدا ہوئی تھی۔ اس کا مقصد کسی تخت کو واپس لینا یا کسی خاندان کو دوبارہ برسرِ اقتدار لانا نہیں تھا بلکہ اپنے ہم مذہبوں کو غلامی اور ظلم سے نجات دلانا اور پھر مغربی اقتدار کے بڑھتے ہوئے قدموں سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس کے پسِ پشت ذاتی اغراض اور مفادات موجود نہیں تھے۔ یہ تحریک ایک قوم اور عوام کے بل پر چل رہی تھی، کسی حکومت یا فرمانروا کے زور پر نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے شعور سے پیدا ہوئی تھی جس کو ایک مفکر عالم شاہ ولی اللہ نے اپنی تعلیمات سے عام کیا تھا۔ یہ تحریک اپنی زبردست مشکلات کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ مجاہدین شمالی علاقوں کے دور دراز پہاڑوں میں لڑ رہے تھے لیکن انہیں کمک بہار، کلکتہ اور جنوبی ہند جیسے دور افتادہ علاقوں سے پہنچتی تھی۔ پھر جن مجاہدین نے جنگ کی وہ مصلح بھی تھے اور اپنے عقائد کے معاملے میں کٹر بھی۔ بعض مقامات پر اگر وہ چاہتے تو اپنے اتحادیوں کو خوش رکھنے کے لیے مصلحتاً عقائد کی سختی میں نرمی پیدا کر کے زیادہ یقینی کامیابی حاصل کر سکتے تھے، لیکن عقائد کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جوش میں انہوں نے اسے درست تسلیم نہیں کیا۔ پھر اس بات کا بھی امکان تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو انگریز ضرور مداخلت کرتے، کیونکہ وہ ایک ایسی طاقت کے عروج کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے جو اسلامی اقتدار کے احیاء کا تہیہ کر چکی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناکامی ان کے لیے ناگزیر تھی۔ وہ اپنے سیاسی مقاصد حاصل نہیں کر سکے مگر اپنے نقشِ قدم پر چلنے کی ایک شدید اور دیرپا خواہش مسلمانوں کے لیے چھوڑ گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سید احمد شہید کی تحریک (۳)

رفقاء کی طویل جدوجہد:

سید احمد کی شہادت کے بعد یہ تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ ان کے دیگر رفقاء اور پیروؤں نے اس کو بیسویں صدی کے نصف اول تک جاری رکھا۔ انگریزوں نے ۱۸۴۵ء میں سکھوں کو جنگ میں شکست دی تو ان کے قدم پنجاب میں بھی جم گئے۔ انگریزی افواج لاہور میں مقیم ہو گئیں۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کو کشمیر کا حاکم بنا دیا۔ چنانچہ مجاہدین، جو حادثۂ بالاکوٹ کے بعد سوات اور صوبۂ سرحد کے دیگر مقامات پر بس گئے تھے، ان تبدیلیوں کے نتیجے میں ہندوستان آنے یا ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور بیشتر ہیں مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔ انگریزوں کے اس نئے اقتدار کا نتیجہ تھا کہ اب مجاہدین کا تصادم براہِ راست انگریزوں سے ہو۔ ابتدا میں تو انگریز اس امر پر کچھ زیادہ فکرمند نہ ہوئے کہ رنجیت سنگھ مجاہدین کے ساتھ جنگ میں مشغول ہے لیکن جب سکھوں کی جنگ ختم ہو گئی تو اس قسم کی تحریک کا جاری رہنا کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ پنجاب اور صوبۂ سرحد میں انگریزوں اور مجاہدین کے درمیان جھڑپوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا یہ جھڑپیں ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۷ء تک مستقل جاری رہیں۔ ان لڑائیوں کے لیے مجاہدین کے ہم خیال بہار، بنگال اور دور دراز علاقوں سے خفیہ طور پر سپاہی اور چندے بھیجتے تھے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد پٹنہ میں محلہ صادق پور کو مسمار کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ تحریک کا مرکز تھا۔ پھر بھی مجاہدین کے لیے بھرتی جاری رہی اور چندے جمع ہوتے رہے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بھی مجاہدین نے سرگرم حصہ لیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء میں بھی مجاہدین پر انگریزوں کی لشکر کشی کا ذکر ملتا ہے۔ ان مہموں کو سر کرنے کے لیے انگریزوں نے علیحدہ علیحدہ سولہ باضابطہ فوجی مہمیں بھیجیں جن میں باقاعدہ فوج کی تعداد تیئیس ہزار تھی۔ آخری شدید مراحل پر ان فوجی مہموں کی تعداد بیس تک اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ یہ آخری مہمیں تھیں، جن کی تفصیلات ملتی ہیں۔ لیکن ان مہموں کے بعد بھی انگریزی حکومت اور فوج مجاہدین کی تحریک کا خاتمہ نہ کر سکی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے نصف اول تک مجاہدین نے انگریز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت کے خلاف گاہے گاہے اپنی جرأت اور شدت کا اظہار کیا۔ اس دوران بہت سے مجاہدین انگریزوں کے خلاف بعض انقلابی تحریکوں میں شامل ہو کر بھی اپنے مقاصد پورے کرتے رہے۔

جہاد کی ان مہموں کا جو انجام ہوا، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ غلط اندیشی پر مبنی تھیں یا انہیں حمایت حاصل نہیں تھی۔ مگر یہ صحیح ہے کہ مجاہدین کی راہ میں بعض شدید مشکلات حائل تھیں۔ انہوں نے ان لوگوں سے جہاد کا عزم کیا تھا جو طاقت میں ان سے کئی گنا زیادہ اور فنونِ جنگ اور سامانِ حرب سے پوری طرح لیس تھے۔ پھر انہوں نے ان حالات پر غور نہیں کیا جو قبائلی علاقوں میں جاری و ساری تھے۔ مجاہدین کی آمد سے قبل یہ علاقے بدنظمی اور لاقانونیت کے میدان بن چکے تھے۔ وہ اس علاقہ کے لئے مزید جنگ کی صورتِ حال کا سبب بنے۔ یہ واقعہ ہے کہ مجاہدین کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں لڑ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر بار کو ایک بلند مقصد کے لئے ترک کیا تھا۔ یہ مقصد اس مسلم علاقے میں ایک اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ جہاں غیر مسلموں نے اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ ایسا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ان علاقوں میں، جنہوں نے سید احمد کی قیادت کو تسلیم کر لیا ہے، قوانینِ شریعت پوری طرح نافذ نہ کیے جائیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ اکثر قبائلی جاہل ہیں اور اکثر اپنے قدیم اخلاقی معیار اور رواجوں کو شریعتِ اسلامی سمجھتے ہیں۔ ان عادات کو ایک دو دن میں نہیں بدلا جا سکتا تھا۔ جن لوگوں پر دوسرے رواجوں اور خیالات کا غلبہ ہو، انہیں سچا مسلمان بنانے کے لیے پہلے ابتدائی کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض مشکلات اور بھی تھیں جو اس صورتِ حال میں بنیادی طور پر مؤثر تھیں۔ انتقام کی روایت قبائلیوں میں ایک طویل عرصے سے قائم ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے درمیان مسلسل خانہ جنگی اور عداوتیں جاری رہتی ہیں۔ کسی موقع پر بھی ان کے لیے یہ دشوار ہوتا ہے کہ وہ ایک مشترک دشمن کے خلاف متحد ہوں۔ سکھوں نے ان کے اس مزاج سے فائدہ اٹھایا اور مجاہدین کے لیے یہ سخت رکاوٹ ثابت ہوا۔ سکھوں کو قبائلیوں کے اتحاد ہی سے فتح کیا جا سکتا تھا، مگر وہاں صورت یہ تھی کہ اگر ایک قبیلہ سید احمد کا ساتھ دیتا تھا تو دوسرا قبیلہ محض اسی وجہ سے ان کا مخالف ہو جاتا تھا۔ پھر سکھ بھی کوئی کمزور دشمن نہیں تھے۔ وہ اپنی طاقت کے ایک ایسے نشے سے سرشار تھے، جس نے حال ہی میں اپنے لیے ایک نئی ریاست قائم کی تھی۔ اور ساتھ ہی ان کی فوج جدید سامانِ جنگ سے لیس تھی، جسے مشاق یورپی سپہ سالاروں نے تربیت دی تھی۔ اس کے برعکس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجاہدین کا انحصار خفیف آمدنی پر تھا جو انہیں عطیات کی صورت میں ہندوستان سے بھیجی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ لوگ ایک ایسے علاقے میں جنگ کر رہے تھے جو ان کے گھروں سے سینکڑوں میل دور تھا اور جو چندے جمع کیے جاتے تھے ان کو میدانِ جنگ تک پہنچانے کی راہ میں ہر قسم کی دشواریاں درپیش تھیں۔ یہ ان کا محض انتہائی جوش اور جذبہ تھا جس نے انہیں دینی مدارس میں درس و تدریس اور خانقاہوں میں روحانی تربیت کے ماحول سے نکال کر نہایت طاقتور اور منظم فوج کے مقابلے میں لا کھڑا کیا تھا۔ ان عناصر نے ان کے جوش و خروش کو تاریخ کی ایک انتہائی المناک اور افسانوی مہم بنا دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنگال کی اسلامی تحریکیں۔ اور ان کے سیاسی مقاصد

"تحریک مجاہدین" کے انداز کی ایک اور تحریک جس نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں پر کاری ضرب لگائی، ـــ بنگال میں "فرائضی تحریک" تھی۔ یہ کئی اعتبار سے شاہ ولی اللہ اور مجاہدین کی تحریک سے مماثلت رکھتی تھی۔ اسے حاجی شریعت اللہ نے شروع کیا۔ اس کا اہم مقصد ان رسوم و عقائد کی اصلاح کرنا تھا جنہیں مسلمانوں نے غیر مسلموں سے روابط کے باعث اختیار کر لیا تھا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی تعلیمات کی جانب متوجہ کرایا۔ فرائض کی پابندی اور بجا آوری پر زور دیا۔ وہ تمام رسومات اور تقریبات، جن کی سند قرآن اور حدیث سے نہ ملتی تھی، بدعت قرار دے کر ترک کرنے کی تلقین کی۔ بہت جلد اس تحریک نے بنگال کے ایک وسیع علاقے میں اپنے لاتعداد پیروؤں کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار کر لی جو اسلام کے عائد کردہ فرائض کی تکمیل کو مقدم سمجھتے اور اس لیے وہ "فرائضی" کہلاتے۔ اس تحریک کا نمایاں اثر یہ تھا کہ مسلمانوں میں ہندوؤں اور ان کے تسلط کے مقابلے میں انفرادیت، اعتماد اور برتری کا احساس پیدا ہوا اور ان کی زندگی اور عمل میں سادگی، ایمانداری اور اسلامی شعائر سے قرب اور لگاؤ پیدا ہو گیا۔ یہ تحریک اپنی نوعیت کے لحاظ سے اسلامی ہونے کی وجہ سے عام مسلمانوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کی مقبولیت اور وسعت کے بعد اس میں ضرورتاً ایسی خصوصیات بھی شامل ہو گئیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس تحریک کے مقاصد سیاسی بھی تھے۔ حاجی شریعت اللہ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ بنگال اب دارالاسلام، یعنی وہ جگہ جہاں اسلام کو پورے طور پر عمل دخل حاصل ہو اور فرائض بہ آسانی ادا کیے جا سکیں، نہیں رہا۔ اس لیے عیدین اور جمعہ کی نماز اب مناسب طریقے پر با جماعت ادا نہیں کی جا سکتی۔ اس فتوے سے حاجی صاحب کا مقصد اپنے پیروؤں اور عام مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں حاجی صاحب کے انتقال کے بعد اس تحریک کی قیادت ان کے فرزند محمد محسن دودو میاں کے سپرد ہوئی۔ انہوں نے اس تحریک کو باقاعدہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منظم، سرگرم اور فعال سیاسی طاقت اور سماجی تبدیلیوں کی محرک و آئینہ دار بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

ایک دوسری تحریک جس نے انیسویں صدی کے ابتدائی وسط میں بنگال کے مسلمانوں کو متحرک کیا، ان میں جوش اور ولولہ پیدا کیا اور انہیں انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف نبرد آزما کیا، تیتو میر کی تحریک تھی۔ یہ تحریک فرائضی تحریک کے دور میں شروع ہوئی اور ایک حد تک شمالی ہند کی عظیم تحریکِ مجاہدین سے تعلق رکھتی تھی۔ اس تحریک کا آغاز بھی فرائضی تحریک کی طرح مذہبی اصلاح کے مقصد سے ہوا، اور بعد میں اس نے عوامی اور سیاسی تحریک کی شکل اختیار کی۔ اس کو بھی بہت جلد مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس نے عام مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کر دی جو انہیں اپنے مختلف حقوق کے حصول کے لیے جد و جہد پر آمادہ کرتی تھی۔ پھر ان کے خلاف انگریزوں اور ہندوؤں کی ناانصافیوں نے ان کے مذہبی جذبات کو مشتعل کیا تھا۔ تیتو میر نے انگریزی حکومت کے خاتمے اور دوبارہ اسلامی سلطنت کے قیام کا نعرہ بلند کیا تو اس سے بغاوتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر تیتو میر نے باقاعدہ اپنی متبادل حکومت کے قیام کا اعلان بھی کر دیا اور محصول خود وصول کرنے لگے۔ انگریز اس متبادل حکومت کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے؟ — اور پھر جو خود ان کے لیے ایک سنگین خطرہ بن سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ انگریزوں کی فوجی طاقت کے مقابلے میں اس تحریک کا کیا انجام ہوتا؟ مسلمانوں کا ایک ہجوم، جن کے پاس اسلحہ ناکافی تھا اور غیر تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھا، ایک باقاعدہ، منظم اور کثیر فوج کے سامنے کامیابی کا کوئی امکان نہیں رکھ سکتا تھا۔ تیتو میر کا جو انجام ہوا، اس نے ان کے پیروؤں کو اس سے باز نہیں رکھا کہ وہ ان کی تعلیمات اور مقاصد کو بنگالی مسلمانوں میں برابر پھیلاتے رہیں۔

یہ دونوں تحریکیں دین کی اصلاح سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ سیاسی بنتی گئیں۔ حالات نے ابتداءً مسلمانوں کو پہلے ہندوؤں اور پھر انگریزوں کے خلاف صف آرا کیا تھا۔ یہ پہلی تحریکیں تھیں جو ایک تو عوامی سطح پر شروع ہوئی تھیں۔ اور پھر ان کا رخ اعلانیہ ایک غیر ملکی حکومت کی طرف تھا۔ انتہائی مجبوری کے باوجود مسلمانوں کا یہ بڑا ہی جرأت انگیز قدم تھا، جو انگریزوں کے خلاف اٹھایا گیا۔ ان کی اصلاحات ایسی تھیں کہ ان کی وجہ سے مسلمان اب عملاً ایک ایسی زندگی گزار رہے تھے جو اسلام کے معیار و مقصود سے قریب تر تھی۔ سیاسی سطح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر ان تحریکوں نے مسلمانوں کو اس طرح جھنجھوڑا تھا کہ اب ان میں انگریزی عملداری کے خلاف شدید جذبہ اور آزادی کے لیے فعال تصور پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی اپنی صورتِ حال پہ مطمئن نہ رہے اور ان کا یہ جوش اور جذبہ بعد میں شروع ہونے والی مزاحمتی تحریکوں کی صورت میں نمودار ہوتا رہا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزوں کے خلاف خاص اہمیت کی جنگیں (۱)

جنگِ پلاسی — اور اس کے عالمی اثرات

محمد شاہ کے زمانے میں دہلی کی مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے صوبوں نے اپنی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ بنگال میں وہاں کے صوبے دار علی وردی خاں نے بھی اپنی آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے عہد میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ہندوستان کی سیاست میں عمل دخل شروع کر دیا تھا لیکن اس کی موجودگی میں یورپی طاقتیں بنگال کو اپنی حکمتِ عملی کا شکار نہ بنا سکیں۔ لیکن اس پر بھی علی وردی خاں ان کے عزائم سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے اپنے پوتے سراج الدولہ کو وصیت کی تھی کہ انگریزوں کو اپنے علاقے میں فوج رکھنے یا قلعہ بنانے کی اجازت نہ دینا۔ سراج الدولہ بھی، جو اس کے بعد بنگال کے تخت پر بیٹھا، انگریزوں کے استعماری عزائم سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ انگریزوں کا رویہ بھی سراج الدولہ سے بیحد مخالفانہ تھا اور وہ اس کے خلاف سازشوں میں لگے رہتے تھے۔ انہوں نے کلکتہ کے قلعے کو سراج الدولہ کی مرضی کے بغیر مستحکم کرنا شروع کر دیا اور چند نئے قلعے اور مورچے تعمیر کیے، مخالفین کو اپنے ہاں پناہ دی اور عمالِ سلطنت کو بغاوت پر ابھارا تو ان کی ایسی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں اور فریب کاریوں سے مجبور ہو کر سراج الدولہ نے بنگال سے ان کو نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن وہ ہر طرح کے اشتعال کے باوجود پہلے اس کوشش میں رہا کہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا جائیں۔ اس نے انگریزوں کو مصالحت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ خود سراج الدولہ کو اپنے راستے سے ہٹا دینے کے درپے تھے۔

سراج الدولہ کو انگریزوں کی درباری سازشوں کا علم تھا۔ ان حالات میں اس کا انگریزوں سے عناد رکھنا نقصان دہ ہوتا۔ چنانچہ اس مرحلے پر اس نے وقتی طور پر ان سے مصالحت کر لی۔ جس کی شرائط انگریزوں کی موافقت میں تھیں۔ چنانچہ انگریزوں کو مزید اپنے قدم جمانے کا موقع مل گیا اور انہوں نے سراج الدولہ کے خلاف سازشوں کا ایک جال بچھا دیا۔ جب ایک بھرپور اور مؤثر سازش مکمل ہو گئی تو سراج الدولہ کے دربار کے تمام سازشیوں سے سراج الدولہ کو انگریزوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے لڑنے کا مشورہ دلایا گیا۔ سراج الدولہ کو اپنے امیروں اور فوجی افسروں کی سازشوں کا پتہ چل چکا تھا اور اسے ان پر اعتماد نہ تھا۔ اس نے فرانسیسیوں سے مدد لینی چاہی لیکن ناکام رہا۔ اس نے مرہٹوں سے بھی مدد طلب کی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دہلی کو صورتِ حالات سے آگاہ کیا۔ لیکن وہاں سراج الدولہ کے لیے کیا رکھا تھا۔ اودھ نے بھی اس کی درخواست پر توجہ نہ دی۔ بیرونی امداد سے مایوس ہو کر اس نے اپنے سرداروں کو انگریزوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرنا چاہا، میر جعفر اور دوسرے سازشی سرداروں نے اس کے "وفادار" رہنے کی قسم کھائی۔ چنانچہ سراج الدولہ نے پلاسی کے مقام پر انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ لیکن ناکامی اس کا مقدر تھی۔

پلاسی کی جنگ یقیناً دنیا کی چند اہم اور فیصلہ کن جنگوں میں سے ہے۔ اس سے ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا خاتمہ اور عہدِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد سے انگلستان کے لیے ہندوستان میں سیاسی فتوحات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ پلاسی کی فتح ان کی پہلی اہم کامیابی تھی جو دراصل بہتر اسلحہ یا بہتر طریق جنگ یا شجاعت و مردانگی کی وجہ سے نہ تھی بلکہ انگریزوں کی مکاری، سازشوں اور عہد شکنیوں کی فتح تھی۔ اس کامیابی نے بنگال کو مکمل طور پر انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ حکومت کے ساتھ ساتھ تمام ذرائع آمدنی بھی ان کے قبضے میں چلے گئے۔ حکمران ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئے۔ بنگال کی ہی مالی اور فوجی مدد کی بدولت انگریزوں نے ایک طرف جنوبی ہند میں فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کے علاوہ ہندوستانیوں کو شکستیں دیں اور دوسری طرف شمالی ہند کی جانب آگے بڑھے۔ اس جنگ کی کامیابی نے کمپنی کے خاص تجارتی دور کا خاتمہ کیا۔ اب ایک وسیع خطۂ ملک ہاتھ آجانے سے تجارت کے ساتھ حکومت کا دور شروع ہوا۔

انگریزوں کے مقابلے میں یہ ہماری پہلی شکست تھی۔ اس شکست سے ہندوستان کا ایک بڑا محاذ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کسی حکمران میں انگریزوں کے خلاف خود اعتمادی نہ رہی۔ انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ وہ سارے برعظیم پر قابض ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس ملک پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے رفتہ رفتہ برطانیہ اور برعظیم کے درمیان تمام اڈوں اور ممالک میں اپنی سیاسی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور یوں مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک ان کے جوڑ توڑ اور سازشوں کا شکار ہو گئے۔ گویا پلاسی کی شکست دراصل تمام عالمِ اسلام کی ذلت اور غلامی کا سبب تھی۔ اس کے فوری بعد انگریزی مقبوضات میں گاہے گاہے معمولی سی بغاوتیں ہوئیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن ان کے اثرات بڑے محدود رہے۔ ان مسلح بغاوتوں سے بھی انگریز خاصے پریشان رہے۔ لیکن ان کے بعد کی ایک اہم ترین مزاحمت اور جنگ جس کے اثرات پلاسی کی جنگ سے کچھ کم نہیں رہے، ٹیپو سلطان کی جدوجہد آزادی تھی، جو دو دہائیوں تک انگریزوں کے لیے نہایت پریشان کن رہی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی بحری قوت

انگریزوں کے خلاف خاص اہمیت کی جنگیں (۲)

ٹیپو سلطان کی جدوجہد آزادی

جنگِ آزادی میں کامیابی کے بعد انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کے سامنے تین بڑی رکاوٹیں تھیں۔ حیدر علی، نظام اور مرہٹے۔ نظام نے ابتدا ہی سے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ مراسم اختیار کر رکھے تھے۔ مرہٹے پانی پت کی تیسری جنگ میں شکست کے بعد متحدہ قوت کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ ان دونوں کے برعکس حیدر علی ایک تازہ دم قوت کی صورت میں ابھرا تھا۔ اور انگریزوں کی فتوحات کے راستے میں ایک سنگین رکاوٹ بن گیا تھا۔ انگریزوں نے اس نئی ابھرتی ہوئی طاقت کو کچلنے کے لیے مرہٹوں اور نظام سے گٹھ جوڑ کیا اور حیدر علی کے خلاف بے وجہ اعلانِ جنگ کر دیا۔ چنانچہ میسور اور انگریزوں کے درمیان لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ حیدر علی کی بے وقت موت کے بعد اس کے بیٹے ٹیپو نے اس کی جگہ لی۔ وہ ایک لائق منتظم اور جواں ہمت مجاہد ثابت ہوا۔ وہ اپنے باپ کی طرح برعظیم کی نجات اس میں سمجھتا تھا کہ انگریزوں کے قدم یہاں جمنے نہ پائیں۔ اس میں اس قدر پیش بینی تھی کہ اس نے پہلے سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ برعظیم کے حکمرانوں اور سرداروں سے انگریز اقتدار چھین لیں گے۔ اس نے اپنی ساری جدوجہد سے ثابت کر دیا کہ وہ مغرب کی بڑھتی ہوئی طاقت کے حقیقی اسباب کا فہم و ادراک رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے بعض نہایت مفید اور ضروری اصلاحات نافذ کیں۔ اس کی بری اور بحری فوجوں کا انتظام قابلِ داد تھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ جانتا تھا کہ انگریز اپنی بحری قوت کی وجہ سے برعظیم میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ اس لیے اس نے بحری قوت کی طرف خاص توجہ دی۔ وہ ایک ایسا بحری بیڑہ رکھنا چاہتا تھا جو دکن کے ساحل کی پوری طرح حفاظت کر سکے۔ برعظیم کو بحری حملہ آوروں سے بچانے کے لیے ٹیپو چاہتا تھا کہ بصرہ، بوشہر، عمان اور عدن میں ہندوستانی جہازوں کے اڈے بنائے جائیں۔ ٹیپو نے انگریزوں کو برعظیم سے نکالنے کے لیے اپنے ہمسایوں کے ساتھ ایک محاذ بھی بنانا چاہا، لیکن اس کے ہمسایوں نے اسے ہمیشہ مایوس کیا۔ جب اس کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ مرہٹے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور نظام انگریزوں کی چالوں کو نہیں سمجھتے اور وہ آئے دن ان کے چنگل میں جکڑے جا رہے ہیں تو اس نے اندرونی امداد سے مایوس ہو کر بیرونی روابط کی طرف توجہ دی۔ ٹیپو کو اس امر کا یقین تھا کہ ہندوستان پر انگریزی قبضہ برقرار رکھنے کے لیے برطانیہ کو مشرقِ قریب کے اسلامی ملکوں پر بھی ایک نہ ایک دن قابض ہونا ہے۔ اس نے اس قدر زبردست دشمن کو ختم کرنے کے لیے ابتداءً شاہِ فرانس سے اور بعد میں نپولین سے خط و کتابت کی اور انہیں انگریزوں کے مقاصد بتاتے ہوئے ان سے فوجی امداد طلب کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے پہلے اپنی سفارت لوئی ہفتم اور پھر دوسری مرتبہ مارشیس بھیجی۔ ان سفارتوں کے نتیجے میں ٹیپو اور فرانس کے درمیان وسیع پیمانے پر فوجی معاہدہ کرنے کی تجویز زیرِ غور آئی۔ ٹیپو نے سلطانِ ترکی کی خدمت میں بھی سفارت بھیجی۔ اس سفارت کا مقصد خلیفۃ المسلمین سے اپنی حکومت کے لیے شاہی سند حاصل کرنا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے انگریزوں کے اثر نے شاہ عالم سے ایسی سند ملنے نہیں دی تھی۔ یہ سند دراصل ایک آئینی منظوری تھی جس کے تحت کوئی شخص قانوناً حکومت کر سکتا تھا ورنہ دیندار مسلمان ایسے حکمران کے کامل وفادار نہ ہوتے تھے جس کے پاس یہ سند نہ ہو۔ ٹیپو کو خلیفۃ المسلمین سے ایسی سند مل گئی۔ سلطان ترکی کی خدمت میں سفارت بھیجنے کا دوسرا مقصد ٹیپو کا سلطنتِ عثمانیہ سے انگریزوں کے خلاف فوجی امداد بھی حاصل کرنا تھا۔ برطانیہ کی حکمتِ عملی اور سازش نے سلطان ترکی کو ٹیپو کی مدد کرنے نہیں دی۔ عثمانیوں سے مایوس ہو کر ٹیپو نے ایران میں سفارت بھیجی، لیکن یہاں بھی برطانیہ کے اثر نے کامیابی نہ ہونے دی۔ افغانستان کے حکمران شاہ زمان نے ٹیپو کی دعوت قبول کر لی اور اس کی مدد کے لیے لدھیانہ تک پہنچ گیا تھا کہ انگریزوں نے ایران کے ذریعہ افغانستان پر حملہ کرا دیا جس کی وجہ سے اسے واپس جانا پڑا۔ اس عرصے میں انگریزوں نے دربار میں ٹیپو کے خلاف ایک بہت مضبوط سازشی جال بچھا دیا جس کی وجہ سے سلطان داخلی اور خارجی معاملات میں گھر گیا۔ وہ سازشوں سے ایک حد تک واقف تھا لیکن وہ سازشیوں کے خلاف کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ اس طرح خانہ جنگی کا اندیشہ تھا۔ اس کے بعد کی ساری داستان غداریوں سے بھری ہوئی ہے جس کا انجام ٹیپو کی شہادت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

ٹیپو نے اپنے ہر عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ اسے مستقبل کا حقیقی فہم و ادراک ہے چنانچہ اس نے اپنی ساری جد و جہد کو انگریزوں کے خلاف مزاحمت میں صرف کر دیا۔ لیکن اس کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقدر میں کامیابی نہ تھی کیونکہ اسے زبردست مشکلات کا سامنا تھا۔ کم از کم اسے یہ اطمینان ضرور ہوگا کہ اس نے اپنی کوشش میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی اور اپنے حدودِ مملکت کے دفاع میں لڑتے ہوئے جان دی۔ اس کے بعد برعظیم کے حکمران طبقے میں کوئی ایسا شخص نہ ہوا جس نے اپنے ملک کے تحفظ کے لیے اس قدر شدید مزاحمت کی ہو اور اس طرح کی مزاحمت کو اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین بنا لیا ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزوں کے خلاف خاص اہمیت کی جنگیں (۳)

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء — حقیقی مقاصد

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی برِعظیم پاک و ہند کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ یہ غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہندوستان گیر جدوجہد کی ابتدا بھی تھی اور ایک منزل بھی۔ ۱۸۵۷ء تک ہندوستانیوں کا ذہن غیر ملکی تسلط کے خلاف پورے طور پر تیار ہو چکا تھا۔ بلکہ اس وقت تک تو تحریک مجاہدین بھی ختم نہ ہوئی تھی۔ اور اس سے تعلق رکھنے والے مجاہدین شمالی سرحدی علاقوں میں انگریزوں سے برسرِ پیکار تھے اور انہوں نے اس جنگِ آزادی میں بھی شرکت کی۔ جنگِ آزادی کی ابتدا معمولی واقعات سے ہوئی۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں تمام بیتاب عناصر ابھر آئے۔ اور برِعظیم کے تمام گوشوں میں پھیل گئے۔ سوروں کی چربی سے بنے ہوئے کارتوسوں کا تو ایک بہانہ تھا، جس نے سو سال کی بے چینی کو متحرک کر دیا، ورنہ ایک عرصے سے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبات میں شدید ہیجان برپا تھا۔ ابتدا بالکل اتفاقیہ تھی، لیکن چونکہ ہر جگہ بے چینی پہلے سے موجود تھی، اس لئے جہاں بھی اس ہنگامے کی خبر پہنچی وہاں بغاوت کی آگ بھڑکتی چلی گئی۔ اگر یہ امر پیشِ نظر رہے کہ مسلمان سور کے گوشت کو اور ہندو گائے کے گوشت کو ناپاک اور حرام خیال کرتے ہیں اور اس سے انہیں کتنی نفرت اور کراہت ہے تو اس سے انگریزوں کے خلاف ناراضگی اور غم و غصہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کارتوسوں پر چربی لگنے کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ حکومت نے اس کی تردید کی۔ مگر اس سے کوئی فائدہ پہنچنے کے بجائے اور زیادہ شورش پیدا ہوئی، اس لیے کہ وہ تردید صداقت پر مبنی نہیں تھی۔ نتیجے میں حکومت کی نیت پر شبہ کیا جانے لگا کہ وہ ہندوستانیوں کے مذہبی جذبات سے انتہائی لاپرواہ ہے۔ حکومت نے اس بے چینی پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ اس نے اپنے ماتحت سپاہیوں کی طرف سے ان کارتوسوں کے استعمال سے انکار کو نظم و نسق کا سوال بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سپاہیوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے بغاوت کر دی۔ یہ خیال کرنا کہ محض ان کارتوسوں کا اجرا ہی بغاوت کا سبب بنا، غلط ہے۔ بلکہ ان کی شکایتوں کی فہرست طویل تھی۔ سپاہیوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش قدمی اس لیے کی کہ وہ انگریزوں کے ناروا برتاؤ سے عاجز آچکے تھے۔ ان پر تلک لگانے، ڈاڑھی رکھنے اور صافہ باندھنے پر اعتراضات کیے جاتے تھے۔ پھر ہندوستانی اور انگریز سپاہیوں کی تنخواہوں اور معیارِ زندگی میں نمایاں فرق تھا۔ اس فرق نے وہ احساسِ کمتری پیدا کر دیا جو نہ صرف بے چینی بلکہ بغاوت کا بڑا محرک ہوتا ہے۔

انگریزی حکومت نے کبھی ہندوستانیوں کے مذہب کا احترام بھی نہ کیا۔ انگریز علانیہ طور پر ہندوستانیوں کے مذاہب پر حملے کرتے تھے۔ انگلستان سے پادری بھیجے گئے۔ جگہ جگہ مشنری اسکول قائم ہوئے اور یہ تمام اخراجات ہندوستان کے خزانے سے ادا کیے جاتے۔ مسلمان عیسائی مبلغین کے ان طریقوں سے خوش نہیں تھے جو انہوں نے اختیار کیے تھے۔ وہ ان بیانات سے بھی ناخوش تھے جو پارلیمنٹ میں دیے جاتے تھے۔ اور جن میں کہا جاتا تھا کہ اگر ہندوستان کے وسیع علاقے کو یسوع مسیح کے لیے فتح نہ کیا گیا تو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کا سارا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ عیسائی مبلغ بازاروں، شفاخانوں، جیل خانوں میں جس جگہ موقع ملتا تبلیغ کرتے تھے۔ ان کے طریقہ کار سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو حکومت کی مدد حاصل تھی۔ سرکاری مدرسوں میں انجیل کی تعلیم لازمی تھی۔ بعض قوانین صرف اس لیے نافذ کیے گئے تھے کہ ان کے ذریعے عیسائیت قبول کرنے والوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔

۱۸۵۷ء کے اختتام ہی سے فوجیوں نے اپنی بے چینی کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ابتداءً بارک پور میں شورش ہوئی جسے انگریزوں نے سختی سے دبا دیا۔ دوسرے مقامات پر بھی حکم عدولی کے واقعات پیش آئے۔ لیکن انگریز افسروں نے سپاہیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش نہ کی۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ایسی ہی سازشیں ہو رہی تھیں۔ بلکہ ایک انتہائی مرحلے پر آکر یہ سازشیں اور خفیہ کارروائیاں عوامی جدوجہد کا پہلو اختیار کر گئیں۔

مختلف علماء و مجاہدین نے اپنی اپنی بساط کے مطابق انقلابی تحریکیں شروع کیں۔ اس سلسلے میں دہلی کی جامع مسجد میں ایک فتویٰ مرتب ہوا جس میں انگریزوں کے خلاف ہر مسلمان کے لیے جہاد فرض قرار دیا گیا۔ پھر جا بجا اسی مضمون کے اشتہارات تقسیم کیے گئے اور دیواروں پر چسپاں کیے گئے۔ بااثر علماء نے شہروں اور دیہات کے دورے کیے، جہاد پر زور دینا شروع کیا، تقریریں کیں، رضاکاروں نے گھر گھر جا کر چندہ جمع کیا۔ فقیر اور درویش ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ وہ زیادہ تر چھاؤنیوں کے قریب قیام کرتے جہاں سپاہی ان کے معتقد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو جاتے۔ آپس میں خفیہ پیغام رسانی کے لیے کنول کے پھولوں اور چپاتیوں سے کام لیا جانے لگا۔ اس خفیہ تحریک کا زیادہ زور دہلی میں تھا۔ پٹنہ انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ وہاں سید احمد شہید کے پیرو سرگرم کوششیں کر رہے تھے۔ حیدر آباد دکن میں خفیہ جلسے ہوئے، فتوے جاری ہوئے اور عوام نے ہنگامے شروع کیے۔ اودھ کے شہر لکھنؤ میں بھی بغاوت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مختلف تنظیموں اور جماعتوں کو باہم منسلک کرنے کے لیے پیام بر مقرر ہوئے۔ نواب اودھ کے نام سے پنجاب، مہاراشٹر، میرٹھ، انبالہ وغیرہ کی رجمنٹوں کو بارک پور سے خطوط بھیجے گئے۔ ملک بھر میں مختلف مقامات پر ڈراموں، ناٹکوں اور گیتوں کے ذریعے عوام کو غلامی کا احساس دلایا گیا۔ ان سرگرمیوں میں بہت سے اعلیٰ اور ادنیٰ عہدیدار بھی شریک تھے۔

متفقہ طور پر انقلابی کارکن اور قائدین نے متحدہ بغاوت کے لیے ۳۱ مئی کا دن مقرر کیا۔ لیکن تاریخ مقررہ سے پہلے ہی ۱۰ مئی کو یکایک میرٹھ چھاونی میں سپاہیوں نے ہنگامہ کیا، انگریزوں کو قتل کیا، ان کے مکانات کو تباہ کیا اور دہلی کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے بہادر شاہ کو بادشاہ کی حیثیت سے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ پر مجبور کیا۔ بہادر شاہ کا دربار اب بھی دہلی میں موجود تھا لیکن اس کی حقیقی شان و شوکت رخصت ہو چکی تھی۔ وہ کمپنی کے وظیفہ خوار تھے اور بڑی کوششوں کے ساتھ اپنے خطاب اور محل سے وابستہ تھے۔ ان کی بے چارگی تمام مسلمانوں کے دلوں میں، جو اب بھی سلطنتِ مغلیہ کی یاد کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے، ایک تڑپ پیدا کرتی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزوں کے خلاف خاص اہمیت کی جنگیں (۴)

جنگِ آزادی کے ممتاز قائدین

سارے برعظیم میں جنگِ آزادی اور اس کو روکنے کے لیے انگریزوں کی کوششوں کے دوران جو واقعات رونما ہوئے، وہ جنگِ آزادی پر لکھی جانے والی متعدد کتابوں میں موجود ہیں۔ اس میں سکھوں اور پارسیوں کے علاوہ ہر مذہب و ملت کے افراد نے کم و بیش حصہ لیا تھا۔ تحریک کی شدت اور ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ محض تین ہفتوں کے اندر اندر سارے ملک میں بغاوت کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ اس امر سے انکار نہیں کہ ہندوستان کے بعض علاقے تحریک سے علیحدہ رہے اور بعض نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ لیکن اس سے تحریک کی شدت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

جنگِ آزادی کے دوران بعض غیر معمولی رہنما ظہور میں آئے۔ بہادر شاہ ظفر کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن آخری مغل تاجدار اب اس حیثیت میں نہ تھا کہ خود بغاوت کی عملی طور پر رہنمائی کر سکتا اور اپنے اسلاف کے وقار کو بحال کر سکتا۔ جن سپاہیوں نے انگریزوں سے بغاوت کر کے پہلے پہل بادشاہ کو اپنی سرپرستی پر مجبور کیا تھا، ان کے جواب میں بادشاہ نے کہا تھا:

> سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے؟ میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں!

بادشاہ کی اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ انہیں ہر وقت مالی پریشانی رہتی تھی اور ساہوکاروں اور امراء سے قرض لینا پڑتا تھا۔ پھر بھی یہ امر معنی خیز ہے کہ ہندو اور مسلمان سب نے مل کر اپنی بغاوت کے دوران مغل بادشاہ ہی کو بحال کیا۔ تمام والیانِ ریاست نے، جو بغاوت پر آمادہ ہوئے تھے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان مغل بادشاہ ہی کو تسلیم کیا۔

متعدد علماء و مجاہدین نے اپنی اپنی بساط کے مطابق سرگرمیوں کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں بیشتر علماء کے نام نمایاں اور ممتاز ہیں۔ جیسے احمد اللہ شاہ جو ملک گیر جدوجہد کے محرک تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے دہلی، میرٹھ، کلکتہ اور پٹنہ کا سفر کیا۔ اور بالخصوص شمالی ہند میں تحریر و تقریر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ذریعے بغاوت کی انقلابی تحریک کو منظم کیا اور عوام کو جنگِ آزادی کے لیے تیار کیا۔ آپ نے بالخصوص ذی شعور اور حساس طبقے کو اپنی جدوجہد میں شامل کیا۔ عظیم اللہ خاں نے انقلابی مقاصد کے لیے مختلف ممالک کا سفر کیا۔ یورپ، ترکی اور روس گئے۔ عمر پاشا سے رابطہ قائم کیا۔ سپہ سالار بخت خاں، جسے بغاوت کا سالارِ اعظم بنایا گیا تھا، زبردست فوجی اور تنظیمی صلاحیتوں کا مظہر تھا۔ اس نے دہلی کے محاصرے میں دہلی کی ابتری اور بدنظمی کو دور کرنے کی بڑی کوشش کی اور انگریزی فوج کا بڑی مہارت اور جواں مردی سے مقابلہ کیا، جو باغی افواج سے نسبتاً سامانِ حرب اور تربیت نیز پیشہ ورانہ قیادت میں ہر طرح برتری رکھتی تھی۔ روہیلہ سرداروں میں خان بہادر خاں اور نواب محمود خاں نے بھی بڑی جواں مردی سے تحریک میں حصہ لیا۔ بہادر خاں نے بریلی کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لیا اور انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت کو مستحکم کیا۔ محمود خاں نے بجنور میں انگریزوں کا مقابلہ کیا اور بجنور، دھام پور، نگینہ اور آدم پور پر قبضہ کر لیا۔ دہلی کی ایجنسی کے ماتحت سات ریاستیں تھیں۔ جھجر، فرخ نگر، بلبھ گڑھ، بہادر گڑھ، دوجانہ، پٹودی اور لوہارو۔ ان ریاستوں کے حکمرانوں نے اپنے حالات اور مصلحتوں کے تحت تحریک میں حصہ لیا اور دہلی کی حکومت سے تعلقات قائم کر لیے۔ نواب عبدالرحمان والیٔ جھجر اور ان کے خسر نواب عبدالصمد خاں نے کافی سرگرمی دکھائی۔ نواب عبدالصمد خاں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا اور وہ برابر انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے۔ یہ تمام رؤساء اور امراء وہ شخصیتیں تھیں جن کے عزم، مقصد کی سچائی اور مسلسل جدوجہد سے تحریک میں سرگرمی پیدا ہوئی۔ ملازمت پیشہ طبقے میں عظیم اللہ خاں، وزیر خاں وغیرہ آخری وقت تک انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔ ان میں جوشِ جہاد بھی تھا اور انتظامی صلاحیتیں بھی۔ ان کے علاوہ گلزار علی اور شبیر علی، مرزا بشیر، دیوان حکمت اللہ، آغا مرزا، محمد شفیع، احمد خاں کھرل، فضل علی، عظیم بیگ، رسول بخش کاکوری وغیرہ مختلف خطوں میں دلیرانِ وطن کی حیثیت سے تاریخ کا جزو بن گئے ہیں۔

علماء و مشائخ میں مولانا احمد اللہ شاہ کے علاوہ حاجی امداد اللہ، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا لیاقت علی، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا عبدالقادر لدھیانوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد اسحاق، مولوی وہاج الدین، مفتی عنایت احمد، مولوی رضی اللہ، شاہ غلام بولن، مفتی کفایت علی کافی، مولانا یحییٰ علی، مولانا عنایت علی، مولانا سید عالم، مولوی علاؤ الدین، مولانا مظہر نانوتوی، مولانا منیر نانوتوی، مولانا جلیل، مولوی واعظ الحق اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا سید محمد امین غازی وغیرہ اپنے خلوص اور سرفروشانہ جذبات میں یقیناً بے مثال تھے۔ ان کی انگریز دشمنی میں ذاتی رنجشیں اور مفاد کا کوئی حصہ نہ تھا۔ ان میں حب الوطنی اور مذہب کا شدید جذبہ، غیر ملکی اقتدار سے نفرت اور عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کا شدید ردعمل تھا۔ اگر تحریک کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک عوام میں بے چینی، اضطراب اور سیاسی شعور پیدا کرنے کا تعلق تھا، اس کی ذمہ داری زیادہ تر علماء ہی پر تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزوں کے خلاف خاص اہمیت کی جنگیں (۵)

جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا خاص حصّہ

مسلمان مجاہدین بے داغ سپاہی تھے۔ ان میں سے کسی پر ظلم و زیادتی کا الزام نہیں ہے۔ انہوں نے اس لیے جنگ کی کہ وہ اسے اپنا فریضۂ مذہبی سمجھتے تھے۔ ان کی کامیابی کے امکانات بڑے محدود تھے اور اکثر والیانِ ریاست اور بہت سے صوبوں نے، جن کی اکثریت غیر مسلم حکمرانوں پر مشتمل تھی، جنگ کو خلافِ مصلحت سمجھا تھا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ صوبے عوامی جذبے کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہ جنگ مجموعی طور پر ناکام رہی۔ اس ناکامی نے برعظیم پاک و ہند پر کمپنی کی حکومت ختم کر دی۔ ہندوستان کمپنی کے قبضے سے نکل کر تاجِ برطانیہ کے تحت چلا گیا۔ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمہ برطانوی افسروں کی عدالت میں پیش کیا گیا اور انہیں بغاوت کے جرم میں سزا دی گئی۔ عدالت نے شہنشاہ کے اس اعتراض کو رد کر دیا کہ جو شخص از روئے قانون فرماں روا ہو وہ اپنے ماتحتوں کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتا۔ بہادر شاہ کو جلاوطنی کی سزا دی گئی اور انہیں رنگون میں نظر بند کر دیا گیا۔ تقریباً پانچ سال کے بعد شہنشاہ نے رنگون ہی میں بڑی کس مپرسی اور مفلسی کی حالت میں وفات پائی۔

جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے سارے ملک کو انتقامی آگ میں ڈال دیا۔ ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمانوں پر خاص عتاب نازل ہوا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ سارا ہنگامہ مسلمانوں کا پیدا کیا ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر سرگرم بھی وہی رہے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ جنگ مسلمانوں کے جذبات کے مطابق تھی کیونکہ وہ آبادی کا سب سے غیر مطمئن طبقہ تھے۔ اقتدار سے وہی محروم کیے گئے تھے۔ چنانچہ سیاسی مقاصد کے لیے جنگ آزما ہونے کے متعلق مسلمانوں کی روایات بھی زیادہ طویل تھیں۔ انگریزوں کو اس سے قبل بنگال، میسور اور تحریک مجاہدین کے تحت کئی تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پھر سید احمد شہید کی تحریک سے تعلق رکھنے والے بیشتر علماء جنگِ آزادی میں بھی ممتاز رہے۔ اور اس میں حصہ لینے والوں میں ایک مؤثر طبقہ شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید کے افکار و نظریات سے متاثر معلوم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتا تھا۔ سپہ سالار بخت خان کو، جسے دہلی میں سالار اعظم بنایا گیا تھا، بہادر شاہ کے مقدمے کے دوران وہابی العقیدہ یا سید احمد شہید کا پیرو بتایا گیا ہے۔ بخت خان نے علماء سے جس قسم کے تعلقات رکھے تھے، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سید احمد شہید کی تحریک سے متاثر تھے۔ جس وقت وہ جنگ میں حصہ لینے کے لیے دہلی پہنچے، تو سو علماء ان کے ساتھ تھے۔ جنگ کے دوران وہابی علماء کی جماعت ٹونک سے ان کے پاس آئی تھی۔ اس کے علاوہ جے پور، بھوپال، ہانسی، حصار اور آگرہ سے بھی علماء آکر ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ بخت خاں عام طور پر بادشاہ کے علاوہ ان علماء سے تخلیہ میں مشورہ لیا کرتے تھے۔ دہلی میں جو جہاد کا فتویٰ مرتب ہوا تھا، اس میں بخت خاں کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ فتوے کے اجراء کے بعد مسلمانوں میں جنگِ آزادی کے لیے مذہبی جوش اور ولولہ کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ مسلمانوں نے جنگِ آزادی کے بیشتر معرکوں میں اسلام کے سبز علم کو اپنا جھنڈا بنایا۔ تحریک مجاہدین سے وابستہ علماء جنگِ آزادی کے شروع ہونے سے بہت پہلے شمالی ہندوستان کے تمام اہم مراکز میں اپنی تنظیم کا جال بچھا چکے تھے اور علاقائی خلیفہ اور معتبر کارکن مقرر کر چکے تھے۔ سید احمد شہید کی شہادت کے بعد انہوں نے دکن کے مسلم مراکز جیسے حیدر آباد اور میسور، اور وسطی ہندوستان اور راجپوتانہ کی بعض ریاستوں مثلاً بھوپال، ٹونک اور جے پور وغیرہ کے ساتھ بھی رابطہ قائم کر لیا تھا۔ چھاؤنیوں اور ہندوستانی سپاہیوں کی فوجی کمیٹیوں میں ان کا اثر و رسوخ کافی عرصہ پہلے سے ظاہر ہونے لگا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک تو مجاہدین علماء نے ایک ملک گیر سیاسی تنظیم قائم کر لی تھی۔ خاص طور پر علاقہ دوآب میں یعنی دہلی سے الہ آباد تک ہر قابلِ ذکر قصبے میں مجاہدین اور دوسرے احیائے اسلام کے حامیوں کا منظم اور سرگرم گروہ موجود تھا جو انگریزوں سے نفرت کرنے میں متحد اور عام بغاوت میں شریک ہونے کے لیے بیتاب تھا۔ درحقیقت اسی نے وہ سیاسی اور تنظیمی بنیاد فراہم کی جس نے بخت خاں اور دوسرے مجاہدین علماء کو دہلی کی عبوری حکومت سنبھالنے میں مدد دی۔

بعض ایسی شہادتیں بھی ملی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ مجاہدین علماء کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کے حکمرانوں کی طرف سے دو جماعتیں علی الاعلان کام کر رہی تھیں۔ دہلی کے شاہی خاندان کے افراد میں سے شہزادہ فیروز شاہ کو جنگ میں عملی حصہ لینے کا امتیاز حاصل ہے۔ اسے ان سپاہیوں کی مدد حاصل تھی جو پٹھان کنٹنجنٹ سے تعلق رکھتے تھے اور سید احمد شہید کی تحریک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے متاثر تھے جہاں تک بیگم اودھ کا تعلق ہے، ان کو مولوی احمد اللہ شاہ سے ہدایت ملتی تھی، جو حقیقتاً احیائے اسلام کے زبردست حامی تھے۔

یہ ان مسلمان مجاہدین کے جوشِ عمل کا فیض تھا کہ شروع میں جنگی تدابیر کی سنگین غلطیوں اور شاہی خاندان کی سیاسی ناپختہ کاری کے باوجود فوج کا حوصلہ آخری دم تک بلند رہا۔ مسلمان سپاہیوں نے دشوار حالات میں بھی نہ صرف جنگ کو جاری رکھا بلکہ دشمن پر وار کرنے میں پہل بھی کی۔ ان کے جوش کا اندازہ کچھ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بخت خاں کے لشکر میں ہر سپاہی نے انگریزوں کے ساتھ آخری دم تک لڑنے کا حلف اٹھایا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر جنگِ آزادی کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کرنے کے بعد انتقامی کارروائیوں کے غالب حصے کا ان کے خلاف ہونا لازمی تھا۔ انہیں بڑی تعداد میں پھانسیاں دی گئیں اور بڑے پیمانے پر ان کی جائدادیں ضبط کی گئیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزوں کے خلاف خاص اہمیت کی جنگیں (۶)

جنگِ آزادی کے اثرات مسلمانوں پر

۱۸۵۷ء تک برعظیم میں صورتِ حال یہ تھی کہ نہ صرف غیر مسلم قومیں بلکہ غیر ملکی مغربی قومیں بھی مسلمانوں کے خلاف مقابلے پر آگئی تھیں۔ لیکن بہت جلد برطانیہ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں پر اپنا تسلط جما لیا۔ سکھ مسلمانوں سے بیزار تھے اس لیے انگریزوں سے تعاون کرنے لگے۔ اور ہندوؤں نے ہوا کا رخ بدلنے پر انگریزوں کو اپنی وفاداری سے متاثر کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ ان میں سے بیشتر نے مسلمانوں سے غداری کر کے ان کے خلاف مخبری کی۔ چونکہ اس قسم کے عمل سے انعامات ملتے تھے، جو مسلمانوں کی ضبط شدہ جائداد سے ادا کیے جاتے، اس لیے اکثر بے اصول ہندوؤں نے اپنے مسلمان ہمسایوں کے خلاف جھوٹے الزامات لگائے۔ مسلمانوں میں ہندوؤں کے اس عمل کا نتیجہ فطری طور پر ہندو قوم کے خلاف نفرت و غصے میں ظاہر ہوا۔ مسلمانوں کے لیے یہ صورتِ حال نازک اور خطرناک تھی کہ انگریزوں اور ہندوؤں نے اپنی اپنی کامیابی کی بنیاد ایک دوسرے سے تعاون و اشتراک پر رکھی۔ وہ دونوں دشمن طاقتوں کی نقصان دہ سرگرمیوں اور اپنے سیاسی زوال اور معاشی ابتری کی وجہ سے ہر طرف سے خطرات اور مشکلات میں گھرے ہوئے تھے لیکن ان میں نامساعد حالات کے باوجود اپنی انفرادیت کا احساس اور آزادی کا جذبہ موجود تھا۔

۱۸۵۷ء کے نتائج کے اعتبار سے مسلمانوں میں طرزِ فکر کے لحاظ سے دو گروہ بن گئے تھے۔ انگریزی تہذیب کے اثر نے اور ہندوؤں کی روز افزوں ترقی نے مسلمانوں کے ایک گروہ کو بہت متاثر کیا۔ اس تاثر نے اس میں یہ احساس پیدا کیا کہ ان کی موجودہ ذلت پستی اور ناکامی کی وجہ انگریزوں سے دشمنی اور اختلاف ہے۔ انہیں اپنے اس رویے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں جس کے عوض انہیں حکومت میں عہدے اور منصب مل سکیں گے۔ اس احساس نے مسلمانوں کے اس گروہ کو جنگِ آزادی کے محاذ سے کھینچ کر ایک دوسرے محاذ پر لا کھڑا کیا اور اپنی دور اندیشی اور مصلحت بینی سے مسلمانوں کے لیے اپنے نقطۂ نظر سے عافیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا ایک راستہ تلاش کیا۔ جبکہ دوسرا گروہ اس کے برعکس اپنے قدیم طرزِ فکر اور رویے پر قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں میں دو علیحدہ علیحدہ گروہ بن گئے۔ ایک نے اپنے اصول اور نظریے کی بنا پر انگریزوں سے عدم تعاون کا رویہ اختیار کیے رکھا۔ ان کی اعلانیہ ہر ممکن کوشش یہ رہی کہ مسلمانوں میں احیائے اسلام کا جذبہ برقرار رہے۔ وہ انگریزوں کے سامنے وقتی طور پر ہی سہی، سپر ڈالنے کے بجائے اپنے قومی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے مسلمانوں میں ہر قسم کے ایثار کا جذبہ پیدا کرتے رہے اور ان میں اپنی تہذیب اور اپنے نظریۂ حیات سے وابستگی پیدا کرنے کے لیے انہوں نے وسیع اور ملک گیر تحریک شروع کی۔ اس تحریک نے پہلے "دیوبند" اور بعد میں "ندوہ" جیسی جماعتی شکلیں اختیار کیں۔ اور ان کے زیرِ اثر ملک کے گوشے گوشے میں مختلف مکاتب، مدارس، انجمنیں اور ادارے قائم ہوئے۔ یہ ایک ایسا جرأت مندانہ اور حوصلہ افزا اقدام تھا کہ اس سے قوم میں اپنی آزادی اور سربلندی کا احساس و جذبہ کم نہیں ہوا۔

دوسرے گروہ نے انگریزی علوم کی تدریس اور جدید نظریات کی تحصیل کو قوم کے لیے مفید قرار دیا تھا۔ اس کا طرزِ فکر انگریزوں سے تعاون و اشتراک کے ذریعے بظاہر یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ انگریزوں کا دشمن و مخالف نہیں بلکہ حکومت کا وفادار اور اس کا معاون ہے۔ اسے اس کے صلے میں محض حکومت کے نظم و نسق میں حصہ لینا تھا۔ اس قسم کا طرزِ عمل اس وقت کے حالات کے تقاضے میں کچھ غیر فطری نہ تھا۔ کیونکہ ڈیڑھ سو سال تک مسلمانوں نے جو جنگ آزادی جاری رکھی تھی، اس میں مسلسل ناکامی اور نقصانات، سیاسی ابتری اور معاشی بدحالی کی وجہ سے یہ طریقِ عمل ایک حد تک یقینی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے مسلمان، جو انگریزوں کے خلاف کبھی متحد اور منظم تھے، طرزِ فکر اور طریقِ کار کے اختلاف کی وجہ سے تقسیم ہو گئے۔ اور دونوں نے آزادی کے لیے الگ الگ راہیں منتخب کیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے طریقِ کار ضرور مختلف تھے لیکن منزل ایک ہی تھی۔ ایک اپنی تھکن اور کمزوری کے باوجود بغیر رکے ہوئے آگے بڑھنا چاہتا تھا اور دوسرا کچھ دیر دم لے کر اور اپنی کھوئی ہوئی توانائیاں بحال کر کے منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی تحریکیں

۱۸۵۷ء تک

انگریزی دور کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے فی الحقیقت ہندو اور مسلمان تہذیبی بساط پر پہلے سے زیادہ فاصلے پر نظر آتے ہیں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد ہندو برعظیم میں ایک نئے طبقے اور بڑی طاقت کی صورت میں سامنے آئے، جس نے انگریزوں کے زیرِ سایہ نئی زبان، نئے فلسفے اور نئے تعصب کو وضع کیا۔ انگریزوں سے اس نے اپنے مخالفین سے لڑنے اور رائے عامہ منظم کرنے کے طریقے سیکھے۔ اور اس طرح اس طبقے نے انگریزی اقتدار کو للکارنے کی مہم کا آغاز بھی کیا تاکہ وہ ان سے سودے بازی کر سکے اور اس طرح اس کے طبقاتی مفادات پورے ہوتے رہیں۔ اس لحاظ سے یہ طبقہ ایک مذہبی اور سیاسی قوم پرست تحریک کا مظہر بھی بن گیا۔ اس طرزِ فکر پر برطانوی تہذیب اور اندازِ زندگی کی چھاپ تھی۔ اس کے مقابلے میں برعظیم میں مسلمان اپنی روایات اور اپنی تہذیب کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ اس لئے ان کی فطرت کے تقاضے ہر نئی چیز سے خائف اور گریزپا رہے۔ ہندو اپنی ہر تحریک سماج کی اصلاح اور قدیم رسومات کے ترک کرنے کیلئے جاری کرتے۔ جبکہ مسلمان اپنے مذہب اور تہذیب کی نشاۃ الثانیہ کے خواہاں تھے۔ ایک اپنے مستقبل کے لیے اور دوسرا اپنے ماضی کے لیے مصروفِ عمل تھا۔

انگریزی تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں میں شدید دلچسپی پائی جاتی تھی۔ اس وقت انگریزی جاننے کا مطلب تجارت میں فروغ، سودی کاروبار میں توسیع اور ملازمت کے حصول میں آسانی تھا۔ ان تینوں پیشوں سے ہندو اکثریت وابستہ تھی۔ ہندوؤں کی اس دور کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا محور تعلیم تھا۔ متعدد تعلیمی ادارے قائم ہوئے جن میں قدیم مذہبی علوم کے ساتھ جدید انگریزی علوم کی تدریس کا اہتمام ہوتا۔ اس وقت مسلمان انگریزوں سے مذہبی اور سیاسی اعتبار سے کبھی مفاہمت پر آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان کا انگریزی زبان اور تہذیب سے دور رہنا فطری امر تھا۔ ان کے برعکس ہندو انگریزوں سے انگریزی تعلیم حاصل کر کے بڑی حد تک انگریزی خیالات اور تہذیب کے حامل ہو گئے۔ انہوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکمران طبقے سے بے پناہ اثرات قبول کیے۔ اور اس طرح وہ انگریزوں سے زیادہ قریب ہو گئے۔ اس قربت اور اشتراک عمل نے مسلمانوں کے تمام طبقات کو متاثر کیا۔ ان دونوں نے تجارت میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا۔ اور تجارت سے مسلمانوں کو یا تو بالکل دستبردار کر دیا یا اپنی اجارہ داری قائم کر کے انہیں بے بس کر دیا۔ ابتدا میں تجارت، زراعت اور مالگزاری جمع کرنے کے اختیارات مسلمانوں کے پاس بھی تھے۔ لیکن جب اقتدار انگریزوں کے ہاتھ آیا تو انہوں نے ایسے قوانین نافذ کیے کہ جنہوں نے مسلمانوں کو ان کاموں سے بالکل بے دخل کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑا حملہ تھا جس سے مسلمان بری طرح متاثر اور مجبور ہوئے۔ تاجروں اور کسانوں کے بعد مسلم پارچہ بافوں کو بھی تباہی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اپنے پیشے کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اب صورت یہ تھی کہ مسلمان تباہ ہوا اور ہندو کو ترقی ملی۔ مسلمانوں کی تجارت اور زراعت ہندوؤں کے قبضے میں جانے سے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے لیے نفرت کا جذبہ پیدا ہونا لازمی تھا۔ ہندوؤں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ ان میں ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جو ایک طرف تو اسلام اور مسلمانوں سے متاثر ہوئیں اور دوسری طرف ان کی بنیاد اسلام دشمنی پر استوار ہوئی۔ ابتدائی تحریکوں میں سنیاسی تحریک اس کی بہتر مثال ہے جو مسلم آبادیوں میں لوٹ مار مچاتی تھی۔ ایسی تحریکوں کا مقصد ہندو معاشرے اور ہندو مذہب کو اسلام کے اثرات سے محفوظ کرنا قرار دیا گیا۔ اس سلسلے میں ہندوؤں کی وہ کوششیں بھی ہندو قومیت کے احساس کی نشوونما کیلئے اہمیت رکھتی ہیں جو مذہبی احیاء کے نام پر ہوئیں۔ مختلف قومی اور مذہبی اصلاح کی انجمنیں قائم ہوئیں۔ ہندو ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور مصلحین نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے نہ صرف ہندوؤں میں قومیت کے احساس کو مزید تقویت دی بلکہ مسلمانوں کے خلاف مخاصمت کے جارحانہ جذبات کو ابھارا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمان مصلحین کی تحریکیں ۱۸۵۷ء کے بعد

۱۸۵۷ء کے وقت تک پہنچتے پہنچتے برعظیم کی سیاسی اور معاشی زندگی میں مسلمانوں کا حصہ اب معمولی سا رہ گیا تھا۔ ہندو، انگریزوں کے ساتھ مل کر اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ جنگِ آزادی میں ناکامی سے مسلمان جس بری طرح سے متاثر ہوئے تھے، اس کی مثال بڑی عبرت ناک ہے۔ جب دہلی کو انگریزوں نے دوبارہ فتح کر لیا تو ہندوؤں کو چند ہی مہینوں کے اندر دہلی واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن مسلمان ایک عرصے تک دہلی میں داخل نہ ہو سکتے تھے۔ دوسرے مقامات اور صوبوں میں بھی یہی حال تھا۔ جنگِ آزادی سے کچھ عرصہ قبل تک دہلی مرکزِ علم و ادب تھا۔ اور وہاں احیائے علوم کی ایک تحریک عروج پر تھی۔ لیکن مسلمانوں کی تباہی سے اس تحریک کو ایسی گزند پہنچی کہ یہ پھر نہ ابھر سکی۔ جنگِ آزادی کا مقصد مسلمانوں کے قلب و جگر کے ساتھ اس حد تک وابستہ تھا کہ اس میں ناکامی کے باوجود بھی انہوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد اگر کھلم کھلا نہیں تو روزمرہ کی نفرت کے اظہار سے جاری رکھی۔ اس نفرت کا نتیجہ تھا کہ جس نے برطانوی تمدن، تہذیب، فلسفہ، تعلیم اور زبان بلکہ ہر انگریزی چیز کی مخالفت کی شکل اختیار کی۔ اس صورتِ حال میں کہ جب برعظیم مغربی علوم و فنون کی تحریک سے دوچار تھا اور مسلمان سارے ہندوستان میں مادی افلاس اور علمی زوال کا شکار تھے، اب مسئلہ یہ تھا کہ حالات کو مزید خرابی سے کس طرح بچایا جائے؟

حکومت کے طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمانوں کے اونچے اور متوسط طبقوں میں شدید بے چینی اور اضطراب تھا۔ وہ اس فکر میں کوشاں تھے کہ کس طرح اپنے تاریک مستقبل کو روشن کریں لیکن ان کے پاس وسائل محدود تھے۔ اس ابتری اور درماندگی کی حالت میں سید احمد خاں کی ہستی تھی جس نے اس وقت مسلمانوں کی حالت کا بغور جائزہ لیا اور حالات کی بہتری کے لیے وقت کے ضروری تقاضوں کی مناسبت سے ایک نتیجہ خیز لیکن دشوار گزار حکمتِ عملی اختیار کی۔ لیکن ان سے پہلے بنگال میں اصلاحِ احوال اور مسلمانوں کی رہنمائی کی ایک کوشش نواب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عبداللطیف نے کی۔ انہوں نے کلکتہ میں ۱۸۶۳ء میں ایک "محمڈن لٹریری سوسائٹی" قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اونچے اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کے مطالعہ پر آمادہ کیا جائے تاکہ وہ خود اعتمادی کے ساتھ اس نئے ماحول میں زندہ رہ سکیں اور ان میں روشن خیالی اور وسیع النظری پیدا ہو جائے۔ اس کے لیے ان کے خیال میں یہ ضروری تھا کہ وقتی طور پر حکومت کو مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلایا جائے۔ لیکن نواب عبداللطیف کی یہ تحریک ایک تو اپنے مقاصد کے اعتبار سے بھی محدود ثابت ہوئی، دوسرے یہ اپنے دائرۂ عمل اور اپنے اثرات کے لحاظ سے بھی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اس قسم کی ایک اور کوشش سید امیر علی نے بھی کی۔ انہوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے خیال سے کلکتہ ہی میں ایک "سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" قائم کی۔ اس کی تشکیل میں یہ مقصد موجود تھا کہ مسلمان اپنے ماضی کی شاندار روایات سے استفادہ کرتے ہوئے زمانے کے ترقی پذیر رجحانات اور مغربی تہذیب و ثقافت کے پسندیدہ اور صحت مند عناصر سے ہم آہنگی پیدا کریں۔ امیر علی نے اس زمانے میں بہت واضح طور پر مسلمانوں کے ایک علیحدہ قوم ہونے کا اظہار کیا اور جب "انڈین نیشنل کانگریس" قائم ہوئی تو انہوں نے اسی بنیاد پر اس کے قیام کی مخالفت کی۔ وہ جب تک ہندوستان میں رہے، اپنی قائم کردہ ایسوسی ایشن کی قیادت کرتے رہے اور یہ انجمن مسلمانوں کے سیاسی و معاشی حقوق و مفادات کے حصول اور ان کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل رہی۔

نواب عبداللطیف اور سید امیر علی کی یہ کوششیں اپنی جگہ مسلمانوں کے لیے بہت پرخلوص اور نیک نیتی پر مبنی تھیں۔ لیکن ان کی قائم کردہ انجمنیں اور ان کی اصلاحی و تعمیری سرگرمیاں ایک حد تک محدود رہیں اور مسلمانوں کے بڑے اور وسیع حلقے کو متاثر نہ کر سکیں۔ ان کے برعکس مذہبی، تہذیبی، سیاسی اور تعلیمی اصلاح و ترقی کی ایک بہت مؤثر اور ہمہ گیر تحریک جس نے مسلمانوں کے تقریباً سب ہی طبقات کو متاثر کیا اور ان میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا، سید احمد خاں کی تحریک تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرسید کی تحریک ـــــــ مجموعی مقاصد

سید احمد خاں مسلمانوں کی کمزوریوں اور صلاحیتوں دونوں سے واقف تھے۔ ان کی حکمتِ عملی اور کل کاوشیں اس غالب خیال کے ماتحت رہیں کہ انگریزوں کی حکومت بہت زیادہ مضبوط ہے اور اسے مسلمانوں کی جدوجہد سے ہٹایا نہیں جاسکتا۔ اپنے پسِ منظر میں دیکھا جائے تو سید احمد خاں کا یہ خیال اور ان کی تمام قومی خدمات اور خود ان کی علیگڑھ تحریک ان کے شدید احساس کا نتیجہ تھیں ان سب کی بنیاد قومی ہمدردی کا وہ شدید جذبہ تھا جو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہولناک نتائج کی وجہ سے ان کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اس جذبے کے خلوص اور اپنی سیاسی دوراندیشی کی بدولت انہوں نے قومی بقاء و ارتقاء کی ایک محفوظ راہ ڈھونڈ نکالی۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی سلامتی اور سربلندی کے لیے انگریزی حکومت سے سازگاری اور وقتی مفاہمت و مصالحت اس تحریک کا پہلا بنیادی مقصد تھا۔

سید احمد خاں کی تحریک کو علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں تھی کہ جو کچھ بھی ہو، علیگڑھ ہی کے علاقے میں ہو، بلکہ علیگڑھ تحریک میں ہر ایک ایسا کام شامل تھا جو مکمل طور پر اور صحیح معنوں میں مسلمانوں کے فائدے میں ہو، خواہ کسی علاقے کے مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہو۔ ابتداءً انگریزوں کے اس احساس کے نتیجے میں کہ مسلمان وفادار نہیں اور اس احساس کی بنا پر مسلمانوں کو جو تکالیف برداشت کرنی پڑ رہی تھیں، سید احمد خاں ان کی طرف سے لاپرواہ نہیں رہ سکتے تھے۔ حالات اور وقت کے تقاضے ایک مؤرخ اور صحافی کو اس بات پر مجبور کر رہے تھے کہ وہ وقت کی مناسبت سے زیادہ مفید اور ضروری کتابیں تصنیف کرے۔ "رسالہ اسباب بغاوتِ ہند"، "کتاب سرکشیٔ ضلع بجنور" اور "رسالہ خیر خواہانِ مسلمانان" کی تصنیف اور اشاعت اور ان کے ذریعے اس امر کا اظہار کہ تمام مسلمان باغی نہیں تھے اور اس لیے بلا امتیاز پوری قوم سے انتقام لینے کا کوئی جواز نہیں ہے، سید احمد خاں کی اس تکلیف کا ثبوت ہے جو مسلمانوں پر انگریزی مظالم کے نتیجے میں پہنچ رہی تھی۔ رسالہ تحقیق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لفظ نصاریٰ" کی تصنیف کا مقصد بھی انگریزوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کا ایک مظہر تھا۔ انجیل کی تفسیر "تبیین الکلام" کی تحقیقی کاوش کا مقصد بھی یہی تھا کہ تعصب یا جہالت کی وجہ سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں جو باہمی نفرت پیدا ہو گئی تھی، اسے دور کیا جائے۔ لیکن یہ سب کچھ وقتی مصلحتوں کے تحت تھا۔ ورنہ سید احمد خاں جو کچھ کرنا چاہتے تھے، اس کا واحد اور بنیادی مقصد یہی تھا کہ مسلمان کسی طرح کچھ وقت کے لیے دم لیں۔ تاکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی توانائیاں حاصل کریں، اپنے میں سیاسی اور قومی شعور بیدار کریں اور پھر اپنی گزشتہ عظمت کو دعوت دیں۔ دراصل سید احمد خاں اس نتیجے پر بھی پہنچے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے منصوبوں سے متفق کرنے اور انہیں اپنے ساتھ تعاون کی ترغیب دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کے ذہن میں انقلاب برپا کریں۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے اپنا رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا تھا۔ اور اس کے ذریعے انہوں نے کوشش کی تھی کہ ایک وسیع محاذ پر ایک اصلاحی لائحہ عمل کو بروئے کار لائیں۔ ان کے جوش و خروش سے کوئی پہلو نہیں بچا، مذہب، معاشرہ، ادب، سیاست اور تعلیم، ہر شعبے میں ان کی اصلاحی اور تعمیری کاوشیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ زندگی کے متعلق جس نقطۂ نظر کو وہ صحیح سمجھتے تھے، اس کو انہوں نے قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ عام معنوں میں وہ کوئی مذہبی مفکر بھی نہ تھے اور نہ انہوں نے کسی نئے فکری نظام کی تشکیل کی۔ ان کی تحریروں کی تہ میں ایک عمیق مقصد پوشیدہ تھا۔ جس کی تکمیل مذہبی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ انہوں نے ابتداء ہی میں محسوس کر لیا تھا کہ معاشرتی اصلاح کی مہم میں مذہبی تعصبات اور اوہام کے سنگِ گراں قدم قدم پر حائل ہیں۔ وہ تجدید اور اجتہاد کا دروازہ ضرور کھولنا چاہتے تھے تاکہ وقت کے تقاضوں کے ساتھ زندگی کے ارتقاء کی راہیں کشادہ ہوں۔ لیکن ان سب کے باوجود بھی ان کی تحریک مذہبی تحریک نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ علیگڑھ کالج کے فارغ التحصیل طلبہ پر مذہبی رنگ خاص طور پر نمایاں نہیں رہا۔ فی الحقیقت یہ ایک تعلیمی، سیاسی اور معاشرتی تحریک تھی اور اس کا مقصد قوم کی پستی کو دور کرنا تھا۔ اس کا مفید نتیجہ ایک یہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے خوابیدہ ذہن میں مسلم قومیت کا شعور، اپنی ترقی کا خیال اور مستقبل کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیّد احمد خاں کی تعلیمی تحریک

سید احمد خاں نے مسلمانوں کی صورتِ حال کا جائزہ لے کر ان کی بہتری اور ترقی کے لیے جو حکمتِ عملی وضع کی تھی، اس میں انہوں نے تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ ان کی یہ حکمتِ عملی اپنے نتائج کے اعتبار سے مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف مغربی تعلیم کے ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی تحریک تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کو سنبھلنے اور ترقی کرنے کے لیے پہلے مغرب کے علمی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ ان کے اس خیال پر کہ مسلمان انگریزی عہد کے جدید ہندوستان میں انگریزی زبان میں اور جدید مغربی علوم سے واقفیت کے بعد ہی اپنے قومی وجود کو قائم رکھ سکتے ہیں، سید احمد خاں کی شدید مخالفت ہوئی۔ لیکن اس امر کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان کی حیثیت محکوم آبادی کے ایک فرد کی تھی، اور ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنی قوم کو دوسری قوموں کی سطح تک پہنچا دیں۔ کسی وقت خود سید احمد خاں نے برعظیم میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے لارڈ میکالے کی پیش کردہ تجویزوں کی مخالفت کی تھی۔ لیکن بعد کی صورتِ حال کے پیشِ نظر انہوں نے اپنی رائے کو یکسر بدل دیا۔ اب انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے بارے میں اس امر پر زور دینا شروع کیا کہ مغربی علوم کو اردو میں منتقل کر کے انہیں برعظیم کے باشندوں میں مقبولِ عام بنایا جائے۔ ان کی قائم کردہ "سائنٹیفک سوسائٹی" کا یہی مقصد تھا۔ یہ سوسائٹی اپنے مقاصد کے لیے علیگڑھ تحریک کے ابتدائی دور ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۰ء تک کوشاں رہی۔ متعدد کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئیں، اس کے تحت ایک اخبار بھی نکالا گیا۔ جو اپنے بلند پایہ علمی و تہذیبی مضامین کے ذریعے معاشرتی اصلاح اور ذہنی تربیت کا بہت بڑا وسیلہ بنا رہا۔ سوسائٹی اور اس کے اخبار کے اثر سے برعظیم کے مختلف حصوں میں جابجا فکر و عمل کے سوتے ابل پڑے۔ متعدد علمی و تعلیمی انجمنیں قائم ہوئیں اور اخباروں میں علمی و اصلاحی مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن سید احمد خاں تعلیمی میدان میں جو کچھ کرنا چاہتے تھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ سوسائٹی محض اس کا ایک پہلو تھا۔ انہوں نے ابتداءً مراد آباد میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ پھر غازی پور میں ایک اسکول قائم کیا جو علیگڑھ منتقل ہو کر کالج کے معیار تک پہنچ گیا۔ انکا خواب دراصل یہ تھا کہ ایک ایسی جامعہ قائم کی جائے جو برعظیم کے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو۔ جو مغربی علوم اور اسلامی اقدار کا گراں بہا امتزاج پیدا کرے۔ اور اس میں رہ کر طلبہ کردار کی ان خصوصیات کو ترقی دیں جنہوں نے ماضی میں سلطنتیں تعمیر کریں۔ ۱۸۶۹ء میں سید احمد خاں اپنے دو بیٹوں کو تعلیم دلانے اور خود ایک کتاب کی تصنیف کے لیے مواد فراہم کرنے انگلستان گئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہاں سے نئی تہذیب و تعلیم کی ترویج کا ایک نیا جوش اور ولولہ اور اصلاح و ترقی کا ایک نیا منصوبہ لے کر واپس ہندوستان آئے۔ آتے ہی سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہن کی اصلاح اور ان کے کردار کی تربیت کیلیے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اور مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس نے ایک اسلامی درسگاہ کا خاکہ مرتب کیا۔ تمام ضروری تیاریوں کے بعد علیگڑھ میں ۱۸۷۵ء میں ایک نئے مدرسے کا افتتاح ہوا، جسے عالم اسلام میں پہلی جدید درسگاہ بیان کیا جاتا ہے۔ بہت جلد یہ کالج کے درجے پر پہنچ گیا۔ لیکن بہت بعد میں یہ یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر سکا۔

یہ کالج سید احمد خاں کے خواب کی ایک جزوی تعبیر تھا۔ انہوں نے قومی تعلیم کی تحریک کو مزید پھیلانے اور مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے ۱۸۸۶ء میں ایک تعلیمی، اصلاحی و تعمیری انجمن "محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" قائم کی جس نے بعد میں "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم کے ایک مؤثر مرکزی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی۔ مسلم لیگ کے قیام سے پہلے سیاسی و نیم سیاسی امور میں کانفرنس ہی قوم کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ سید احمد خاں کے قائم کردہ ان اداروں نے مسلم ملت کی تشکیل میں ایسے وقت پر ایک اہم کردار ادا کیا جب وہ اپنے زوال کی انتہا پر تھی۔ انہوں نے قوم کو ایک نئی امید دی اور ایک نئے مقصد کا فہم دیا اور ایک ایسی نسل تیار کی جو اسلام کے ساتھ اپنی بنیادی وفاداری کو خراب کیے بغیر دنیا کے جدید حالات اور نظریات سے تعلق رکھتی تھی۔ جدید تعلیم کے طفیل مسلمانوں نے سیاست میں جدید رجحانات کو قبول کیا اور برعظیم کی سیاسی زندگی میں اپنی حیثیت و اہمیت کے اظہار میں بڑھ چڑھ کر سرگرمیاں دکھائیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرسید کی ادبی تحریک اور اس کے سیاسی مقاصد

سید احمد خان کی تحریک کے بنیادی مقاصد کی تکمیل ذہنی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے سید احمد خان نے تعلیمی ترقی اور مذہبی عقائد کی اصلاح کو ضروری سمجھا۔ ادب چونکہ ذہن اور جذبے سے براہِ راست متعلق ہوتا ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی اصلاحی تحریک کا لائحہ عمل تیار کیا تو اس میں ادب اور اس کی اصلاح کو بھی خاطر خواہ اہمیت دی۔ ادب میں معاشرے کو متاثر کرنے کی بھی بے انتہا صلاحیت ہوتی ہے۔ سید احمد خان اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ذہن اور کردار کی اصلاح کے لیے ادب کو بھی آلۂ کار بنایا۔ اور اس سلسلے میں اپنے رفقاء کو قومی اصلاح و ترقی کے لیے صحت مند، مفید اور تعمیری ادب کی تخلیق کے کام پر لگا دیا۔ اس طرح علیگڑھ تحریک نے اپنی زبان اور ادب کو سربلند کرنے، اس کے مہمل اور فرسودہ عناصر کو پاک کرنے اور اس میں مفید اور مقصدی رجحانات شامل کرنے میں بھی فعال کردار ادا کیا۔ سید احمد خاں کے وہ رفقاء جو ادیب و شاعر تھے، ان کے فیضِ صحبت سے مستفید تھے اور انہیں "تہذیب الاخلاق" اور کالج نے ایک دوسرے کا شریک بنایا تھا۔ سید احمد خان جس تحریکِ اصلاح کے لیے کوشاں تھے، اس میں ان کے رفقاء کی تائید و حمایت بھی شامل تھی۔

علیگڑھ تحریک نے خود جو ادب پیدا کیا وہ کئی لحاظ سے اس ادب سے مختلف ہے جو اس سے پہلے موجود تھا۔ اس دور سے قبل کی شاعری اس منظم اجتماعی و معاشرتی احساس کی حامل نہیں تھی جو مثلاً حالی اور شبلی کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ سید احمد خاں سے وابستہ افراد کی شاعری اور ادب میں اجتماعی طور پر محسوس کیے ہوئے جذبات اور سوچے سمجھے افکار پائے جاتے ہیں۔ اور قومی مسائل کا بیان اور ان کا منطقی حل پایا جاتا ہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک کے سلسلے میں ادب کی معاشرتی اور تہذیبی اہمیت کا اندازہ لگا کر اردو میں مقصدی شعر و ادب کی تخلیق کی روایت کا آغاز کیا۔ مقصدیت اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصلاح پسندی کا یہ رجحان اور ادیبوں اور شاعروں میں معاشرتی ذمہ داری کا احساس علیگڑھ تحریک کے بعد اردو ادب کی ہر صنف میں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو ادب کے گزشتہ ادوار کے مقابلے میں ملکی آزادی اور قومی اصلاح کے جذبات و احساسات زیادہ واضح اور کھل کر ادا کیے گئے۔ اجتماعی شعور کا یہ اظہار ادب میں اس سے پہلے موجود نہ تھا۔ اس کا آغاز علیگڑھ تحریک کے زیرِ اثر ہوا ہے۔ سید احمد خاں کی ہمنوائی میں اکثر ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اصلاحی تحریک کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ یہ قومی بھلائی اور خیر خواہی کا جذبہ ہی تھا کہ مقصدی شعر و ادب کے ماتحت منظومات، مقالات، تاریخ، سوانح اور ناولیں تخلیق کی گئیں۔ شاعری میں سید احمد خاں کے رفیقِ خاص حالی زیادہ نمایاں رہے۔ ان کا تحریر کردہ "مقدمۂ شعر و شاعری" اردو شاعری کی اصلاح میں ان کی انتہائی کوشش ہے۔ ان کے پیشِ نظر محض اصلاحی دور کے تقاضے ہی نہ تھے بلکہ وہ آنے والے انقلاب آفریں عہد اور ہمہ گیر زمانے کی جھلک بھی دیکھ رہے تھے۔ ان کی کوششوں سے غزل نے اپنے دامن میں سیاسی اور سماجی میلانات کو سمیٹ کر ان کی ترجمانی کا فرض ادا کرنا شروع کیا۔ اسکا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ نظم نگاری کی تحریک بھی خوب مقبول ہوئی۔

سید احمد خاں جانتے تھے کہ ادب اگر عمدہ اصولوں پر مبنی ہو تو کس قدر قوم اور وطن کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ادب کو عام زندگی کا ترجمان اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ خود ان کی تحریروں اور "تہذیب الاخلاق" کے مجموعی اثر نے شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے زمانے کی سیاست اور معاشرت سے مربوط کر کے اجتماعی زندگی کے مسائل کا ساتھ دینا شروع کیا۔ حالی کے علاوہ ان کا اثر محمد حسین آزاد، شبلی، اسماعیل میرٹھی، نذیر احمد، شوق قدوائی، عبدالحلیم شرر، حسرت موہانی، ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی وغیرہ کے تخلیق کردہ شعر و ادب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے بجا طور پر اپنی تحریروں اور عملی، سیاسی و قومی جدوجہد سے برعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کو سرگرم بنیادوں پر استوار کیا۔ ان کے مذہبی، قومی، تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی شعور کو فروغ دیا۔ ان کی تہذیب و معاشرت کی اصلاح کی اور ان کی زندگی اور ان کے ادب کو مقصدیت اور حقیقت کا حامل بنایا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرسید کی سیاسی تحریک

سید احمد خاں کی حکمتِ عملی اور ان کے سیاسی افعال، اس غالب خیال کے ماتحت رہے کہ انگریزی حکومت بہت زیادہ مضبوط ہے اور اسے مسلمانوں کی جد و جہد سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات مشترک ہیں۔ اس لیے آغاز کار میں ان کی حکمتِ عملی بعض مشترک مقاصد کے حصول کی طرف رہنمائی کرتی تھی۔ لیکن جب ہندوؤں نے کھل کر ایسی حکمتِ عملی اختیار کی جو مسلمانوں کے ساتھ تعاون کے جذبات پر مبنی نہیں تھی تو سید احمد خان کی سیاسی حکمتِ عملی نے ایک دوسرے راستے کا تعین کیا۔

ہندوؤں کی ایسی پہلی کوشش جس سے براہِ راست مسلمانوں اور ان کی تہذیب سے نفرت کا اظہار ہوتا تھا، یہ تھی کہ انگریزی زبان کے بعد اردو کے بجائے ہندی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلایا جائے۔ سید احمد خان، جو واقعات و رجحانات کا ہوش مندانہ مشاہدہ کرتے تھے، اردو کے مقابلے میں ہندی کے حق میں ابھرنے والی اس تحریک کی حقیقت کو سمجھ گئے۔ ان کے خیال میں اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کا مطالبہ ہندوؤں کی طرف سے ان رشتوں کو توڑنے کے مترادف تھا جو کئی صدیوں کے دوران قائم ہوئے تھے۔ "انڈین نیشنل کانگریس" کی تشکیل سے ان کے اس خیال کو تقویت پہنچ رہی تھی۔ پھر ان کے دور میں بعض متعصب ہندو رہنماؤں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرتے اور ان کے خلاف دوسرے ہندوؤں میں نفرت کے جذبات پھیلاتے کے لیے مختلف فرقہ وارانہ انجمنوں کی تشکیل کی اور تحریکیں چلائیں تو سید احمد خاں کے اس قسم کے خیالات راسخ ہوتے چلے گئے۔ کانگریس نے ابتدا ہی سے ایسی روش اختیار کی جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تھی۔ اس کی ساری کوششیں یہ تھیں کہ ہندو اکثریت کے لیے، جو پہلے ہی نسبتاً بہتر حالت میں تھی، زیادہ سے زیادہ اختیار اور ذمے داری کے عہدے اور منصب حاصل کیے جائیں۔ اس کے دوسرے سال کے اجلاس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ گورنر جنرل کی کونسل اور صوبائی کونسلوں میں انتخاب کے اصول رائج کیے جائیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوستان کے مخصوص سماجی اور اقتصادی حالات میں اس سے یقیناً ہندوؤں کو فائدہ پہنچتا جو اکثریت میں تھے اور انتخاب میں کامیاب ہو جاتے۔ سید احمد خاں کانگریس کے عزائم کو سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ جب کانگریس نے اپنا اجلاس منعقد کیا تو انہوں نے شرکت سے قطعاً انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے دو اہم تقریریں کیں، جن میں کانگریس کے مقاصد اس کے خطرناک مطالبات اور ان کے پسِ منظر کا تجزیہ کیا اور مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کی ہدایت کی۔ یہ اس امر کا اظہار تھا کہ سید احمد خاں اب دونوں قوموں کے تعلقات میں کسی بہتری کی امید نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے کانگریس کے اثر کا مقابلہ کرنے کے لئے "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" اور پھر بعد میں "محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن" کی تشکیل کی۔

مسلمانوں میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ہندوؤں کے نصب العین کو سمجھا تھا۔ کانگریس کے خلاف ان کے دیئے گئے بیانات کو اس وقت کے برعظیم میں مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا نصب العین قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بارہا اس خیال کا اظہار کیا کہ برعظیم کی آبادی میں یکسانیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو جداگانہ قومیں تسلیم کرتے رہے۔ جہاں انہوں نے اتحاد کی تلقین کی ہے، وہاں بھی دو جداگانہ قوموں کا ذکر کیا ہے۔ ان کا یہ جملہ کہ "ہندوستان ایسی حور شمائل دلہن کی صورت ہے جس کی ہندو اور مسلمان دو آنکھیں ہیں"، ان کے دو قومی نظریے کی ہی وکالت کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں ہندو اور مسلمان کو "دو آنکھیں" کہا گیا ہے۔ ان کی تحریریں، تقریریں اور انکے کام ظاہر کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے ایک علیحدہ قوم ہونے پر یقین رکھتے تھے۔ اور یہ یقین، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، زیادہ مضبوط اور گہرا ہوتا گیا۔ ان کے یہ تصورات کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ برعظیم ہے، ہندو اور مسلمان ایک نہیں دو قومیں ہیں اور علیحدگی ناگزیر ہے، مطالبۂ پاکستان کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔ ان کی تحریک بنیادی طور پر مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف مغربی تعلیم کے ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی ایک کوشش تھی۔ لیکن اپنے نتائج کے اعتبار سے تحریک پاکستان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی۔ اگر وہ علیگڑھ کالج قائم نہ کرتے اور برعظیم میں اس قدر سیاسی ہلچل پیدا نہ ہوتی، نہ اس طرح نوجوانوں کی ایک پرجوش نسل نکلتی اور نہ تحریکِ آزادی اس قدر شدت اختیار کرتی جس کا آخری مرحلہ قیامِ پاکستان ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی تحریکیں۔ سرسید کے عہد میں

برعظیم کی تاریخ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ یگانگت اور جذبے کا اتحاد کبھی نہیں رہا۔ اس لیے ہندوؤں کے ذہن میں مسلم حکومت کی یادوں کے بارے میں تلخی پیدا کر دینا انگریزوں کے لیے غیر ممکن نہیں تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط جمانے کے لیے ایسی کوششیں جان بوجھ کر کیں۔ چنانچہ انہوں نے ہندوؤں کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھا کر اور سماجی انجمنوں کی تشکیل میں تعاون کر کے انہیں اپنی فوقیت کا احساس دلایا۔ چند دہائیوں کے عرصے میں انگریزوں کی یہ کوشش کامیاب ہو گئی اور ۱۸۵۷ء تک ہندوؤں میں مسلمانوں کے لیے مخالفانہ جذبات پیدا کرنے کا سبب ہوئی۔ سکھ پہلے ہی مسلمانوں سے بیزار تھے اس لیے انگریزوں سے تعاون کرنے لگے اور ہندوؤں نے جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد ہوا کا رخ بدلنے پر انگریزوں کو اپنی وفاداری سے متاثر کرنا ضروری سمجھا۔ ان میں سے بیشتر نے مسلمانوں سے غداری کر کے ان کے خلاف مخبری کی۔ چونکہ اس قسم کے عمل سے انہیں انگریزوں کی جانب سے انعامات ملتے تھے، اس لیے بے اصول ہندوؤں نے اپنے مسلم ہمسایوں کے خلاف جھوٹے الزامات تک لگائے۔ یہ سب کچھ شدید ہندو پرستی کے تحت ہو رہا تھا۔ اس دوران ہندوؤں میں وہ کوششیں بھی ان کی قومیت کے احساس کی نشوونما کے لیے اہمیت رکھتی ہیں جو مذہبی احیاء کے نام پر ہوئیں۔ مختلف قومی اور مذہبی اصلاح کی انجمنیں قائم ہوئیں، سیاسی اور قومی رہنما ان میں مستعد ہوئے اور ایسی تحریکیں شروع کی گئیں جن کا مقصد ہندوؤں میں حب الوطنی، ہندو قومیت کے جذبات اور اپنی مدد آپ کا شعور پیدا کرنا تھا۔

ہندو قومیت کے فروغ کو برطانوی سرپرستی سے بڑی تقویت پہنچتی رہی۔ خود ہندو ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے بھی اس سلسلے میں اہم کام انجام دیا۔ اصلاحی اور قومی انجمنوں کے بانی مصلحین اور قائدین بھی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے یہ کام کرنے لگے۔ لیکن مدھوسودن دت، رنگالال بنرجی، بیم چندر بنرجی، بپن چندر پال اور بہاری لال چکرورتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی شاعری، دیانند سرسوتی مترا کے ڈراموں اور بنکم چندر چیٹرجی کے ناولوں نے یہ کام زیادہ مؤثر انداز سے انجام دیا۔ ان کے علاوہ کالیبر ستہ سنہا کے قدیم قومی مذہبی ادب کے ترجموں اور دوارکا ناتھ ودیا بھوشن اور راجندر لال مترا کے مضامین بھی اسی ذیل میں آتے ہیں، بنکم چندر چیٹرجی نے نہ صرف ہندوؤں میں قومیت کے احساس کو مزید تقویت دی، بلکہ افسانوں اور گیتوں کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جارحانہ جذبات کو ابھارا۔ اس سلسلے میں اس کا ناول "آنند مٹھ" نمائندہ تصنیف ہے۔ ہندوؤں کا قومی گیت، "بندے ماترم" جو اب بھارت کا قومی ترانہ ہے، اسی ناول میں شامل تھا۔

ان کوششوں کے نتیجہ میں ہندوؤں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو ایسی ہی سرگرمیوں میں بہت جلد مستعد ہوگیا اور تحریر و تقریر سے کام لینے لگا چنانچہ اس عمل سے ہندو قوم نے قوت کا ایک نیا احساس حاصل کیا۔ اب یہ قدرتی امر تھا کہ اس نئی حاصل شدہ قوت کو مسلمانوں کے خلاف بھی استعمال کیا جائے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں اس قوت نے برطانوی حکومت کے زیر سایہ جدید شکل اختیار کی۔ "آریہ سماج" کی تحریک اس کی ایک مثال ہے۔ اس جماعت سے ہندو قومیت کو بڑی تقویت پہنچی۔ اس کا مقصد ایک مشترکہ مذہب اور تہذیب کی بنیاد پر ایک ہندوستانی قوم کی تشکیل تھا۔ اس لیے اس جماعت کا خاص منصوبہ "شدھی" کی صورت میں سامنے آیا۔ آریہ سماجی برملا کہتے تھے کہ وہ اس دن کے منتظر ہیں جب مسلمانوں اور انگریزوں دونوں سے بدلہ لیں گے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندوستان میں رہیں۔ ایک جماعت کی حیثیت سے اس نے مسلمانوں کی جتنی مخالفت کی، اتنی کسی اور جماعت نے اس وقت نہیں کی۔ اس کا بانی دیانند سرسوتی مسلمانوں کا شدید مخالف تھا۔ اس جماعت کے زیر اثر انیسویں صدی کے اواخر تک برعظیم میں ہندوؤں کی دیگر کئی جماعتیں قائم ہوئیں اور تحریکیں شروع ہوئیں۔

بال گنگادھر تلک نے ہندو دیوتا گنیش یا گنپتی کی تقریب منانے کا اہتمام شروع کیا۔ اس سے ایک تو مذہبی فرقہ پرستی کا اظہار مقصود تھا۔ اور دوسرے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا تھا۔ تلک نے مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے اس تقریب کو محرم کی صورت میں ترتیب دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں ابھارنے کے لیے شیواجی کو ایک قومی ہیرو کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کیا۔ اس نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے شیواجی کے عقیدت مندوں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا۔ مسلم سلطنت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے خلاف بغاوت کرنے والا لیڈر اقومی ہیرو کے درجے تک پہنچا دیا گیا۔ مسلمانوں کے خلاف شیواجی کی سرگرمیوں کو جلسوں اور تحریروں میں سراہا جانے لگا۔ اس طرح تلک نے ہندو قوم پرستی کی ایسی ٹھوس بنیادیں سارے برعظیم میں قائم کر دیں جن پر آنے والے زمانوں میں وقتاً فوقتاً مختلف شدتوں کی جارحانہ اور مسلم دشمن تحریکات پیدا ہوتی رہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو ہندی تنازعہ — اور اس کے اثرات

ہندوؤں کی ایسی پہلی کوشش جس سے براہِ راست مسلمانوں اور ان کی تہذیب سے بیزاری کا اظہار ہوتا تھا، یہ تھی کہ شمال مغربی صوبہ میں اردو کے بجائے ہندی کو انگریزی کے بعد دوسری سرکاری زبان تسلیم کرایا جائے۔ یہ مطالبہ ہندوؤں کی اس خواہش کی علامت تھا کہ وہ خود اپنے تہذیبی ورثے کا احیاء چاہتے ہیں۔ ورنہ تعلیم یافتہ ہندو صدیوں سے اپنے مسلم ہموطنوں کی طرح اردو کو اپنی زبان کی حیثیت سے استعمال کرتے رہے۔ انتہائی قدامت پرست برہمن یا نیم خواندہ دیہاتی بھی اسی زبان کو دیوناگری رسم الخط میں لکھتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے اردو برعظیم کے ساتھ وابستگی کی علامت تھی۔ کیونکہ انہوں نے اردو کو جس قدر اپنایا تھا اسی قدر فارسی کو چھوڑا تھا۔ اب اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کا مطالبہ ہندوؤں کی طرف سے ان رشتوں کو توڑنے کے مساوی تھا جو کئی صدیوں کے دوران قائم ہوئے تھے۔

برعظیم میں آنے کے بعد مسلمان جہاں جہاں آباد ہوئے، انہوں نے وہیں کی زبان کو اپنایا اور اسے فارسی رسم الخط میں تحریر کیا۔ اردو ہند اسلامی تہذیب کی ایک عمدہ مثال ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس زبان کو غیر مسلموں نے پرورش کیا تھا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی غیر مسلموں کے شاندار کارنامے اس کا نمایاں حصہ ہیں۔ فی الحقیقت یہ زبان تمام قوموں کی متفقہ کوششوں سے پروان چڑھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی کوششیں دیگر قوموں سے زیادہ ہیں۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ کسی دوسری قوم نے اس زبان کو مکمل طور پر نہیں اپنایا تھا۔ ان کے پاس ذریعۂ اظہار کے لیے دوسری دیسی زبانیں بھی موجود تھیں۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اردو میں فارسی الفاظ کو داخل کرنے کا کام مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں نے کیا۔ اور اس سے ان کا مقصد اپنے مسلمان آقاؤں کو خوش کرنا تھا۔ یہ اس زبان کی اپنی خصوصیات اور خوبیاں ہیں کہ اس نے بہت جلد عام بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انیسویں صدی کے آخر میں اس زبان کے استعمال پر ہندوؤں کے جانب سے مخالفت شروع ہوئی۔ اپنی قومی اور اصلاحی کوششوں کی وجہ سے اس دور میں ہندو اپنی ہندی قومیت کے جذبے سے اب اس حد تک سرشار ہو چکے تھے کہ اب انہیں ایسی ہر چیز سے نفرت ہو رہی تھی جو انہیں ان کے ماضی کی یاد دلاتی جب مسلمان یہاں حکمران تھے۔ اٹھارویں صدی تک مسلمانوں کی طرح سب ہندو اردو کو برعظیم کی عام بول چال کی واحد زبان سمجھتے تھے۔ لیکن ہندوستانی معاشرے کے مختلف طبقات میں انگریزی حکمتِ عملی کی فتح بعض اوقات بالکل متضاد قسم کے رجحانات کی پرورش کا سبب ہوئی۔ جدید تعلیم کا اجرا تو ہوا لیکن انگریزی اور مقامی زبانوں کی تعلیم کے مابین کوئی تناسب قائم نہ رہنے کے باعث تعلیمی حلقوں میں ایک تو بے چینی پیدا ہو گئی اور دوسرے طویل فاصلے پیدا ہوئے۔ اور یہ امر مسلمانوں کے سلسلے میں بھی نمایاں رہا۔ اس وقت مسلمان انگریزوں سے مذہبی اور سیاسی اعتبار سے کبھی مفاہمت پر آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان کا انگریزی سے دور رہنا فطری تھا۔ انہوں نے اپنے لیے فارسی اور اردو ہی کو غنیمت جانا۔ اس طرح وہ اپنی تہذیب سے دور نہ ہو سکے۔ ان کے مقابلے میں جو ہندو مغربی تعلیم سے قریب ہوئے ان میں اپنے مذہب کے احیاء اور اس کی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ کیونکہ وہ مغربی علوم کے سہارے قومیت کے جدید تصورات سیکھ رہے تھے۔ اس طرح دونوں قوموں نے اپنے اپنے اظہارِ خیال کے لیے رجعت پسندی کو اختیار کیا۔ چنانچہ ہندوؤں نے سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار کر دی اور مسلمانوں کے ذریعۂ اظہار میں عربی و فارسی کے الفاظ شامل ہونے لگے۔ انگریزوں کے دارالحکومت کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد انیسویں صدی کی ابتدا میں اردو کو فارسی رسم الخط کے علاوہ دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھا جانے لگا۔ اور یہ کام انگریزوں کی شہ پر ہندوؤں نے بڑھ چڑھ کر کیا۔ چنانچہ دیوناگری میں لکھی جانے والی اردو ہندوؤں کے تعصب کے نتیجے میں سنسکرت سے زیادہ قریب ہوتی گئی اور ہندی کہلائی۔ یہ ایک اہم واقعہ تھا جس نے ہمیشہ کے لیے ہندوستان کی تہذیبی اور سیاسی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی۔ یہ ہندو اور مسلم قومیتوں کا اعلانیہ اظہار تھا جس نے آگے چل کر دو قومی نظریے کو بھرپور قوت عطا کی۔

ہندوؤں کے مطالبے کے زیرِ اثر انگریزوں نے صوبۂ بہار میں ہندی کو رائج کر دیا۔ حکومت کے اس اقدام سے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے مزید آگے بڑھ کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک اور مطالبہ کر دیا کہ ذریعہ تعلیم کے لیے دو زبانیں ہونی چاہئیں۔ ہندی ہندوؤں کے لیے اور اردو مسلمانوں کے لیے۔ یہ مطالبہ شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ چنانچہ صوبائی حکومت نے بعض مقاصد کے لیے، جن میں اب تک اردو استعمال کی جاتی تھی، اردو اور ہندی دونوں کو یکساں طور پر سرکاری زبان بنا دیا۔ ہندوؤں کی طرف سے اس قسم کے مطالبات کا ردعمل ہونا مسلمانوں میں غیر یقینی نہیں تھا۔ ہندوؤں کی کامیابی اور حکومت کی جانبداری سے مسلمان بہت مشتعل ہوتے۔ اس طرح دونوں قوموں کے درمیان مزید فاصلے پیدا ہو گئے۔

اس وقت اور اس کے بعد سے اردو ہندی تنازعہ زبان کے مسئلے سے ہٹ کر مذہبی اور تہذیبی مسئلہ بن گیا۔ سیاسی اور قومی احساس کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ ایک فرقہ وارانہ شکل اختیار کرتا رہا۔ ہندی کو قومی حیثیت دلانے کے لیے متعدد ہندی فروغ انجمنیں تشکیل دی گئیں اور ساتھ ہی "ہندوستانی" کے نام سے اردو کو ہندی میں ضم کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ مسلمانوں نے ہندو ذہنیت کے اس لائحہ عمل کو ابتدا ہی میں محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اردو یا اپنی تہذیب کے تحفظ اور اس کے فروغ کیلئے ایک علیحدہ راستے کی ضرورت محسوس کی جس پر وہ اپنی تہذیب اور نظریۂ حیات کو گامزن رکھ سکیں۔ چنانچہ یہ پہلا اور اہم ترین تہذیبی عنصر ہے جو مسلمانوں کو دو قومی شعور عطا کرتا ہے اور انہیں علیحدگی کی سیاست کے لیے تیار کرتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تقسیم بنگال ـــــ اسباب و نتائج

انگریزی عہد میں بنگال ایک بہت بڑا صوبہ تھا۔ رقبہ تقریباً دو لاکھ مربع میل تھا اور آبادی آٹھ کروڑ افراد پر مشتمل تھی۔ اس وسعت کی وجہ سے اس صوبے کی انتظامی حالت نہایت خراب تھی۔ خصوصاً مشرقی بنگال شدید انتشار اور بحران کا شکار رہتا تھا۔ اس وجہ سے وہاں کے کسانوں کی حالت بڑی تباہ رہتی۔ زمینیں ہندوؤں کے قبضے میں تھیں جو مغربی بنگال کے علاقوں میں رہتے تھے۔ ان کے کارندے کسانوں کو، جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی، بری طرح لوٹتے تھے۔ آمدورفت کے راستے اور رسل و رسائل کے ذرائع بہت محدود تھے یا کہیں کہیں موجود ہی نہ تھے۔ انتظامی طور پر مسائل کی سنگینی کی وجہ سے حکومت کافی عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ بنگال کے صوبے کو، جس میں اس وقت مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے علاوہ بہار اور اڑیسہ کی ہندوستانی ریاستیں بھی شامل تھیں، از سر نو تقسیم کر دے۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء کے آخر میں اس تقسیم کے متعلق فیصلے کا اعلان کر دیا گیا۔ اور ۱۹۰۵ء میں اس کو آخری شکل دے کر نافذ کر دیا گیا۔ اس تقسیم کا ایک اتفاقی نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی بنگال اور آسام کے نئے صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی۔

حکومت کا یہ منصوبہ اپنے پس منظر میں مسلمانوں کی ہمدردی پر مبنی نہیں تھا۔ یہ محض اشک شوئی اور مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لیے کیا گیا تھا۔ کیونکہ مسلم اکثریت کے اس صوبے کی اقتصادی زندگی بہرحال ہندو زمینداروں اور سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے اس تقسیم کا خیر مقدم کیا۔ شدید محرومیوں کے دور میں ان کے فائدے کی یہ ایک موہوم سی خوشی ان کے لیے بڑی خوش آئند تھی۔ چنانچہ انہوں نے کہا، "اس تقسیم نے ہماری بے عملی رفع کر دی اور ہم کو جد و جہد کی طرف متوجہ کر دیا۔"

ہندو تقسیم کے اس فیصلے سے کبھی خوش نہ ہو سکتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس طرح مسلمان ایک حد تک اپنے کھوئے ہوئے حقوق کو حاصل کرنے کے قابل ہو رہے ہیں۔ اور دوسری طرف اس تقسیم سے انہیں اس کے لیے مواقع فراہم ہو رہے ہیں۔ وہ یہ گوارا نہ کر سکتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ مسلمان اپنی پسماندگی اور زبوں حالی کو دور کر کے ان کے قریب بھی پہنچیں۔ مسلمانوں میں سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ اقتصادی خوشحالی ہندوؤں کے لیے سخت خطرہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے احتجاج کا طوفان کھڑا کر دیا۔ ملک کے بیشتر حصوں میں سخت شورش پیدا ہوئی۔ بنگال اس تحریک احتجاج کا مرکز تھا۔ انقلاب اور بغاوت کے نام پر شورش پسندوں کے گروہ برسرِ احتجاج ہوئے اور انہوں نے تشدد کا سماں پیدا کر دیا۔ کانگریس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنے طور پر ہندوستان گیر احتجاجی مہم شروع کی۔ شروع میں تحریک کا رخ برطانوی حکومت کی طرف تھا۔ مگر بعد میں آہستہ آہستہ مسلمانوں کی طرف موڑ دیا گیا۔ ہندو قائدین نے اس تحریک کو مؤثر اور عوامی بنانے کے لیے مذہبی جذبات کو ابھارنے کا کام کیا۔ یہ کہا گیا کہ "تقسیم کی وجہ سے کالی دیوی کی توہین ہوئی ہے" اور اس نے بنگالی قومیت کو نقصان پہنچایا ہے۔ چنانچہ بنگال کے عام ہندو اس تحریک میں سرگرم ہوئے۔

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہو رہا تھا کہ اس سے مسلمانوں کے فائدے کا ایک امکان تھا۔ اور جو انصاف اور اصول کے مطابق تھا۔ اور ہندوؤں سے وہ کچھ چھینے جانے کا خطرہ تھا جو ناانصافی کے سبب انہیں حاصل تھا۔ ہندوؤں کی یہ شورش سوائے فرقہ وارانہ عداوت، تعصب اور مسلم دشمنی کے کچھ نہ تھی۔ ورنہ بعد میں جب بنگال سے بہار کو الگ کیا گیا اور اڑیسہ کو ضم کیا گیا تو نہ کانگریس نے احتجاج کیا اور نہ انقلابی اور دہشت پسند میدان میں آئے۔ کیونکہ ان دونوں صوبوں کے بنگال سے نکلنے کے بعد بھی وہاں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ صرف کانگریس ہی نہیں بلکہ اس وقت ہندوؤں کی جتنی قومی و مذہبی اصلاح کی انجمنیں تھیں، ان سب کا رخ ہندو قائدین نے مسلمانوں کی طرف پھیر دیا تھا۔ اور وہ سب کانگریس کی قیادت میں تقسیمِ بنگال کے فیصلے کے خلاف مصروفِ احتجاج ہوئیں۔ اس وقت بعض معتبر انگریزوں نے بڑے عزم اور ارادے کے ساتھ یہ اعلانات کیے تھے کہ تقسیم بنگال ایک قطعی فیصلہ ہے، منسوخ نہیں ہو سکتا۔ مگر برطانوی حکومت اس خیال پر قائم نہ رہ سکتی تھی۔ کیونکہ ہندوؤں سے اس کی دوستی کی روایت خاصی پرانی تھی۔ اور وہ اکثریت کی مخالفت کو برداشت بھی نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہمیشہ کی طرح مسلمانوں کے مفاد کو پسِ پشت ڈال کر بنگال کی تقسیم کے فیصلے کو ایک مرحلے پر بعد میں منسوخ کر دیا۔ ہندوؤں کی اس تحریک کے دوران مسلمانوں کی اپنی کوئی سیاسی انجمن نہیں تھی جو کانگریس اور دیگر قومی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکوں کی مخالفت کا جواب دیتی۔ مسلمان ابھی تک سیاسی اعتبار سے متحد نہیں تھے۔ ہندوؤں کی مخالفانہ تحریک کے جواب میں نہایت کمزوری کے ساتھ ان کی انفرادی آوازیں اٹھتی تھیں چنانچہ بعض مسلمان زعماء نے سوچا کہ مسلمانوں کی تنظیم اور سیاسی امور میں ترجمانی کے لیے ایک انجمن قائم کی جائے۔ اس طرح نواب سلیم اللہ خاں کی قیادت میں "محمڈن پراونشل یونین" قائم ہوئی۔ یہ مسلم لیگ کے قیام کی طرف پہلا قدم تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جداگانہ انتخابات کا مسئلہ

ہندو قومیت کے جذبات کو برطانوی حکومت کی سرپرستی میں بڑی تقویت پہنچتی رہی۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس نے برطانوی حکومت کے زیر سایہ جدید شکل اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کو ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہا کہ مسلمان جو اپنی ناکامیوں کے باوجود ابھی تک انگریزوں سے برسرپیکار ہیں، کہیں ان کے علاوہ دوسری قومیں بھی اپنے قومی مفادات کے لیے مسلمانوں کے شریک نہ ہو جائیں۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کم از کم ہندوؤں کو اپنے زیر سایہ رکھا جائے تاکہ خود انگریز اپنی طاقت میں اضافہ کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک ایسی انجمن کے قیام کی بابت سوچا جو ہندوستانی قومیت کو فروغ دے سکے۔ جس کے ذریعے ہندوستانی اپنے معاشرتی مسائل پر گفتگو کریں اور جہاں وہ اپنے دل کا غبار نکال سکیں تاکہ بغاوت کا مزید خطرہ ختم ہو جائے۔ چنانچہ برطانوی حکومت کے ایک عہدیدار اے۔ او۔ ہیوم نے وائسرائے کی رضامندی سے "انڈین نیشنل کانگریس" کی بنیاد ڈالی۔ اس کا افتتاحی اجلاس ایک انگریز کے گھر پر ہوا اور اس کے جلسوں میں صوبوں کے گورنر اور دوسرے بڑے انگریز اور افسر شریک ہوتے۔ بیشتر جلسوں کی صدارت مقتدر انگریزوں نے کی۔ اس کے اجلاس میں پہلی قرارداد ہمیشہ حکومتِ برطانیہ سے اظہار وفاداری پر مبنی ہوتی۔ اور اس کے قائدین کو حکومت کی بڑی بڑی آسامیوں پر تقرر کے لیے ترجیح دی جاتی۔

کانگریس نے ابتدا ہی سے ایسی روش اختیار کی جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تھی۔ اس کی ساری کوششیں یہ تھیں کہ ہندو اکثریت کے لیے، جو پہلے ہی سے نسبتاً بہتر حالت میں تھی، زیادہ سے زیادہ اختیار اور ذمے داری کے عہدے حاصل کیے جائیں۔ ہندوؤں نے کانگریس میں عام شمولیت اختیار ہی اس لیے کی کہ وہ اس طرح انگریزوں سے قریب ہو کر اپنے لیے مفادات حاصل کر سکتے تھے۔ اس سے قبل ان میں نہ قومی وحدت کا کوئی تصور تھا اور نہ اس مقصد کے لیے ان کی کوئی کل ہند جماعت تھی۔ ہندو ایک طویل عرصے سے انگریزوں کے زیر سایہ تھے اور ان کے علوم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ان کے طرزِ حکومت کو سیکھ رہے تھے، وہ اب برطانوی پارلیمانی طرزِ حکومت کے وہ داؤ پیچ اچھی طرح سمجھ چکے تھے جو ان ہی کے لیے مفید بھی تھے۔ انہوں نے اس کے لیے بڑی کوشش کی کہ چند مسلمان بھی کانگریس میں شریک ہو جائیں تاکہ تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم . . . . اور اس طرح کانگریس کو قومی جماعت اور اس کے مطالبات کو تمام ہندوستانیوں کے مطالبات کہا جا سکے۔

ہندوؤں نے انگریزوں کی پیروی ہر موقع پر اس وجہ سے کی کہ انگریز ہندوستان میں برطانوی طرز کی پارلیمانی حکومت قائم کر دیں۔ مرکز اور صوبوں کی کونسلوں کے لیے انتخابات ہوں اور ملازمتوں کے لیے مقابلے کے امتحانات ہوں۔ بظاہر یہ بڑی روشن خیالی کی باتیں تھیں اور بڑی ترقی پسندانہ نظر آتی تھیں۔ مگر ہندوستان جیسے ملک کے لیے، جس میں تمام دوسری قوموں کے علاوہ مسلمان بھی تھے، جو انگریزوں کے تسلط سے پہلے ہندوستان کے حکمران رہے اور اپنی اس امتیازی حیثیت کو بھولے نہ تھے، یہ ایک شرانگیز خیال اور فتنہ پرور صورتِ حال تھی۔ انگریزوں کو یہ اس وجہ سے اچھا معلوم ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق اور نفرت بڑھانے کی اس سے بہتر اور کوئی تدبیر بھی نہ ہو سکتی تھی اور اپنی حکومت کے استحکام کے لیے انگریزوں کو اس امر کی ضرورت تھی۔ ہندوؤں نے یہ مطالبہ کر دیا کہ گورنر جنرل کی کونسل اور صوبائی کونسلوں میں انتخابات کے اصول رائج کیے جائیں۔ ان اداروں میں سادہ مخلوط انتخابات کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہونے والا تھا کہ ہندو جو اکثریت میں تھے وہ منتخب ہوں اور مسلمان ناکام۔ اور ان اداروں سے جو اختیارات حاصل ہوں وہ برطانوی حکومت کی سرپرستی میں ہندو استعمال کریں اور مسلمانوں کو اپنا بھی محکوم بنا لیں۔ بعد کے حالات نے اس امر کی تصدیق کر دی۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستانی کونسلوں کے لیے ۱۸۹۲ء میں ایک آئین منظور کیا۔ جس کی رو سے مرکزی اور صوبائی کونسلوں کی رکنیت کی تعداد میں اضافہ ہوا اور بعض غیر سرکاری اراکین کو اس کا موقع دیا گیا کہ انتظامی امور پر حکومت سے سوالات کریں اور سالانہ بجٹ پر بحث کریں۔ یہ ایک اہم واقعہ تھا اور کانگریس نے اس کو اپنی فتح سے تعبیر کیا۔ اس آئین کے تحت ۱۸۹۳ء میں انتخابات ہوئے۔ انتخابی حلقے مخلوط تھے۔ ان میں مسلمان امیدواروں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے کچھ قبل بلدیاتی اور ضلعی کونسلوں کے انتخابات میں بھی ایسا ہی ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں میں اس وقت سید احمد خاں کے خیالات مسلم قومیت کے تصور کی نمائندگی کر رہے تھے۔ وہ کانگریس کے ایسے عزائم کو خوب سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف جہاں مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کی تلقین کی تو دوسری طرف جداگانہ انتخاب یا مسلمانوں کے لیے علیحدہ و جداگانہ انتخابی حلقوں کی تشکیل کی تجویز کی جسے مسلمانوں نے پسند کیا اور اپنے اہم مطالبے کی صورت دی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم لیگ کا قیام

۱۹۰۶ء کا سال ہندوستانی سیاست اور بالخصوص مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے لیے ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت مسلمان اگرچہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے اپنا دامن آلودہ کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ اس کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ ان کی قسمت ہمیشہ دوسری قوموں کے ہاتھ میں رہے۔ برطانوی حکومت نے مختلف وقفوں میں ہندوستان کو سیاسی اصلاحات کی دو قسطیں عطا کی تھیں۔ اور اب تیسری عطا ہونے والی تھی۔ مسلمان اب تک ان سیاسی تبدیلیوں کو نہایت خوش اطواری اور سعادت مندی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ اور اب تک ان کی درخواستوں نے مطالبے کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ وہ صرف گزارشات کے قلعے میں محصور تھے۔ بے شک وہ کانگریس میں عام مسلمانوں کی شرکت پسند نہیں کرتے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کانگرس کو اس مرحلے پر مسلمانوں کا یکسر دشمن سمجھتے ہوں۔ وہ اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے تھے اور اب اس امر پر مجبور ہو رہے تھے کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کے طریق کو اختیار کریں۔ کچھ ہی عرصہ قبل ہونے والے ہندو مسلم فسادات نے ان کے قلب و جگر پر بڑی کاری ضربیں لگائی تھیں۔ اردو ہندی تنازعہ، مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی عدم موجودگی اور تقسیم بنگال کے فیصلے کے خلاف کانگریس کی احتجاجی تحریک کو دیکھ کر مسلمانوں کے چند نمائندہ قائدین نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے حقوق و مفادات کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ اس صورتِ حال میں کہ حکومت اصلاحات کی ایک قسط دینا چاہتی تھی جو موجودہ قانون ساز اسمبلیوں اور انتخابات کے حلقوں کو مزید وسعت دے گی، مسلمانوں نے اپنی خواہشات پیش کرنے کے لیے وائسرائے کی خدمت میں ایک وفد بھیجا۔ اس وفد نے مطالبہ کیا کہ "مسلمانانِ ہند کو محض ایک اقلیت نہ سمجھا جائے بلکہ قوم کے اندر قوم سمجھا جائے، جس کے حقوق اور ذمہ داری کا تحفظ دستور کے ذریعے ہو۔" وفد کے ارکان نے امید ظاہر کی کہ یہ مقصد قانون ساز اسمبلیوں اور لوکل باڈیز، دونوں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کے لیے مناسب اور جداگانہ حقِ نمائندگی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس وفد نے جس اہم ترین اصول کا مطالبہ کیا تھا اور جسے بعد میں تسلیم کر کے "منٹو مارلے اصلاحات" میں شامل کر دیا گیا، "جداگانہ قومی حق رائے دہی" اور "جداگانہ فہرست رائے دہندگان" کا مطالبہ تھا۔ اسی طریقہ کو جداگانہ انتخاب کا طریقہ کہا جانے لگا جس میں تمام رائے دہندگان مسلمان تھے اور وہ صرف مسلمانوں کو اپنا نمائندہ منتخب کر سکتے تھے۔

مسلمانوں کے لیے یہ کامیابی امید افزا ضرور تھی لیکن ان کی خواہشات کا یہ تکمیلی مرحلہ بھی نہیں تھا۔ وائسرائے سے ملاقات کے بعد وفد کے شرکاء نے شملہ ہی میں مسلمانوں کے لیے ایک سیاسی انجمن کے قیام کے مسئلے پر گفتگو کی۔ انہیں وفد کی ترتیب کے وقت یہ ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ نواب سلیم اللہ خاں نے، جو کچھ عرصہ قبل "محمڈن پراونشیل لیوگز" قائم کر چکے تھے، اب ایک "مسلم آل انڈیا کنفیڈریشن" کی تجویز پیش کی۔ جس کے ذریعے ان کے خیال میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا سدباب کیا جائے اور ان مسلمانوں کو واپس لانے کی کوشش کی جائے جو کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔ نواب سلیم اللہ خاں نے اس مضمون کا مراسلہ شائع کیا اور نمائندہ مسلمان رہنماؤں کو ڈھاکہ آنے کی دعوت دی۔ یہی دعوت انہوں نے "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کو بھی دی جو اس وقت تک بعض قومی معاملات میں مسلمانوں کی نمائندگی کر لیتی تھی اور جس کا سالانہ اجلاس عنقریب متوقع تھا۔ اس دعوت کے جواب میں ڈھاکہ میں ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو مسلم ہندوستان کے نمائندوں کا ایک عظیم الشان اجلاس ہوا۔ اس سے قبل مسلمانوں کا اتنا بڑا اور کامیاب سیاسی اجتماع ہندوستان کے کسی گوشے میں کبھی نہیں ہوا۔ اس اجتماع کی صدارت نواب وقار الملک نے کی اور ایک قرارداد کے ذریعے جسے نواب سلیم اللہ خاں نے پیش کیا اور جس کی تائید حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں نے کی، "آل انڈیا مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا۔

جس قرارداد کے ذریعے مسلم لیگ قائم ہوئی، اس میں کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ کے قیام کا مقصد مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کرنا، ان کے مطالبات حکومت تک پہنچانا اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا اور مسلم لیگ کے مفاد کو نقصان پہنچائے بغیر ہندوستان کی دوسری قوموں سے اتحاد کی کوشش کرنا تھا۔ اس اجلاس میں چند بہت ضروری مسائل سے متعلق تجویزیں بھی منظور ہوئیں جن میں کہا گیا کہ "تقسیم بنگال مسلمانوں کے لیے مفید ہے، اسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برقرار رکھا جائے اور اس کے خلاف جو احتجاجی تحریک چل رہی ہے، اسے نظر انداز کیا جائے۔ کانگریس نے جو قومی جماعت ہونے کی دعویدار تھی، تقسیمِ بنگال کی مخالفت کی ہے اور احتجاجی تحریک شروع کی ہے، اس لیے یہ اجتماع اس سے اختلاف کا اظہار کرتا ہے۔"

اس اجتماع میں جن نمائندہ رہنماؤں نے شرکت کی، ان میں نواب سلیم اللہ خاں، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، سر آغا خاں، سر علی امام، مولوی عزیز مرزا، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مولانا ظفر علیخاں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کی کوششوں سے مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے قیام میں کوئی بیرونی دباؤ شامل نہ تھا۔ کانگریس کی طرح اس کا قیام نہ کسی انگریز کے ہاتھوں عمل میں آیا اور نہ اس کی صدارت کبھی کسی انگریز نے کی۔ اس کا مرکزی دفتر علیگڑھ میں قائم ہوا اور سر آغا خاں کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ نواب وقار الملک اس کے سیکرٹری اور نواب محسن الملک جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس کا دستور وضع کرنے کے لئے ساٹھ ارکان پر مشتمل ایک مجلس تشکیل دی گئی۔ پھر وہ دستور تمام اراکین کے پاس غور و تنقید کے لیے بھیجا گیا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ تمام صوبوں میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جائیں۔ چنانچہ صوبوں سے ارکان منتخب ہوئے اور ان سے مرکزی لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی جس نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کے حصول کی جدوجہد کا بار اپنے کندھوں پر اٹھایا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عالمِ اسلام کی صورتِ حال، پندرہویں صدی کی ابتدا تک

عالمی سیاست میں دنیائے اسلام کو ہمیشہ سے ایک اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کو یہ اہمیت اس وقت سے حاصل ہوئی ہے جب بحری راستوں سے آمد و رفت میں سہولتیں پیدا ہوئیں اور مشرق و مغرب میں آمد و رفت اور تجارت کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعد میں جب تجارتی تعلقات نے سیاسی رنگ اختیار کیا اور بین الاقوامی سیاست کا رجحان پیدا ہوا تو اس کا مرکز بھی مشرقِ قریب ہی قرار دیا گیا۔ مشرق اور مغرب کی تجارت ابتدا میں خشکی کے راستے قافلوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ چین، جاپان اور مجمع الجزائر سے تجارتی سامان خلیج فارس تک لے جایا جاتا اور وہاں سے تجارتی قافلے اسے شام کے ساحل تک پہنچاتے۔ جہاں سے وہ مغربی ملکوں کو بھیجا جاتا۔ تیرھویں صدی میں چنگیز خاں کے حملوں کی وجہ سے یہ تجارت دو راستوں میں بٹ گئی۔ ایک راستہ دریائے راکسی، بحرِ کیسپین اور بحرِ اسود ہوتا ہوا قسطنطنیہ پر ختم ہوتا تھا۔ اور دوسرا بحرِ نجد، بحرِ احمر اور دریائے نیل سے ہوتا ہوا اسکندریہ تک آتا تھا۔ مغرب کے تاجر قسطنطنیہ اور اسکندریہ کے بازاروں میں تجارت کرتے تھے۔ لیکن جب ترکوں اور یورپ کی عیسائی قوموں میں باہم لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا تو وہ منڈیاں ویران ہونے لگیں۔ اس وقت سے یورپ کی قوموں کو براہِ راست ان ملکوں تک پہنچنے کا شوق پیدا ہوا جہاں سے انہیں تجارتی سامان مل سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اہم محرک ان عیسائیوں کا مذہبی جنون بھی تھا جو اسلامی حکومتوں کو اندلس سے ختم کر دینے کے بعد افریقہ کے شمالی کناروں پر آباد مسلمانوں پر اپنا جوشِ انتقام صرف کرنا چاہتے تھے۔ ان مہموں نے سب سے پہلے یورپ کو افریقہ کے وحشی قبائل سے آشنا کیا اور اس سے انہیں تبلیغی کوششوں کے لیے ایک نیا میدان حاصل ہو گیا اور انہوں نے بڑھتے بڑھتے بحرِ ہند کی حکمرانی عربوں سے چھین لی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ راس امید تک پہنچ گئے۔

راس امید کا راستہ دریافت ہونے کے بعد کچھ عرصے تک مشرقِ قریب کی اہمیت کم ہو گئی اس لیے تجارت کا راستہ بدل گیا۔ مگر انیسویں صدی کے اختتام پر نہر سوئز کھل جانے سے اسکی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پرانی اہمیت واپس آگئی۔ اس وقت سے ہمیشہ یہ علاقہ مغربی قوموں کی سازشوں کا مرکز رہا ہے۔

ابتدا میں جس طرح کہ تجارت میں مشرق کو سبقت حاصل تھی۔ اسی طرح سیاست میں بھی اس کا پلہ بھاری تھا۔ پہلے تو تجارتی راستے کے مختلف حصوں پر الگ الگ حکومتوں کا قبضہ تھا لیکن سولھویں صدی کے شروع میں اسلامی ممالک کی قیادت آہستہ آہستہ ترکی کے ہاتھ میں آگئی۔ ترکانِ آلِ عثمان یورپ کے ابھرتے ہوئے مستقبل کو قریب سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیے یہ ممکن تھا کہ علم و عقل کے میدان میں پیش قدمی کریں اور یورپ کی عیسائی قوموں پر برتری حاصل کریں۔ لیکن ترکوں کی بدقسمتی سے زیادہ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ عین ترقی و عروج کے زمانے میں ترکوں میں تنزل و انحطاط شروع ہوگیا۔ ان کا تنزل صرف علم و حکمت ہی میں نہ تھا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اور عوامی انحطاط تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے فنونِ جنگ میں بھی یورپ سے اس حد تک پیچھے رہ گئے کہ ۱۷۷۴ء میں یورپ نے انہیں شکست دے کر دنیا پر ظاہر کر دیا کہ ترک جنگی طاقت میں یورپ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صدی کے عرصے میں ترکی کے مقبوضات رفتہ رفتہ ہاتھ سے نکلتے گئے اور مغربی طاقتیں ان پر قابض ہوتی گئیں۔ یورپ اب پوری توانائی کے ساتھ وسیع و عریض دنیا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسلامی ممالک کے اندرونی انحطاط نے اسے یہاں بھی پیش قدمی کا موقع دیا جو اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ سلطنتِ عثمانیہ کے کمزور ہو جانے سے انہیں ایک نادر موقع مل گیا۔ اور روس، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، یونان اور آسٹریا سب دنیائے اسلام کے مختلف ملکوں پر ٹوٹ پڑے اور اپنی اپنی خواہشوں کے مطابق انہیں ہضم کرنے لگے۔ ہندوستان کی ہزار سالہ اسلامی مملکت انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئی اور مصر اور تیونس پر بھی برطانوی تسلط قائم ہوا۔ روس نے بحرِ اسود کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کی خواہش تھی کہ قسطنطنیہ پر اس کا قبضہ یا کم از کم اثر قائم ہو جائے۔ ترکی کے بیشتر حصے پر اس نے اپنے قدم جما لیے اور وسطی ایشیا میں سمرقند پر قبضہ کر لیا اور بخارا کی امارت کو اپنے تسلط میں لے لیا۔ ایران کا کچھ حصہ بھی اس کے تحت چلا گیا۔ فرانس شمالی افریقہ پر اپنا تسلط جما رہا تھا۔ اس نے پہلے مصر میں تجارتی مراعات حاصل کیں پھر نہر سوئز کی تعمیر میں مدد دے کر اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کا بندوبست کر لیا۔ اس دوران جرمنی نے دارالسلام تک اپنے قدم بڑھائے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں دنیائے اسلام کا مسئلہ اور بھی اہم ہوگیا۔ روس، برطانیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جرمنی، مشرقِ قریب میں خاص دلچسپی لے رہے تھے۔ روس کی لالچ کبھی کسی انتہا پر نہ پہنچی۔ جرمنی اب برلن سے بصرہ تک اپنا اقتدار قائم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ آسٹریا سالونیکا کا طلبگار تھا۔ آسٹریا اور جرمنی نے اپنے مقاصد کے لیے آپس میں اتحاد کیا جس کے جواب میں برطانیہ اور روس بھی ایک ہوئے۔ مغرب میں آمنے سامنے دو گروہ بن گئے۔ پہلی جنگِ عظیم کا ایک اصل سبب یہ بھی تھا کہ یہ مشرق سے شروع ہوئی اور مشرق ہی کے لیے لڑی گئی۔ جنگِ عظیم تک مشرقِ قریب اور دنیائے اسلام کے ملک یا تو یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں کے قبضے میں تھے یا ان کے زیرِ اثر تھے۔ اب بین الاقوامی سیاست کی اس صورتِ حال نے ان میں ایک اندرونی بے چینی بھی پیدا کر دی۔ ہندوستانی مسلمان عالمِ اسلام کی اس صورتِ حال سے بھی متاثر تھے۔ انہیں جہاں اپنی محکومی اور زوال کا دکھ محسوس ہوتا تھا تو ان کے لیے عالمِ اسلام کا یہ احوال بھی اضطراب اور بے چینی کا سبب تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری

عالمِ اسلام کے پس منظر میں

انیسویں صدی کے اختتام تک ساری دنیائے اسلام مغربی اور سامراجی طاقتوں کی زد میں تھی۔ مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت اب پوری طرح واضح تھی اور انہیں اپنے زوال کا شدید احساس تھا۔ اس احساس نے ان میں ہیجان اور اضطراب پیدا کر دیا۔ انہیں یہ بھی خیال ہوا کہ ہم غیر منظم ہیں اور ہمارے زوال کی اصل وجہ یہی ہے۔ انہیں اپنے نقصانات اور مصیبتوں کا افسوس تو تھا لیکن وہ اس قدر منتشر تھے کہ متحد ہو کر اس حالت کا مداوا کرنے کے قابل نہ تھے، کیونکہ انہوں نے اس کے تدارک کے لیے جو بھی کوشش کی اس میں انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔ اس دور میں زوال و انحطاط سے بچنے کی ایک ناکام لیکن مؤثر کوشش تحریکِ اتحادِ اسلامی تھی۔ یہ دراصل مسلمانوں کی سیاسی قوت اور ان کی تہذیب کو ایک ایسے وقت میں زوال سے بچانے کی ایک اضطراری کوشش تھی جب خلافتِ اسلامیہ اپنی گزشتہ عظمت و قوت اور اپنی سخت جانی کی وجہ سے یورپ کی عیسائی قوتوں سے نبرد آزما تھی اور اس کے برعکس دوسرے اسلامی ممالک رفتہ رفتہ مغربی سامراجیوں کے قبضے میں آ چکے تھے۔ تحریکِ اتحادِ اسلامی کا بڑا سبب عالمِ اسلام کا انحطاط بلکہ ترکوں کا زوال تھا۔ بارہ سو سال کے طویل انتشار کے بعد تاریخ میں یہ پہلا بنیادی اسلامی نصب العین تھا جو عملی صورت اختیار کرنے کا خواہاں تھا۔ ترکی کے سلطان عبدالحمید نے منصبِ خلافت کو ایک عالمگیر اتحادِ اسلامی کا مرکز قرار دینے میں کامیابی حاصل کی اور خلافت اور ترکی کے سیاسی مسائل کو مسلمانانِ عالم کی تمام توجہ اور ہمدردیوں کا مستحق بنایا۔ اس تحریک کی وسعت اور مقبولیت کے لیے سید جمال الدین افغانی کا تعاون بڑا مؤثر اور نہایت مفید ثابت ہوا۔ وہ ایک مذہبی مصلح، روشن خیال مفکر اور سیاسی رہنما تھے۔ ان کی تمام کوششوں اور مسلسل جدوجہد کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ تمام مسلم اقوام ایک اسلامی حکومت کے تحت متحد ہو جائیں اور ان سب پر ایک خلیفۃ المسلمین کا مکمل اور کلی اقتدار ہو۔ ان کے خیال میں محض اتحادِ اسلامی ہی مسلمانوں کو عیسائیت اور مغربی سامراجیوں سے نجات دلا سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمال الدین افغانی کی فکری اور عملی سرگرمیاں سارے عالمِ اسلام میں جاری رہیں۔ افغانستان، ایران، ترکی، مصر اور ہندوستان ان سب ممالک میں ان کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں نے ان ممالک میں ایسے جذبات بیدار کر دیے جو پہلے خوابیدہ تھے اور جنہوں نے عالمِ اسلام کے نقطۂ نظر کو تبدیل کرنے، اسے خود اعتمادی، عزتِ نفس اور آزادی کی ترغیب دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ چنانچہ بیسویں صدی کی ابتدا میں مختلف ممالک کے مسلمانوں میں ایک رابطہ پیدا ہو گیا۔ ان میں بیداری اور احساسِ غلامی کے آثار نظر آنے لگے جو مٹ رہے تھے۔ انہیں اپنے زوال اور عالمِ اسلام کی بے بسی پر افسوس ہونے لگا۔ خلافت کے مسئلے اور ترکوں کے ساتھ خاص دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ اتحادِ اسلامی کی ایک علامت تھی۔

ہندوستان میں ان جذبات کے پھلنے پھولنے کے خاصے امکانات تھے۔ کیونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں یہاں اقلیت میں تھے۔ ان کے لیے اتحاد کی ضرورت زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ انہیں اکثریت کے سیاسی اور تہذیبی غلبے کا شدید احساس تھا۔ انہیں ہندو اکثریت سے تحفظ کے لیے اپنے ہم عقیدہ اقوام کا تعاون درکار تھا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں تحریک خلافت کے پس پشت ان جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں نے نہ صرف جمال الدین افغانی کے نصب العین کو قبول کیا بلکہ ان کے اس سیاسی پیغام کو بھی کہ سلطان ترکی اب سب مسلمانوں کا خلیفہ ہے۔ یہ بلاشبہ جمال الدین افغانی کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ یہاں کی مسجدوں میں اب نمازِ جمعہ کے خطبوں میں سلطان ترکی کا نام "خلیفۃ المسلمین" کے طور پر پڑھا جانے لگا۔ ایک ہندوستانی مسلمان عبداللہ سہروردی نے لندن میں ایک "مجلس اتحادِ اسلامی" قائم کی اور اتحادِ اسلامی کے جذبات کو عام کرنے کے لئے ایک جریدہ "اتحادِ اسلام" جاری کیا۔

جمال الدین افغانی اپنی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے پیرس سے ایک اخبار نکالتے تھے جس کا داخلہ حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان میں ممنوع قرار دیا تھا۔ لیکن یہ چوری چھپے یہاں پہنچ جاتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ گردش کرتا تھا۔ افغانی جب ہندوستان آتے تو انہیں یہاں بڑی گرم جوشی اور مقبولیت حاصل ہوتی۔ یہ انہی کا اثر تھا کہ یہاں متعدد ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے بھی عالمِ اسلام سے ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنوں کو قریب کرنے اور انہیں عیسائیت اور مغربی سامراجیوں سے آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ مولانا حالی کا "مسدس مدوجزرِ اسلام"، مولانا شبلی کی نظمیں اور ان کے مضامین اور عبدالحلیم شرر کی ناولیں عام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنے کا کام کر رہی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے عام اور پڑھے لکھے مسلمانوں کے طبقے کو دشمنانِ اسلام کے خلاف بہت زیادہ مشتعل کر دیا۔ ان کے اخبارات و جرائد "البلاغ"، "الہلال"، "کامریڈ" اور "زمیندار" وغیرہ اس سلسلے میں بڑھ چڑھ کر، مسلمانوں میں ہلچل اور اضطراب پیدا کر رہے تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر علامہ اقبال کی نظموں نے اسلامی قومیت کے حقیقی تصور کو اجاگر کیا اور مسلمانوں میں آزادی اور اتحادِ اسلامی کے جذبات کو تقویت پہنچائی۔

متعدد علماء بھی قومی اور سیاسی سرگرمیوں میں مستعد ہوئے۔ ان کی جانب سے عام بیداری، عالمِ اسلام سے رابطے، آزادی اور عیسائیت کے خلاف کئی تحریکیں شروع ہوئیں جو عام مسلمانوں میں قومی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کا سبب بنیں۔ اس دوران خاص طور پر ترکی میں مغربی طاقتوں کی جارحیت اور بلقان کی جنگوں نے تمام مسلم ممالک کو احتجاج پر مجبور کر دیا تھا۔ ہندوستان میں ان واقعات پر شدید ردِ عمل رونما ہوا۔ پھر ترکی کے پہلی جنگِ عظیم میں شامل ہونے سے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں بھی ایک نیا دور شروع ہوا اور مسلمان حکومتِ برطانیہ کے خلاف پوری توانائی کے ساتھ کمربستہ ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"میثاقِ لکھنؤ" ــــ مسلمانوں کی پہلی سیاسی کامیابی!

مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کی نگرانی کے لیے مسلم لیگ کی تشکیل دراصل علیگڑھ تحریک کے دوسرے دور کی ابتدا رہے۔ یہ سید احمد خاں کے خواب کی ایک ابتدائی تعبیر تھی۔ اس کے قیام کے تین سال بعد ۱۹۰۹ء میں "منٹو مورلے آئینی اصلاحات" نافذ ہوئیں۔ جس کی رو سے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کے حقوق تسلیم کیے گئے اور انتخابی حلقے بھی علیحدہ مقرر ہوئے۔ اس طرح ملک میں پہلی نمائندہ حکومت خود اختیاری کی طرف قدم بڑھایا گیا۔ ان حقوق کے تسلیم کیے جانے سے مسلمانوں کو سیاسی تحفظ کے حقوق حاصل ہوئے۔ یہ مسلم لیگ کی پہلی اہم کامیابی قرار دی جاسکتی ہے۔ مسلم لیگ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مطالبات پیش کرنے اور حکومت کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے آگاہ کرنے کے لیے ہر سال اجلاس منعقد کرتی تھی۔ اس میں زیادہ تر ماتحت کمیٹیوں اور عہدیداروں کے متعلق اور کچھ مفادِ عامہ کے متعلق اور باقی ماندہ قراردادیں عہدوں، ملازمتوں اور جداگانہ نمائندگی کے حصول کے مطالبات پر پیش کی جاتی تھیں۔ اس کے برخلاف کانگریس، جو اس وقت تک مختلف طبقات کی مصلحتوں کے تحت ایک منظم، طاقتور اور مؤثر جماعت بن چکی تھی اور اس نے رائے عامہ کو اپنی پشت پر جمع کرلیا تھا۔ اس وقت وہ انگریزوں کے رحم و کرم پر رہنے کے بجائے اب اپنے مقاصد کی تشریح و توضیح عوام کے درمیان کرتی۔ اس وجہ سے وہ حکومت کے لیے ایک طاقتور تنظیم تھی۔ تقسیم بنگال کے فیصلے کو، جو مسلمانوں کے فائدے میں تھی، منسوخ کرانے کے لیے کانگریس نے زبردست جدوجہد کی۔ اس کا مطالبہ اس قدر شدید تھا کہ باوجود مسلمانوں کی وفاداری اور مؤدبانہ گزارشوں کے ۱۹۱۱ء میں خود شہنشاہ برطانیہ نے بذاتِ خود تقسیم بنگال کے فیصلے کو منسوخ کردیا۔ مسلمانوں کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ تقسیم کا فیصلہ منسوخ نہیں کیا جائیگا۔ اس یقین دہانی کے باوجود تنسیخ کے فیصلے نے مسلمانوں کو بہت زیادہ متاثر اور مایوس کیا۔ حکومتِ برطانیہ ہندوؤں کی شورش کے آگے جھک گئی تھی اور اس طرح اس نے مسلمانوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی احتجاج کا راستہ دکھا دیا تھا، جو اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ حکومت کی مدد پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوؤں نے محض شورش اور ہنگامہ و احتجاج سے اپنے مقصد کو حاصل کیا ہے۔ اب انہیں اپنی حکمتِ عملی اور اپنے رویہ میں تبدیلی ضروری محسوس ہوئی۔

اس دوران عالمِ اسلام میں بھی مسلسل ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے جن سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہیجان اور اشتعال کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمان رہنماؤں کی ترغیب، تحریک اور جدوجہد کے نتیجے میں یہاں کے مسلمانوں میں ایک نیا جوش، ولولہ اور احساس پیدا ہوا اور ایک بڑے حلقے میں اکابر سیاستدان اس انداز پر غور کرنے لگے کہ مسلمانوں کے لیے دستوری تحفظات کا بندوبست ہندوؤں کی مدد سے کسی معاہدے کے ذریعے ہو جائے اور ان کے تحفظ کو اس دستورِ اساسی میں داخل کر دیا جائے جو ان کے خیالات کے مطابق برطانیہ کے تعاون سے کیا جانے والا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں یہ احساس بڑھتا رہا کہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کا معاہدہ مسلمانوں کے وقار اور ان کے مفادات کے مطابق ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے مقاصد میں حالات کی تبدیلی اور سیاسی تقاضوں کے لحاظ سے ترمیم کی گئی۔ یہ ایک انقلابی اقدام تھا جو پچھلی روایات اور حالات کے نتیجے میں اٹھایا گیا تھا اور مسلمانوں کی سیاست کا یہ ایک نیا مرحلہ تھا جس پر مسلمان برعظیم کی علمی سیاست میں پچھلی روایت کے برخلاف پہنچے تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ کے اس اجلاس میں کئی کانگریسی رہنما شریک ہوئے اور مسلم لیگ نے بھی اپنے مقاصد و مطالبات میں حکومتِ خود اختیاری کا اضافہ کر دیا۔ یوں مسلم لیگ نے سیاست میں ایک نیا رخ اختیار کیا اور تحریکِ آزادی میں باعزت اور باوقار طریقے سے آگے بڑھنا شروع کیا اور عالمی سیاست کے منظر میں انگریزوں کی مسلم دشمنی اور عزائم کے ظاہر ہونے کے بعد کانگریس سے اس امید پر تعاون کیا کہ دونوں مل کر مشترکہ دشمن کو شکست دیں۔

مسلم لیگ کے مقاصد میں یہ انقلابی تبدیلی اس نئے تعلیم یافتہ طبقے کی وجہ سے آئی تھی جو آئے دن اپنی تعداد اور اپنی قوت میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس انقلابی اجلاس میں محمد علی جناح بھی شریک تھے۔ اس وقت وہ کانگریس میں شامل تھے۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں لیگ میں شامل ہوئے۔ اور بہت جلد اس کے سب سے بڑے قائد بن گئے۔ انہوں نے لیگ اور کانگریس کو متحد کرنے میں لازمی عنصر کا کام کیا تھا۔ انہی کی کوشش سے ۱۹۱۶ء میں پہلی بار کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ایک وقت اور ایک مقام پر منعقد ہوئے۔ چند برسوں تک یہ اتحاد و

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اتفاق برقرار رہا۔ لیگ اور کانگریس کے قائدین میں اس مقام پر ایک معاہدہ ہوا جو "میثاقِ لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان برعظیم میں ایک باعزت اور پروقار زندگی گزارنے کے لیے معقول سمجھوتے کے خواہشمند تھے۔ وہ ایک طرف اپنی سیاسی خودمختاری ایک قوم کی حیثیت سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور دوسری طرف وہ اپنے کسی ایسے معاملے کو، جو ان کی تہذیب و تمدن اور اسلام کے مفاد سے متعلق ہو، اکثریتی نظام کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اس سے قطع نظر اس معاہدے سے مسلمانوں کو بعض دوررس سیاسی فوائد بھی حاصل ہوئے۔ اس کے تحت ہندوؤں نے پہلی اور آخری مرتبہ مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے حق کو تسلیم کیا۔ اس معاہدے سے یہ ظاہر ہوا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی جو مسلمانوں کی طرف سے نمائندگی یا معاہدہ کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ثابت ہوا کہ کانگریس تمام ہندوستان یا تمام اقوامِ ہند کی نمائندہ جماعت نہیں بلکہ اس کی حریف جماعت بھی موجود ہے جو ایک دوسری قوم کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس معاہدے کے ذریعے مسلمانوں کا نہ صرف علیحدہ قومی وجود ہی تسلیم ہوتا تھا بلکہ انہیں ہندوؤں کے ساتھ برابر کا درجہ بھی ملتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علماء کی مذہبی و سیاسی تحریکوں کا پسِ منظر

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی ان مجاہدین علماء کے جذبات کو ختم نہ کر سکی تھی جو شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کی فکری و سیاسی تحریک سے متاثر تھے۔ جنگِ آزادی میں سید احمد شہید کے پیروؤں نے نمایاں اور سرگرم حصہ لیا تھا۔ گو کہ شاہ عبدالعزیز کے بعد ان کے جانشین اور نواسے شاہ محمد اسحاق ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، مگر یہ تحریک ان کے شاگردوں کی وجہ سے جاری رہی۔ ان کے شاگردوں میں شاہ عبدالغنی مجددی، مفتی عنایت احمد، نواب قطب الدین اور مولانا احمد علی سہارنپوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان افراد نے مسلمانوں کی انتہائی پستی اور سیاسی زوال کے دور میں مسلمانوں کی مذہبی، علمی، تہذیبی اور معاشرتی اصلاح کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ شاہ عبدالغنی نے علمِ حدیث کی درس و تدریس، اور نشر و اشاعت کا کام کیا، مفتی عنایت احمد نے مذہبی اور اصلاحی ادب اردو زبان میں پیش کیا۔ مفتی صاحب اور ان کے رفقاء کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی ایک نیم سیاسی اور اصلاحی انجمن بنائی جس کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح اور ان کی بیداری تھا۔ یہ انجمن مسلمانانِ ہند کی سب سے پہلی باقاعدہ تنظیم تھی جس نے اجتماعی طور پر اصلاح کا کام شروع کیا۔ نواب قطب الدین نے بھی مذہبی اور اصلاحی ادب اردو زبان میں پیش کیا تاکہ عام مسلمان زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں۔ مولانا احمد علی سہارنپوری نے دہلی میں اپنا مطبع احمدی قائم کر کے مذہبی اور اصلاحی ادب کی عام نشر و اشاعت کی۔ اس طرح شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید کی تحریک سے وابستہ علماء نے مسلمانوں میں اصلاح اور بیداری کا کام کیا اور مذہبی اور اصلاحی ادب وافر مقدار میں پھیلایا۔ ان علماء کا ایک فیض عام یہ بھی تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کی بیداری اور ان کی ذہنی، فکری اور قومی تعمیر کے لیے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ خود مفتی عنایت احمد نے کانپور میں مدرسہ فیضِ عام قائم کیا، جس کا فیض آگے چل کر بالآخر ندوۃ العلماء کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شاہ عبدالغنی مجددی کے شاگردوں میں مولانا محمد قاسم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد مظہر نانوتوی ہیں، جو دارالعلوم دیوبند کے محرک ہیں۔ یہ ادارے بنیادی طور پر تعلیمی تھے اور اس وقت تشکیل دیئے گئے تھے جب سیاسی شکست اور تہذیبی انتشار کے نتیجے میں مسلمانوں میں دو گروہ پیدا ہو گئے تھے اور دونوں نے ایک حد تک پسپائی اور مراجعت کی حکمتِ عملی اختیار کی تھی۔ ان میں سے ایک نے تعلیمی اور تہذیبی میدان میں مقابلہ کو اولیت دی اور ذہنی اور علمی میدان میں مصالحت اور سمجھوتے کی روش اختیار کی، مگر فکری سطح پر کسی ربط اور سمجھوتے کو قبول نہ کیا۔ مقصد، مزاج، حکمتِ عملی اور قیادت کے فرق نے دونوں رجحانات کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ ان دونوں رجحانات کے فاصلے کو کم کرنے کی ایک کوشش "ندوۃ العلماء" کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی۔ قدیم نظامِ تعلیم اور جدید نظامِ تعلیم کے فرق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی دعوتِ مقابلہ کے نتیجے میں مولانا شبلی اور بعض دیگر علماء کے ذہن میں ایک ایسے ادارے کے قیام کا خیال پیدا ہوا جہاں ضرورتِ زمانہ کے مطابق قدیم اور جدید نصاب کی تدریس ہو سکے۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں ایک مجلس "ندوۃ العلماء" اور ایک سال بعد ایک "دارالعلماء" کی تشکیل کی گئی۔ اس کے قیام میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمود الحسن، شاہ محمد سلیمان پھلواروی، مولانا نثار اللہ کشمیری، مولانا محمد علی مونگیری اور مولانا عبدالحق حقانی کی دلچسپی شامل تھی۔ مولانا شبلی اور مولانا عبدالحق حقانی نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے۔ اس ادارے کا مقصد عربی مدارس کا فروغ، اشاعتِ اسلام، سماجی اصلاح، قوم کا مجموعی مفاد اور مختلف الخیال علماء کے باہمی اختلافات کو ختم کرنا قرار پایا۔ اس کی شاخیں لکھنؤ کے علاوہ مدراس اور شاہجہان پور میں قائم کی گئیں۔ اس وقت کے بعض نامور رہنما جیسے حکیم اجمل خاں، مولانا عبدالباری، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حبیب الرحمان خان شروانی اس سے متعلق رہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا ایک نمایاں مقصد یہ تھا کہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے فیض یافتہ علماء کی صحبت اور اثر اور مدرسہ کی باقاعدہ تعلیم سے جس قدر علماء تیار ہوں، وہ مساجد اور مدارس میں کام کرنے کی پوری استعداد رکھتے ہوں۔ وہ تدریسی کاموں سے فارغ ہو کر اساتذہ کی صحبت میں رہیں اور ان سے شاہ ولی اللہ کی حکمت اور سیاسی اصول سمجھیں۔ بہت جلد اس کی شاخیں سہارنپور اور مراد آباد میں قائم ہو گئیں۔ اس ادارے کا نمایاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کارنامہ علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کا تحفظ تھا۔ اس کی علمی تحریک اطرافِ ہند سے نکل کر افغانستان، ترکستان، حجاز اور افریقہ تک پہنچ گئی۔ یہاں سے فارغ التحصیل طلبار میں سے جن اکابر نے زیادہ شہرت حاصل کی ان میں مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبد الحق حقانی، مولانا سید انور شاہ کشمیری، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ان اداروں کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ انہوں نے علمار کو اجتماعی زندگی میں قیادت کی دعوت دی اور ایسے طلبار کی ایک نسل پیدا کر دی جنہوں نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور دیگر اسلامی اور قومی تحریکوں میں شمولیت اختیار کی۔ انگریزوں کے خلاف بعض انقلابی اور ہمہ گیر تحریکیں انہی کے دم قدم سے شروع ہوئیں اور انہی کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونِ ہند دیگر اسلامی ممالک میں بھی سرگرم ہوئیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ ردِ عیسائیت

مسلمانوں میں تحریکِ ردِ عیسائیت، عیسائیت کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے خلاف ایک نہایت اہم تحریک تھی۔ انگریزی حکومت کے معاشی اقتدار کے نتیجے میں پست اور تباہ حال ہونے کے باوجود بھی مسلمانوں کو اپنی مذہبی اور اخلاقی قدریں عزیز تھیں جن کو وہ محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن برطانوی حکمتِ عملی نے آہستہ آہستہ ان پر بھی ضرب لگائی۔ برِعظیم میں عیسائیت کی تبلیغ سولھویں صدی کے آغاز سے شروع ہو چکی تھی اور عیسائی مشنریاں بڑے جارحانہ انداز میں تبلیغ کر رہی تھیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں کلیسا قائم ہو رہے تھے اور مختلف ذرائع سے عیسائیت کی برتری ثابت کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ مختلف تبلیغی مشن اپنے اپنے تعلیمی ادارے قائم کر رہے تھے اور مفلس ہندوستانی مختلف قسم کی رعایتوں کے لالچ میں عیسائیت قبول کر رہے تھے۔ انگریز عہدیداروں نے فوجیوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی حوصلہ افزائی کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم مسیح کے سپاہی بن کر مذہبی جہاد میں سرگرم رہتے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر برِعظیم کے اس وسیع علاقے کو مسیح کے لیے فتح نہ کیا گیا تو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کا سارا مقصد ختم ہو جائے گا۔ عیسائی مبلغین کے طریقِ کار سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی مدد ان کو حاصل تھی۔ سرکاری مدرسوں میں انجیل کی تعلیم لازمی تھی۔ بعض قوانین صرف اس لیے بنائے گئے تھے کہ عیسائیت قبول کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ عیسائی مبلغ بازاروں، شفاخانوں، جیل خانوں میں جس جگہ موقع ملتا تبلیغ کرنے لگتے۔ اخباروں اور رسالوں میں، جو بڑی حد تک حکومت کے اختیار میں تھے، اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر حملے کرنے کی روایت پڑ گئی تھی۔ مسلمان عیسائیوں کی ان کوششوں سے خوش نہیں تھے۔ ان کی جانب سے ابتدا ہی سے جا بجا کسی نہ کسی شکل میں ردِ عمل کا اظہار ہوتا رہا۔

مسلمانوں میں تحریکِ ردِ عیسائیت گو کسی مرکزی تنظیم کے تحت نہیں تھی۔ مگر اس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمہ گیری اور مؤثر جدوجہد مثالی ہے۔ انہوں نے علمی و فکری پہلوؤں سے عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں اور ان کے رد پر اپنے آپ کو مجبور پایا۔ رد عیسائیت کی جدوجہد میں وہ تحریری اور تقریری مناظرے بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو علمائے اسلام اور عیسائی مبلغوں کے درمیان ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے عیسائیوں سے باضابطہ مناظروں کی ابتدا کی اور ان کی پیروی میں بیشتر علماء سرگرم ہوئے۔ مولانا محمد ہادی، مولانا آلِ حسن، مولانا فیض احمد بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خان کی کوششیں امتیازی ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں تاریخی اہمیت کا کام مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے کیا۔ یہ وہ علماء تھے جنہوں نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء تک عیسائیت کے اثرات کو مسلمانوں میں پھیلنے سے حتی المقدور روکے رکھا۔ ان کی یہ کوششیں ایک حد تک کامیاب رہیں۔ کئی عیسائی مسلمان ہوئے اور متعدد علماء رد عیسائیت کی طرف متوجہ ہوئے اور عیسائی مشنریوں سے تحریری و تقریری مناظروں کی ایک عام فضا پیدا ہوگئی۔ کئی اخبارات بھی اس تحریک کو عام کر رہے تھے۔ "سراج الاخبار" اور "قطب الاخبار" رد عیسائیت میں مشہور تھے۔ "شملہ اخبار" اور "نورِ علیٰ نور" بھی رد عیسائیت کے لیے مخصوص تھے۔ "دہلی اردو اخبار" انگریزوں اور عیسائیت کے خلاف نفرت کے جذبے کو بڑی ہوشیاری اور دانشمندی کے ساتھ ابھارتا تھا اور انگریزوں کے مکر و فریب کو بے نقاب کرتا تھا۔

چونکہ جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں کے لیے بہت کم گنجائش رہ گئی تھی اس لئے مسلمانوں کی ساری توجہ ایسے مناظروں پر مرکوز ہوگئی۔ اس وقت مسلمانوں کو جو خطرات درپیش تھے ان میں سے ایک یقیناً مشنریوں کی طرف سے تھا جو اس توقع میں تھے کہ سیاسی زوال کے ساتھ مسلمانوں کا مذہبی زوال بھی شروع ہو جائے گا اور وہ حکومت کے ساتھ عیسائیت کو بھی قبول کر لیں گے۔ مسلمان علماء اب زیادہ مستعدی کے ساتھ عیسائیت کے رد میں مصروف تھے۔ اس سلسلے میں اس دور میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے علاوہ سید احمد خان کی کوششیں بہت مؤثر ہیں۔ ان کی یہ کوششیں "رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" میں نظر آتی ہیں جس میں وہ عیسائی مشنریوں کی کوششوں کو ہندوستانیوں کی بغاوت کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے متعدد مواقع پر مشنری اسکولوں اور کالجوں کی مخالفت کی۔ تعلیمی کمیشن کے سامنے اور کلکٹر مراد آباد کے روبرو ہر جگہ انہوں نے مشنری اسکولوں اور مشنری طریقوں کی مخالفت بے باکی سے کی۔ ان کی تحریر کردہ انجیل کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تفسیر تبیین الکلام" کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اس طرح عیسائیت کے اصل ماخذ مسلمان علماء کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ علماء ماخوذ معلومات کے بجائے مستند عیسائی علماء کی تحریروں کے حوالے سے زیادہ بہتر دلائل دے سکیں۔ سید احمد خاں کی ایک اور اہم کوشش "خطباتِ احمدیہ" کی تصنیف تھی جس میں انہوں نے عیسائیوں کے ان اعتراضات کا تحقیقی جواب دیا تھا جو وہ پیغمبر اسلامؐ پر لگاتے تھے۔ انہوں نے اسلام کی حمایت میں بعض انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کروا کر اسی سلسلے میں شائع کیا۔ ان کے رسالے "تہذیب الاخلاق" میں ایسے مضامین بھی شائع ہوتے تھے جن میں عیسائیت اور عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کا رد کیا جاتا تھا۔ ان کے دوستوں میں حالی اور مولوی چراغ علی نے رد عیسائیت میں اہم کتابیں تصنیف کیں۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنی ناولوں کے ذریعے سے رد عیسائیت کا کام لیا۔ علمائے دیوبند میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد سعید اور مفتی کفایت اللہ وغیرہ نے مناظرے کیے اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے علاوہ متعدد مختلف الخیال علماء بھی اس ضمن میں سرگرم تھے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا اشرف الحق، مولانا محمد عثمان فارقلیط اس سلسلے میں بہت ممتاز ہوئے۔ مولانا عثمان فارقلیط نے اس مقصد کے لیے ایک "انجمن اصلاح المسلمین" بھی بنائی جس کے تحت باضابطہ مناظرے ہوتے تھے۔ اس تحریک کے تحت ایک اچھا خاصا ادب بھی پیدا ہوگیا۔ ردِ عیسائیت کا کام صرف مناظروں اور تصانیف ہی میں نہیں بلکہ تعلیمی اداروں، مسجدوں، انجمنوں اور مدرسوں میں بھی جاری تھا۔ اداروں میں خاص طور پر دارالعلوم دیوبند، "انجمن حمایت اسلام" اور دیگر انجمنیں سرگرم ہوئیں۔ متعدد اخبارات و رسائل بھی اس جدوجہد میں شریک ہوئے۔ اس تحریک کا نمایاں اور واضح نتیجہ یہ نکلا کہ عوام میں عیسائیت اور اس اعتبار سے انگریزوں اور حکومتِ برطانیہ کے خلاف شدید جذبات پیدا ہوگئے۔ یہ صورتِ حال انگریزوں کے خلاف کئی قومی اور سیاسی تحریکوں کو شروع کرنے کا سبب بنی۔

محکم دلائل سے مزین-متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک ریشمی رومال

پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کے شامل ہو جانے سے برعظیم کے مسلمانوں میں خاصہ اضطراب پھیل گیا تھا۔ عالمِ اسلام سے نسبت اور تعلق اور ہمدردیوں کے جذبات کو اس وقت مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان اور اقبال نے اپنے ہیجانی مضامین، زورِ خطابت، اور شاعری کے لطیف و پر اثر انداز میں متحرک کر دیا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہونے تک ترکی کے قبضے سے اس کے بہت سے علاقے نکل چکے تھے۔ برعظیم کے مسلمان مغربی طاقتوں کی اس تباہی کو، جو انہوں نے سارے عالمِ اسلام میں مچائی تھی، بچشمِ خود دیکھ رہے تھے۔ اب عالمِ اسلام کی سیاسی قوت کا یہ آخری قلعہ بھی اپنے دشمنوں کے نرغے میں تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے اس زوال نے برعظیم کے مسلمانوں میں شدید ہیجان پیدا کر دیا۔ اس صورتِ حال میں یہ نظریہ تقویت حاصل کر رہا تھا کہ کوئی مسلم مملکت کسی یورپی طاقت کا مقابلہ تنہا نہیں کر سکتی۔ اس لیے سب اسلامی ممالک کو متحد ہو کر تحفظ اور ترقی کی مشترکہ کوششیں کرنی چاہئیں۔ اس نظریے کو عملی صورت دینے میں مولانا محمود الحسن اور ان سے فیض یافتہ افراد بہت آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے عملی جد و جہد کی، اور اپنی ایک خفیہ تحریک کے ذریعے سلطان عبدالحمید سے روابط پیدا کرنے کی کوشش کی جو اس وقت منصبِ خلافت پر فائز تھے اور چاہتے تھے کہ مغربی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی حیثیت کو استعمال کریں۔

مولانا محمود الحسن نے اپنے ایک شاگرد عبیداللہ سندھی کو کابل روانہ کیا تاکہ وہ افغانستان اور آزاد قبائل سے ترکوں کے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں اور افغانستان کو ترکی اور جرمنی کے اتحاد میں شامل کرنے کے لیے آمادہ کریں۔ افغانستان میں پہلے ہی ترکی اور جرمنی کے انقلابی وفود اس مقصد کے لیے کام کر رہے تھے۔ عبیداللہ سندھی ۱۹۱۵ء میں کابل پہنچے۔ وہاں ایک عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تاکہ وہ امیر حبیب اللہ خان کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دے۔ لیکن انگریزوں کی ایک چال سے یہ منصوبہ ناکام رہا۔ پھر اس عارضی حکومت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی طرف سے روس، جاپان اور ترکی وفود بھیجے گئے جن کی تجویز اور ترتیب میں مولانا سندھی شریک تھے۔

افغانستان میں انہوں نے ایک جماعت بھی تشکیل دی جس کا نام "جنود اللہ" رکھا۔ لیکن اس دوران افغانستان میں انقلاب آگیا۔ چنانچہ مولانا سندھی اپنے پیغامات ریشمی کپڑوں پر تحریر کر کے مولانا محمود الحسن کے پاس بھیجتے تھے۔ ان کے دیگر رفقاء بھی یہی طریقہ اختیار کرتے۔ ان میں سے بعض پیغامات غلط ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ چنانچہ یہ تحریک منظرِ عام پر آگئی۔

مولانا محمود الحسن اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں ایک لائحہ عمل تیار کر چکے تھے اور انہوں نے اس پر عمل کرنے کی کوشش اس وقت شروع کر دی تھی جب برعظیم میں سیاسی سرگرمیاں محض برائے نام تھیں۔ وہ بالخصوص ہندوستان اور ترکی کے واقعات کو اہمیت دیتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہونے اور اس میں ترکی کے شامل ہونے پر جو واقعات رونما ہو رہے تھے، انہوں نے مولانا محمود الحسن کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی کوششوں میں کچھ اور آگے بڑھیں۔ ان کی ابتدائی سرگرمیاں انگریزوں کی نظر میں تھیں۔ چنانچہ وہ ہندوستان سے حجاز روانہ ہوئے۔ اس وقت ترکوں کی طرف سے غالب پاشا حجاز کے، جو ترکی کا ماتحت علاقہ تھا، گورنر تھے۔ انہوں نے غالب پاشا سے ملاقاتیں کیں اور مسلمانانِ برعظیم کے نام پیغام حاصل کیا۔ اسی اثناء میں ان کی ملاقات ترکی کے وزیر دفاع انور پاشا سے بھی ہوئی۔ انور پاشا نے ہندوستان کی کامل آزادی کی جدوجہد میں ترکی کی طرف سے مدد کا یقین دلایا۔ انور پاشا نے بھی مسلمانانِ ہند کے نام پیغام دیا۔ ان تحریروں میں برطانیہ کے خلاف مسلمانانِ ہند کے جہاد میں ترکی کی جانب سے شرکت کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ ان میں کہا گیا تھا کہ:

"ایشیا یورپ اور افریقہ کے مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر خدا کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ خدائے قیوم و قادر کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین دشمنانِ اسلام پر غالب آگئے ہیں۔ اس لئے مسلمانو، اس عیسائی حکومت پر حملہ کر دو، جس کی قید میں تم پڑے ہو۔ اپنی تمام کوششوں کو ایک پختہ عزم کے ساتھ دشمن کو ختم کرنے کے لیے وقف کر دو اور ان سے نفرت اور دشمنی کو ظاہر کر دو۔"

یہ تحریر "غالب نامہ" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اسے برعظیم بھیجا گیا اور ہندوستان اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرحدی قبائل میں خفیہ تقسیم کیا گیا۔ لیکن انگریزوں کے محتاط رہنے کی وجہ سے اس اعلانِ جہاد کی صرف کچھ نقلیں تقسیم ہو سکیں۔

مولانا محمود الحسن اور ان کے رفقاء آپس میں پیغام رسانی کے لیے چونکہ ریشمی کپڑے استعمال کرتے تھے، جن پر پیغام تحریر کیا جاتا تھا، اس لیے اس تحریک کو "تحریک ریشمی رومال" کہا جاتا ہے۔ تحریک کے خفیہ رہنے کے باوجود اس کے دو بنیادی مقاصد منظرِ عام پر آئے۔ ایک تو ہندوستان کے لیے کامل آزادی کی جدوجہد اور اس میں حکومتِ ترکی سے مدد لینا، اور دوسرے افغانستان کو انگریزوں کے خلاف ترکی اور جرمنی کے اتحاد میں شامل ہونے کے لیے آمادہ کرنا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک ہجرت اور علماء کی دیگر تحریکیں

پہلی جنگِ عظیم جاری تھی کہ اس دوران حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان میں سر سڈنی رولیٹ کا بنایا ہوا ایک قانون نافذ کر دیا۔ یہ قانون اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت جابرانہ تھا۔ ہندوستانیوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جگہ جگہ احتجاجی قراردادیں منظور کی گئیں اور حکومت سے احتجاج کیا گیا لیکن کوئی دلیل اور کوئی احتجاج کام نہ آیا۔ چنانچہ تمام ہندوستان میں یومِ احتجاج منایا گیا۔ ہڑتالیں ہوئیں، جلوس نکلے، جلسے ہوئے، ان میں پرجوش تقریریں کی گئیں اور اس طرح تمام ملک میں شورش پیدا ہو گئی۔ مسلمان تو اس صورتِ حال میں پہلے ہی سے افسردہ تھے۔ تقسیم بنگال کی منسوخی کے فیصلے کا اب تک ان پر اثر تھا۔ کافی عرصہ سے مسلم یونیورسٹی کے قیام کی جدوجہد کا نتیجہ بھی ابھی تک محض وعدے کی حد تک تھا۔ اسی عرصہ میں مسجد کانپور کے سانحے سے بھی وہ حد درجہ مشتعل ہوئے تھے اور حکومت کی ناانصافی پر مبنی ان حرکتوں نے ان میں انگریزوں سے نفرت پیدا کر دی تھی۔ پھر پہلی جنگِ عظیم کے دوران انہیں ملک کے علاوہ بیرونِ ملک کے واقعات بھی متاثر کر رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ برطانیہ ترکی کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کر لے۔ لیکن بعض یقین دہانیوں کے باوجود انگریزوں نے ترکی کے علاقے موصل پر پیش قدمی کر دی اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ اس وجہ سے برعظیم کے مسلمانوں میں اضطراب پھیل گیا۔ انہوں نے جگہ جگہ جلسے کر کے مختلف تجاویز و مطالبات پیش کیے۔ ولایتی مصنوعات کا استعمال اور سرکاری اداروں سے ترک تعاون کیا اور اس سلسلے میں ایک بہت مؤثر اور ہمہ گیر تحریک چلائی۔ اسی دوران مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب مخالف طاقت کے خلاف جارحانہ اقدامات کی طاقت نہ ہو تو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں کو ملک سے ہجرت کر جانا چاہیے۔ یہ تجویز مذہبی رنگ لیے ہوئے تھی۔ چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے ملک سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ اور چونکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افغانستان سب سے قریب تھا اس لیے ان مہاجرین نے وہاں کا رخ کیا۔

یہ تحریک بہ ظاہر ایک جذباتی فیصلے کا نتیجہ تھی۔ لیکن دراصل یہ ہندوستان کے متحدہ قومیت کے تصور پر ایک ضرب کاری تھی۔ اس میں کسی غیر قوم کا دخل بالکل نہ تھا۔ اس وقت تک افغانستان انگریزوں کے ساتھ جنگیں لڑ چکا تھا۔ آخری جنگ کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی۔ افغانستان کو معلوم تھا کہ وہ انگریزوں سے محض اپنی طاقت کے بل بوتے پر جنگ نہیں جیت سکتا۔ ہندوستان سے جو علماء افغانستان گئے تھے وہ وہاں کے حکمران کو یہ یقین دلا رہے تھے کہ جنگ شروع ہوتے ہی ہندوستان کے مسلمان افغانستان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس وقت کے ہندوستان میں رولیٹ ایکٹ کے خلاف احتجاجی مظاہرے، حکومت سے ترک تعاون کی عام تحریک اور ملک بھر میں حکومت کے خلاف ہنگامے اس خیال کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ چنانچہ افغانستان نے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کو افغانستان میں داخلے کی عام اجازت دے دی۔ مہاجرین کی اکثریت بھی اس خیال سے پر امید تھی کہ وہ افغانستان سے تعاون کر کے انگریزوں کا مقابلہ کر سکیں گے چنانچہ ہندوستان سے ہجرت کی ایک ولولہ انگیز فضا پیدا ہو گئی۔

بعض مہاجرین جو زیادہ جوشیلے تھے، اس کوشش میں تھے کہ افغانستان سے بھی آگے نکل کر ترکی پہنچیں اور خلافتِ عثمانیہ کے تحفظ کے لیے جہاد کریں۔ لیکن زیادہ تعداد میں وہ ترکی نہ جا سکے اور بہت سے ایران سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس اعتبار سے یہ تحریک بھی بالآخر بیرونِ ملک کے مسلمانوں سے تعاون و ہمدردی کے جذبات پر مبنی تھی اور اس کا ایک فوری مقصد انگریزوں کے خلاف افغانستان کی جنگ میں شریک ہونا تھا۔ لیکن چونکہ یہ تحریک کسی مرکزی فکر اور تنظیم کے تحت نہیں تھی اور آئے دن کے بین الاقوامی انقلابات بھی صورتِ حال کو تبدیل کر رہے تھے اس لیے یہ خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی اور ایک مرحلے پر ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے مسلمانوں کے عام جذبات کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے اور بیرونِ ملک کے مسلمانوں سے وابستہ کرنے میں ضرور حصہ لیا۔

ایک اور کوشش جس سے اس وقت کے مسلمانوں کی بیرونِ ملک سیاست سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے "انجمن خدام کعبہ" کا قیام ہے۔ اس کے قیام میں مولانا شوکت علی اور مولانا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عبدالباری فرنگی محلی پیش پیش رہے ہیں۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں جماعتی بنیادوں پر کام کرنے کا سلیقہ پیدا ہو، ان میں قومی اور مذہبی شعور عام ہو: اور اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اسلام کے مقاماتِ مقدسہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں جانے سے بچائے اور اس کام کے لیے وقتِ ضرورت مسلمانانِ عالم کو متحد کرے۔

یہ کوششیں عام مسلمانوں میں قومی اور مذہبی شعور پیدا کر رہی تھیں اور ان سے مسلمان، دشمنانِ اسلام سے آزادی حاصل کرنے کے طریق سیکھ رہے تھے۔ لیکن بعد میں تحریکِ خلافت نے ان کے جذبات کو اسلام دشمنوں کے خلاف بہت زیادہ مشتعل کر دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ خلافت

تحریکِ خلافت نے تحریکِ آزادی اور مسلمانوں کی سیاست میں ایک شدید جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف غم و غصہ پہلے ہی سے موجود تھا۔ اب جب انہوں نے دیکھا کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد معاہدۂ صلح کے باوجود اتحادیوں نے ترکی کو تقسیم کر لیا اور انگریزوں کے اشارے پر یونان نے بھی سمرنا پر حملہ کر دیا ہے اور ترکوں کا قتلِ عام کیا جا رہا ہے تو انہیں یقین ہو گیا کہ برطانیہ برعظیم میں اپنی حکومت کو مزید مستحکم کرنے کے لیے انتقامی جذبے کے تحت دیگر مسلم ممالک کی آزادی کو ختم کر رہا ہے تاکہ کوئی اس کے خلاف آواز نہ اٹھا سکے۔ مسلمانوں نے اس وقت محسوس کیا کہ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو دیگر مسلم ممالک میں بھی آزادی کا جذبہ اور ولولہ پیدا ہو جائے گا اور وہ بھی ایک مرحلے پر آزاد ہو سکیں گے۔ یہ ایک بنیادی مقصد تھا جس نے انہیں تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے پر آمادہ کیا۔

اب تک تحریک ریشمی رومال" تحریکِ ہجرت" اور "انجمن خدام کعبہ" کے توسط سے عام علماء سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ اب سلطنتِ عثمانیہ کے زوال نے ان میں ایک حد تک ہیجان پیدا کر دیا اور عام مسلمانوں کے جذبات کو اس قدر مشتعل کیا کہ اس کی کوئی مثال برعظیم کی کسی اور تحریک میں نہیں ملتی۔ وہ سارے جذبات جو ایک عرصے سے ضبط کی حدود میں تھے، ایک ایسی تحریک کی شکل میں پھوٹ نکلے جس نے دوسری تمام تحریکوں سے بڑھ کر برعظیم میں حکومتِ برطانیہ کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ مسلمانوں نے اس تحریک میں نتائج سے بے نیازی اور مصائب و آلام سے انتہائی بے پروائی کا ثبوت دیا۔

اس تحریک کو باقاعدہ چلانے کے لیے ایک "مجلسِ خلافت" کی بنیاد رکھی گئی۔ اس میں علی برادران، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حسرت موہانی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ظفر علی خان وغیرہ زیادہ سرگرم رہے۔ یہ برعظیم کے مسلمانوں کا نمائندہ طبقہ تھا جو سمجھدار بھی تھا اور اپنے شدید جوش اور جذبے کے طفیل زورِ خطابت اور زورِ قلم سے کام لینا بھی خوب جانتا تھا۔ "ندوہ" اور "دیوبند" سے تعلق رکھنے والے اکثر علماء بھی اس میں نمایاں رہے۔ مسلم لیگ اور علماء کی دیگر جماعتیں بھی اس میں فعال تھیں۔ مسلمان قائدین نے پرزور خطابت اور ولولہ انگیز تحریروں کے ذریعے برعظیم کے عام مسلمانوں کو تحریکِ خلافت کے مقصد سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ اور ان طریقوں سے ان میں عمل و قربانی کی ایک نئی روح ڈال دی۔ اس تحریک کا نمایاں اثر برعظیم کی آئندہ سیاسی زندگی پر پڑا۔ چنانچہ جب حکومت سے عدمِ تعاون کا منصوبہ تیار کیا گیا اور اس کی باقاعدہ تحریک شروع ہوئی تو مسلمانوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس منصوبے میں عوام کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ حکومت کے عطا کردہ تمام خطابات اور اعزازی عہدے واپس کر دیں اور تمام سرکاری و نیم سرکاری تقریبات میں شرکت سے انکار کر دیں۔ اس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ جن تعلیمی اداروں کو خود حکومت چلاتی ہے یا جن کو مدد دیتی ہے ان میں سے طلبہ کو بتدریج اٹھا لیا جائے اور برطانوی عدالتوں، اسمبلیوں اور ان کے انتخابات اور غیر ملکی مال کا استعمال ترک کیا جائے۔ یہ منصوبہ گاندھی کا تجویز کردہ تھا لیکن اسے مسلم علماء کے ایک فتوے میں بھی شامل کر لیا گیا جسے حکومت نے ضبط کر لیا۔ سرکاری مدارس سے طلبہ کی علیحدگی نے طلبہ کی ایک کثیر تعداد کو تحریک میں رضاکارانہ حیثیت سے کام کرنے کے لیے آزاد کر دیا تھا۔ اس سے طلبہ کے سیاست میں حصہ لینے کی روایت عام ہوئی۔

تحریکِ خلافت کے ذریعے مسلمانوں نے اپنے جوش اور قربانی کے جذبے سے ثابت کر دیا کہ باوجودیکہ وہ آبادی میں کم ہیں اور معاشی و سیاسی حیثیت سے پژمردہ بنا دیے گئے ہیں، لیکن انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ انہوں نے جان و مال کی زبردست قربانی دی۔ مسئلہ خلافت اور ترکی کے تعلق سے اپنے جذبات انہوں نے متعدد جلسوں اور احتجاجی تقریبات منعقد کر کے بیان کیے۔ کچھ وفود انگلستان بھی بھیجے گئے تاکہ وہ انگریزوں کی حمایت حاصل کر سکیں اور انہیں مسلمانوں کے جذبات بتا سکیں۔ لیکن جب تحریک شدت پر تھی اور انگریزوں کے قدم متزلزل ہو رہے تھے، گاندھی نے ایک معمولی سے واقعے کو بہانہ بنا کر تحریک عدم تعاون ختم کرا دی۔ اس اقدام سے مسلمانوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ مسلمان اس فیصلے پر مطمئن نہ رہے۔ انہوں نے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ان کی قربانیاں ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ تھیں۔
تحریکِ خلافت کو بھی بڑے مد و جزر دیکھنے پڑے، چنانچہ وہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکی۔
پھر پہلی جنگِ عظیم کے بعد ترکی کی وہ حیثیت نہ رہی کہ خود خلافت کے عالمگیر منصب کا بار اٹھا سکے۔
چنانچہ جب مصطفےٰ کمال برسرِ اقتدار آئے تو سلطنت منسوخ کر دی گئی۔ اور اسی طرح ۱۹۲۴ء
میں خلافت کا منصب بھی ختم کر دیا گیا۔ اپنی ناکامی کے باوجود اس تحریک نے برعظیم کے مسلمانوں
اور ان کی تحریکِ آزادی کو بہت کچھ دیا۔ اس تحریک کے دوران مسلمانوں کے جوش و خروش
نے برعظیم کی سیاسی جدوجہد میں ایک نئی زندگی دوڑا دی۔ یہاں تک کہ لفظ "خلافت" بغاوت
کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کم پڑھے لکھے عوام یہ سمجھتے تھے کہ "خلافت" لفظ "خلاف" سے
نکلا ہے۔ چنانچہ اس کے معنی وہ حکومت کی مخالفت لیتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ خلافت کے اثرات۔ ہندو مسلم سیاست پر

تحریکِ خلافت کا انجام یہ ہوا کہ برعظیم میں انگریزوں سے بیزاری، ان سے اقتصادی لین دین کا خاتمہ اور سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی درسگاہوں سے علیحدگی عام ہو گئی۔ اس تحریک میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ چنانچہ حسبِ معمول وہی حکومت کے مظالم و تشدد کا شکار ہوئے اور قید کیے گئے۔ ملابار میں مسلمان موپلوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف بغاوت کی لیکن نہایت بیدردی سے دبا دیے گئے۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی جدوجہد آزادی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اپنی ناکامی کے باوجود اس تحریک نے برعظیم کے مسلمانوں اور ان کی قومی زندگی میں ایک ولولہ انگیز اور تازہ دم لہر دوڑا دی۔ اس سے برعظیم کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اخوت مضبوط ہوا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے وجود کو عالمِ اسلام کا ایک جزو سمجھنے لگے۔ ان میں تحریکِ اتحادِ اسلامی اور عالمِ اسلام کے اتحاد کے جذبات نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ اس تحریک میں ان کا جوش و خروش فی الحقیقت اسلامی قومیت کے جذبات کا بھرپور اظہار تھا۔ اس تحریک کے طفیل میں برعظیم کے مسلمانوں نے خود پر اعتماد کرنا سیکھا اور ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اپنی جدوجہد اب ان مقاصد کے لیے کی جائے جن پر فیصلے کا اختیار خود ان کو حاصل ہو۔ اور اب انہوں نے اس خیال کو ترک کر دیا کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں یا حکومت کے بھروسے ہی پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے وہ ایک سیاسی اقلیت تھے لیکن مقصد کے اعتبار سے ہندوستان میں ایک علیحدہ قوم تھے۔ فطری طور پر ان کو آزادی کی جدوجہد میں اپنا مخصوص موقف مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تحریکِ خلافت سے ہندوؤں کو بھی بہت فائدہ پہنچا۔ دراصل اس تحریک کی مقبولیت نے ہی "انڈین نیشنل کانگریس" کو مقبول اور طاقتور بنایا۔ اس کی حیثیت میں اس تحریک کی حمایت کی وجہ سے زبردست اضافہ ہوا۔ عام مسلمان تحریک کی ناکامی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور مجلسِ خلافت کی خاموشی کے بعد کچھ عرصے کے لیے ہی سہی، کانگریس میں جانے لگے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد کانگریس میں شامل ہوئی تو اس کا پلنہ انگریزوں کو دبانے کے لیے اور بھی بھاری ہوگیا۔ کانگریسی رہنما اب کانگریس کے ہندوستان کے تمام لوگوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا پروپیگنڈہ کرنے لگے۔

تحریکِ خلافت کے بعد مسلمانوں کی قیادت مسلم لیگ کو انفرادی طور پر یا دوسری جماعتوں کے ساتھ تعاون سے حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ کا یہ دور پرجوش جدوجہد کا ابتدائی دور ہے۔ اب وہ ان مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی تھی جو تحریکِ خلافت کے زیرِ اثر عوامی تحریکوں کو چلانے کے طریقے اور اصول سیکھ چکے تھے۔ اب ان میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی اور وہ ایک ولولہ انگیز اور ہمہ گیر تحریک میں شریک رہ کر اب سیاست کے کھلے میدان میں داخل ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ تحریک کے دوران انہوں نے جو قربانیاں دی تھیں وہ ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ان ہی قربانیوں نے انہیں بڑے پیمانے پر عوامی تحریک کو منظم کرنے کے اصول سکھائے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ ان کی خود اعتمادی ختم ہو چکی تھی، اسے بحال کیا اور ان میں قومی و ملی شعور بیدار کر دیا۔ تحریک خلافت کے بعد مسلم سیاستدان انگریزوں اور ہندوؤں، دونوں کے مقابل ایک تیسرے فریق کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اب ان کی جدوجہد کا رخ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی طرف بھی پھر گیا اور وہ کہیں زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ انگریزوں کے مقابل سینہ سپر ہوئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ "میثاقِ لکھنؤ" کے بعد ہندو مسلم اتحاد کی جو عارضی فضا پیدا ہوئی تھی وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ

مسلمانوں کا یہ خیال ایک عرصے تک رہا کہ ہندوستان کی آزادی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے "میثاقِ لکھنؤ" پر بڑے خلوص اور بے لوثی کے ساتھ عمل کیا اور سیاسی مفاہمت کی ایک مثال قائم کی۔ لیکن جب اس پر عمل کرنے کا وقت آیا تو اس وقت ہندو سیاست کے منظر پر مسٹر گاندھی کا عروج تھا۔ گاندھی کو مسلمانوں کے لیے مسلم لیگ کی الگ تنظیم کسی طور پسند نہ تھی۔ وہ "میثاق لکھنؤ" سے ناخوش تھے، کیونکہ اس کے ذریعے نہ صرف مسلمانوں کا علیحدہ قومی وجود ہی تسلیم ہوتا تھا بلکہ انہیں ہندوؤں کے ساتھ برابر کا درجہ بھی ملتا تھا۔ اس کے برخلاف گاندھی اور دوسرے ہندو رہنما، اپنی خیالی دنیا میں "رام راج" یا خالص ہندو راج کا خواب دیکھ رہے تھے۔ گاندھی نے کانگریس پر اپنا قبضہ جماتے ہی اس قسم کی کوششیں شروع کر دیں کہ وہ "میثاقِ لکھنؤ" کو بھی ختم کر دیں اور مسلم لیگ کو بھی بے اثر کر دیں۔ اور پھر اس مقصد کی تکمیل کا آلۂ کار انہوں نے تحریکِ خلافت کو بنایا۔

تحریکِ خلافت کو شروع کرتے ہوئے مسلمانوں کے پیشِ نظر دو مسائل بڑے اہم تھے۔ ایک یہ ــــ کہ آخر ملک کی اکثریت، ہندوؤں کا تعاون کس طرح حاصل کیا جائے؟ اور دوسرے یہ ــــ کہ تحریک کی قیادت کون کرے؟ اس موقع پر ایک پختہ و آزمودہ کار رہنما کی ضرورت تھی۔ مولانا ابوالکلام سیاست میں ابھی ناپختہ کاری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور مولانا محمد علی سے بہ مشکل یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ہنگامی سیاست کے دوران عوام کو قابو میں رکھ سکیں گے۔ خلافت کا معاملہ اگرچہ خالصۃً مسلمانوں سے متعلق تھا، تاہم یہ گاندھی کی نگرانی اور سربراہی میں آگیا۔ ہندوؤں میں گاندھی کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جو اپنے آپ کو بظاہر مسلمانوں کا ہمدرد ثابت کرتا رہا ہو۔ چنانچہ نظرِ انتخاب گاندھی پر پڑی۔ ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے مسلمان ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں خلافت جیسا معاملہ دینے پر آمادہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو گئے تھے، جو کٹر اور قدامت پرست ہندو تھا۔

گاندھی نے خلافت کے معاملے پر ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اور اس کی وجہ یہی تھی کہ گاندھی نے اپنی پوری صلاحیتوں سے کام نہیں لیا۔ خلافت کے تعلق سے ان کی تحریروں اور تقریروں میں وہ جوش و خروش نہیں تھا جو اس سے قبل ہندو سیاست کے میدان میں ظاہر ہوتا رہا۔ ان کا علانیہ مطمح نظر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو حکومت سے لڑا کر خود اپنی وفاداریوں کے صلے میں بہتر فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ اس کے کیا معنی کہ خلافت کے جلسوں میں تو وہ حکومت سے عدم تعاون کی قرارداد منظور کرائیں اور دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں ایسی قرارداد منظور کرائیں جس میں انگریزوں سے مکمل تعاون کرنے پر زور دیا جائے۔

اس تحریک میں مسلمانانِ ہند کی ذہنی نشو و نما کا مرکز علی گڑھ کالج بھی کسی دوسرے ادارے سے پیچھے نہ رہا۔ اس کے سینکڑوں طالب علموں نے احتجاجاً تعلیم ترک کر دی۔ اس کے برعکس بنارس ہندو یونیورسٹی تمام ہنگاموں سے الگ رہی۔ وہاں کے طالبعلموں اور اساتذہ سے گاندھی نے کوئی تقاضہ نہ کیا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی کے لیے انگریزوں کا اخراج ایک ضمنی اور ثانوی مقصد تھا۔ ان کا اصل مقصد بلا شرکت غیرے ہندو راج قائم کرنا تھا۔ درحقیقت یہ مقصد اب ہندو قوم کی فطرت میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ سینکڑوں سال مسلمانوں کی حکومت کے زیرِ اثر اور تابع رہے۔ انہوں نے دل سے کبھی مسلم اقتدار کو تسلیم نہ کیا۔ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ ایک ساتھی اور حصے دار کا سا برتاؤ کیا تھا۔ اب مسلمانوں کو حکومت سے لڑا کر ہندوؤں کو اپنا مقصد حاصل ہوتا ہوا نظر آیا تو انہوں نے مسلمانوں کے الگ قومی اور سیاسی وجود سے انکار کر دیا۔ اور اپنی اکثریت اور طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر ایسی تحریکیں شروع کیں جو سراسر اسلام دشمنی پر مبنی تھیں اور ان کا مقصد مسلمانوں کے قومی وجود کو ختم کرنا یا انہیں ہندو قوم میں ضم کر لینا تھا۔

تحریکِ خلافت کے فوراً بعد مسلمانوں کے خلاف کانگریس اور ہندوؤں کی مسلم دشمن تحریکات کا شروع ہونا اس بات کا نتیجہ تھا کہ برعظیم کی سیاست میں مسلمانوں کا بڑھتا ہوا اثر اور ان کی قومی تنظیم اور مسلم قوت ہندوؤں کو بہت ناگوار تھی۔ یہ وہ نتیجہ تھا کہ جس پر بالآخر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ مسلمان رہنما بھی پہنچے جو کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔ جیسے محمد علی جناح، علی برادران اور ظفر علی خاں وغیرہ۔ یہ وہ با اثر رہنما تھے جنہوں نے دونوں قوموں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کے لیے عملاً کوششیں کیں۔ لیکن گاندھی اور دیگر تمام ہندو رہنماؤں نے سرد مہری کا رویہ اختیار کیے رکھا۔ اور اس طرح ہندو مسلم اتحاد کا کوئی خواب بھی پورا نہ ہو سکا۔

کانگریس اور ہندوؤں کے طرزِ عمل سے مسلمانوں میں ہندوؤں سے بے اطمینانی اور مایوسی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ انہوں نے ہندوؤں پر ایک مرتبہ جو اعتماد کیا تھا وہ سراب ثابت ہوا۔ اور ہندو مسلم روابط میں مزید کشیدگی پیدا ہوئی۔ ہندوؤں کے رویے سے مسلمانوں کی شکایات و خطرات کی فہرست طویل ہوتی گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوؤں کی مسلم دشمن تحریکیں

برعظیم کے مسلمان، جو ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ عالمِ اسلام کے دیگر ممالک کی آزادی کے خواب بھی دیکھ رہے تھے، تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدمِ تعاون کے ناکام ہو جانے سے اضطراب اور مایوسی کی حالت میں تھے۔ اب انہیں اپنی آزادی کے لیے صرف انگریزوں سے ہی نہیں بلکہ ہندوؤں سے بھی اپنے تحفظ کی خاطر مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف ہو کر ہندو یہ چاہنے لگے تھے کہ انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی ہندوستان سے نکال باہر کریں۔ ایک خیال کے مطابق ہندوستانی مسلمانوں میں تحریکِ ہجرت کا ایک محرک مسٹر گاندھی بھی تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ پرجوش مسلمان، کسی حد تک ہی سہی، ہندوستان سے چلے جائیں تاکہ اس طرح مسلمانوں کی اجتماعی قوت ٹوٹ سکے۔ اس عرصے میں بعض متعصب اور بااثر ہندو رہنماؤں، جیسے شردھانند اور ڈاکٹر مونجے نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف "شدھی" اور "سنگھٹن" کی تحریکیں شروع کیں۔ یہ لوگ کانگریسی تھے۔ انہوں نے اعلانیہ مسلمانوں کو ہندو قومیت میں ضم کرنے کا عزم ظاہر کیا اور اس مقصد کے لیے اپنی تحریکیں جاری کیں۔ "سنگھٹن" کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کو قومی حیثیت میں منظم کیا جائے تاکہ وہ مضبوط اور طاقتور ہو جائیں۔ اور کسی فوری ضرورت کے وقت صورتِ حال کا مقابلہ کر سکیں۔ اس مقصد کے تحت ہندوؤں کو ایسے اسلحہ کے استعمال کی تربیت دی گئی جو مسلمانوں کے خلاف فسادات میں بروقت کام آ سکتے تھے۔ مثلاً لاٹھیاں، اینٹوں کے ٹکڑے، بنوٹ اور تلوار اور پریڈ وغیرہ کی مشقیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلم دکان داروں، دستکاروں اور کاریگروں سے معاشی لین دین ختم کر دیا گیا۔

شردھانند آریہ سماجی تھا جو برملا کہتا تھا کہ ہم اس دن کے منتظر ہیں جب انگریزوں اور مسلمانوں دونوں سے اپنی غلامی کا انتقام لیں گے۔ اس نے بڑی تعداد میں اجتماعی طور پر تبدیلیٔ مذاہب کرانے کی تحریک "شدھی" شروع کر دی۔ یہ دونوں تحریکیں ایک ہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقصد اور ایک ہی نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ ان تحریکوں کے کارکن یہ اعلان کرتے تھے کہ ہندو قوم کا مستقبل ان چار ستونوں پر قائم ہے: "ہندو سنگھٹن"، "مسلمانوں کی شدھی" "افغانستان اور سرحدی علاقے کی فتح" اور "شدھی اور ہندو راج"۔ جب تک ہندو قوم یہ چار مقاصد حاصل نہیں کر لیتی اس کی موجودہ اور آئندہ نسل کی سلامتی خطرے میں رہے گی۔ اس لیے برعظیم اور افغانستان سے اسلام کو باہر نکال دیا جائے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو آزادی اس قابل نہیں کہ اسے حاصل کیا جائے۔

یہ باتیں مسلمانوں کو چونکا دینے کے لیے کافی تھیں۔ ہندوؤں کی ان تحریکوں کے نتیجے میں انہیں پھر یہ احساس ہوا کہ ہندوؤں کے عزائم کیا ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ہندو مسلم اتحاد کے برقرار رہنے کا کوئی امکان نہ رہ سکتا تھا۔ مسلمانوں نے بھی ان دو تحریکوں کا جواب اپنی حد تک دو تحریکوں سے دیا۔ "سنگھٹن" کا مقابلہ کرنے کے لیے "تنظیم" اور "شدھی" سے بچاؤ کے لیے "تبلیغ" شروع ہوئیں۔ لیکن چونکہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے وسائل محدود اور کمزور تھے اس لیے مسلمانوں کی جوابی تحریکوں کو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

ہندوؤں نے جو تحریکیں مسلمانوں کے خلاف شروع کی تھیں، بہت جلد اس کا نتیجہ سامنے آگیا۔ جو لوگ اسلحہ چلانے اور جسمانی مقابلے کی تربیت حاصل کر رہے تھے وہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے چین ہونے لگے۔ ہر طرف فسادات شروع ہوئے اور مسلمانوں کی جان و مال کو شدید نقصان پہنچایا گیا۔ انگریزی عہد میں اب تک بلاشبہ سینکڑوں مسلم کش فسادات ہو چکے تھے لیکن اس صورتِ حال میں جو ہر طرف منظم اور عام اجتماعی حملے شروع ہوئے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کا وجود کسی طور برداشت نہیں ہے۔ بہت جلد فسادات کی آگ نے سارے برعظیم کو گھیر لیا۔ اب یہ لازمی تھا کہ اس طرح ہندو اکثریت کو فائدہ پہنچے اور مسلمان بری طرح متاثر ہوں۔ ان ہی فسادات کے دوران ہندوؤں کی خفیہ جنگجو جماعت "راشٹریہ سیوک سنگھ" وجود میں آئی۔ یہ جماعت زمین دوز رہی اور تقسیم ہند سے چند سال قبل میدان میں آئی۔ یہ مسلم کشی اور تعصب میں کسی بھی دوسری مسلم دشمن جماعت سے کم تر نہیں تھی۔ اب مسلمان اس مقام پر تھے کہ وہ اپنے قومی مقاصد کے لیے جدوجہد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لیے بھی تیار نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے لیے آئینی مفادات کی تگ و دو میں زیادہ مستعدی سے مصروف ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئین کا مسئلہ اور نہرو رپورٹ

حکومتِ برطانیہ نے برعظیم میں اب تک قانون کے تحت جو اصلاحات جاری کی تھیں وہ مایوس کن تھیں اور ہندوستانیوں کی توقعات کو پورا نہ کرتی تھیں۔ چنانچہ جب ہر طرف سے مزید اصلاحات و اختیارات کے مطالبات کیے جانے لگے تو اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ۱۹۲۷ء میں "سائمن کمیشن" کا تقرر ہوا۔ چونکہ اس میں کوئی ہندوستانی شامل نہیں تھا اس لیے اس کے خلاف سیاسی حلقوں میں غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اور تقریباً تمام سیاسی جماعتوں نے اس کمیشن سے عدمِ تعاون کا فیصلہ کیا۔ اس بنا پر حکومتِ برطانیہ نے ہندوستانیوں کو یہ دعوت دی کہ برطانیہ کی جاری کردہ اصلاحات پر تنقید کرنے کے بجائے وہ خود کوئی دستور بنا کر پیش کریں۔ اس دعوت کو قبول کر لیا گیا اور دہلی میں تمام سیاسی جماعتوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ ان جماعتوں کے درمیان یہ طے پایا کہ آئندہ دستور پر اس خیال کے ساتھ گفتگو کی جائے کہ ہندوستان میں مکمل طور پر خود مختار حکومت قائم ہوگی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ فرقہ وارانہ تناسب اور اقلیتوں کی نمائندگی کس قدر ہو۔ یہاں ہندو مسلم اختلافات فوراً سطح پر آگئے۔ یہ خیال کیا گیا کہ اختلاف رائے اور کثرتِ تعبیر کے نقطہ نظر سے جو کام ایک پوری کانفرنس کے لیے غیر ممکن ہوگا وہ ایک چھوٹی سی ذیلی مجلس عمدگی سے کر سکے گی۔ اس مقصد کے لیے موتی لال نہرو کی سربراہی میں ایک مجلس تشکیل دی گئی۔ اس مجلس نے ایک رپورٹ تیار کی جسے کانگریس نے فوراً منظور کر لیا۔ یہ رپورٹ مسلمانوں کے مفادات کو پورا نہ کرتی تھی۔ اس میں بعض طے شدہ امور کو بھی ہندوؤں نے نظر انداز کر دیا تھا، جیسے مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کا مسئلہ۔ اس سے ہندو ذہنیت کا اظہار ہوتا تھا کہ وہ کس قدر تیزی کے ساتھ اپنے ماضی اور قدامت پرستی کی طرف سفر کر رہی ہے۔ اس رپورٹ میں ہندوستان کے لیے کامل خود مختاری کا نصب العین ترک کر کے اسے نوآبادیاتی ریاست کا درجہ دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے تقریباً سب ہی مطالبات رد کیے گئے۔ نشستوں کا تعین مخلوط انتخاب کے اصول پر کیا گیا۔ صوبوں سے ہر قسم کا اختیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھین کر مرکز کو دے دیا گیا۔ مسلمانوں کے اکثریتی صوبے سندھ، بلوچستان اور سرحد کے لیے نہ دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات یا آئین گوارا کیا گیا اور نہ سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ قرار دیا گیا جو مسلمانوں کا دیرینہ مطالبہ تھا۔

اس رپورٹ سے مسلمانوں کا مایوس ہونا اور چونکنا فطری تھا کیونکہ یہ مسلمانوں کے مفادات سے یکسر مختلف تھی "میثاق لکھنؤ" جو کانگریس اور لیگ سمجھوتے کی بنیاد تھا اسے بالکل نظر انداز کر کے مخلوط انتخاب کے اصول کو رائج کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا اور کچھ اس قسم کی کوشش کی گئی تھی کہ مسلمانوں میں اپنی تہذیب و تمدن اور اسلام سے جو عقیدت پائی جاتی ہے وہ سرد پڑ جائے اور ان میں ہندوستانی قومیت اور وطنیت کا جذبہ لادینیت اور سیکولرازم کی بنیاد پر پیدا ہو۔ مسلمانوں کو صاف نظر آتا تھا کہ اس رپورٹ کے پسِ پشت کانگریس انگریزوں کے زیرِ سایہ ان کی تہذیب و تمدن کو ختم کر کے ان کی "شدھی" کرنا چاہتی ہے۔ اب صورتِ حال اس قدر واضح تھی کہ کانگریس سے کسی باعزت سمجھوتے کی کوئی صورت باقی نہ رہ گئی تھی۔ علی برادران اور بعض پرخلوص مخلص رہنما، جن کی زندگی آزادی، بیداری اور کانگریس کو ہر دلعزیز بنانے پر صرف ہوئی تھی، وہ بھی اپنی ماضی کی قربانیوں و ایثار کے باوجود کانگریس کے عزائم و رویہ سے مایوس ہو کر علیحدہ ہونے اور مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ راہِ عمل تجویز کرنے پر مجبور ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندو اکثریت کے گھمنڈ میں مسلمانوں کے مذہب و تمدن کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور وہ کسی باعزت اور پروقار سمجھوتے کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں۔ یہ کانگریس کا گھمنڈ ہی تھا کہ اس نے نہ مسلمانوں سے کیے ہوئے اپنے وعدوں کا لحاظ رکھا اور نہ ان کے جذبات کو پیشِ نظر رکھا بلکہ اس نے رپورٹ کو منظور کر کے اعلان کر دیا کہ اگر برطانوی حکومت نے ایک سال کے اندر اس رپورٹ کے تجویز کردہ دستور کے مطابق عمل نہ کیا تو کانگریس مکمل آزادی کے نصب العین کو اپنائے گی۔ ایک سال گزرنے پر بھی جب کانگریس کا مطالبہ پورا نہ ہوا تو اس نے اعلان کر دیا کہ اس کا نصب العین ہندوستان کی مکمل آزادی ہے۔ مسلمانوں کے لیے نہرو رپورٹ کا ایک مفید پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں کی ایک کل جماعتی کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی اور مسلمان باہمی اتحاد کی کوششوں میں لگ گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئین کا مسئلہ اور مسلمان

دستوری اصلاحات کی اس نئی صورتِ حال میں کہ جس میں "سائمن کمیشن" تشکیل دیا جاتا ہے اور کانگریس "نہرو رپورٹ" پیش کرتی ہے، مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کے طفیل ایک ذہنی کشمکش اور مایوسی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ انہوں نے "نہرو رپورٹ" کی تجاویز پر غور کر کے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے دہلی میں مسلم جماعتوں کی ایک کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس نے جنوری ۱۹۲۹ء میں اتفاق رائے کے ساتھ ایک دستوری منشور طے کر کے شائع کر دیا۔ اس منشور کی رو سے برعظیم کی وسعت اور اس کی نسلی اور لسانی نوعیت کے اعتبار سے یہ ضروری ہے کہ اس کا طرزِ حکومت وفاقی ہو جس میں مکمل خود مختاری اور جملہ باقی اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ کانفرنس نے جداگانہ انتخاب اور برابری کے اصول دونوں کو ترک کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی تعلیم، ان کے مذہب اور ان کے شخصی قانون کی حفاظت و ترقی کا انتظام کیا جائے۔ اس نے مرکزی اور صوبائی وزارتوں، سرکاری ملازمتوں اور تمام آئینی خود اختیاری جماعتوں میں مناسب نمائندگی کا بھی مطالبہ کیا۔

"نہرو رپورٹ" کو مسترد کرنے کے دو بڑے اسباب یہ تھے کہ مسلمان اب اس بات کا عزم کر چکے تھے کہ جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہے وہاں انہیں مکمل خود مختاری حاصل ہونی چاہیے۔ اور یہ کہ ان کے لیے جداگانہ انتخابات کا طریقہ ضرور برقرار رہنا چاہیے۔ اس سلسلے میں محمد علی جناح نے مسلمانوں کے جذبات اور مفادات کی روشنی میں "چودہ نکات" پیش کیے۔ ابتداءً محمد علی جناح نے کوشش کی تھی کہ کسی طرح کانگریس کے اربابِ اختیار "نہرو رپورٹ" میں مسلمانوں کے مطالبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کم از کم چند ترامیم کر لیں لیکن ہندو ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ محمد علی جناح، جو اس وقت تک ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے تھے، اب ہندوؤں سے بالکل مایوسی کی حالت میں تھے ——— ان کا ایک طویل عرصے تک یہ موقف رہا کہ ہندوستان کی آزادی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ممکن نہیں ہے، اگر لیگ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور کانگریس آپس میں طے کرلیں تو انگریز ہرگز ہندوستان میں نہیں رہ سکتے - وہ اپنی اس کوشش میں ۱۹۱۶ء میں "میثاقِ لکھنؤ" کے ذریعے کامیاب بھی ہوئے تھے لیکن جب اس پر عمل کرنے کا وقت آیا تو ہندو سیاست پر گاندھی کا تسلط ہوگیا - محمد علی جناح کو، جو اس وقت تک قائداعظم نہیں ہوئے تھے، دوسرے مسلمان قائدین میں یہ برتری حاصل تھی کہ وہ مسلمانوں کے دونوں حریفوں انگریزوں اور ہندوؤں کی فطرت سے خوب واقف تھے - وہ ان کے مزاج شناس تھے اور ان کی چالبازیوں کو سمجھتے تھے - انہوں نے کانگریس کی سیاست کا گہرا جائزہ لیا اور انہیں یقین ہوگیا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کی خواہشمند نہیں ہے - وہ صرف انگریزوں سے مسلمانوں کی قیمت پر سمجھوتا کرنا چاہتی ہے - ان کے پیشِ نظر اس کے یہ عزائم اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ موجود تھے کہ وہ مسلمانوں کو حکومت سے لڑا کر خود اپنی وفاداریوں کے صلے میں بہتر فوائد حاصل کرنا چاہتی ہے -

جس وقت کانگریس نے "نہرو رپورٹ" کو منظور کیا، محمد علی جناح مسلم لیگ کے صدر تھے اور اس وقت لندن میں تھے، انگلستان سے واپس آکر انہوں نے "نہرو رپورٹ" پر فوری کوئی رائے ظاہر نہیں کی لیکن اس کوشش میں رہے کہ وہ اس میں مناسب ترامیم کرالیں - مگر انہیں ناکامی ہوئی - چنانچہ کافی غور و خوض کے بعد انہوں نے مسلم لیگ کے توسط سے اپنا متبادل نقطۂ نظر "چودہ نکات" کی صورت میں پیش کیا - ان چودہ نکات اور مسلم جماعتوں کے پیش کردہ مشترکہ دستوری منشور میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں تھا - مگر یہ نکات بہت وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو پیش کرتے تھے - اس کی ایک شق میں یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ آئندہ مرکز میں یا کسی صوبے میں مسلمانوں کے کم از کم ایک تہائی تناسب کے بغیر کوئی وزارت تشکیل نہ دی جائے -

محمد علی جناح کے پیش کردہ "چودہ نکات" اس وقت مسلمانوں کے جذبات اور مطالبات کی صحیح ترجمانی کرتے تھے - مگر کانگریس نے ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے مسلمانوں کی اس درخواست کو بھی قابلِ قبول نہ سمجھا اور وہ ان کی مخالفت کرنے لگی - مسلمانوں کے ان مطالبات کو اس بنیاد پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور انہیں مسترد کیا گیا کہ ان سے ہندوستان کی وحدت کا خاتمہ ہوتا ہے اور یہ کہ ان سے فرقہ وارانہ طرزِ فکر کا اظہار ہوتا ہے - لیکن ہندوؤں کا یہی طرزِ فکر تھا جس نے مسلمانوں کو "نہرو رپورٹ" کے مقابلے میں چودہ نکات پیش کرنے پر مجبور کیا تھا - اس کے بعد سے ہندو مسلم اتحاد کا سوال تو ایک طرف دونوں قوموں کے تعلقات اور نصب العین میں بھی علیحدگی اور فاصلے کی ایک وسیع و عریض خلیج پیدا ہوتی چلی گئی -

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گول میز کانفرنس اور مسلمانوں کا موقف

مئی ۱۹۲۹ء میں برطانیہ میں پارلیمنٹ کے لیے عام انتخابات ہوئے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی کہ لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آئی۔ کانگریس کو اس کی کامیابی سے بڑی امیدیں پیدا ہو گئیں۔ کیونکہ لیبر پارٹی ہمیشہ کانگریس اور ہندوؤں کے مفادات کی تائید کرتی تھی۔ اس کے تحت جو وزارتیں بنیں ان میں وزیراعظم اور وزیرِ ہند دونوں کانگریس نوازی میں مشہور تھے۔ کانگریس نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانا چاہا اور حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے قانون شکنی کی تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک کے پسِ پشت ایک اور مصلحت بھی تھی۔ حکومت نے سال ختم ہونے سے پہلے ہی "نہرو رپورٹ" کو منظور کرنے کے بجائے ایک "گول میز کانفرنس" کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ تاکہ تمام ہندوستانی قومیں خود اپنے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کر سکیں۔ اس میں مسلمانوں کے مطالبات بھی اسی طرح پیش ہوئے تھے جس طرح ہندوؤں کے۔ چنانچہ ہندوؤں کے پیشِ نظر یہ مصلحت تھی کہ کوئی بھرپور تحریک ان کی حیثیت و قوت کو دوسری تمام قوموں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں رکھ سکے گی۔ اس لیے تمام کانگریسی قانون شکنی کی تحریک میں مستعد ہوئے۔ یہ تحریک اس وقت شروع کی گئی تھی۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش جاری تھی اور مختلف علاقوں میں مسلم کش فسادات جاری تھے۔ سائمن کمیشن نے اپنی سفارشات پیش کر دی تھیں لیکن یہ اس قدر مایوس کن تھیں کہ برعظیم کی رائے عامہ کے موافق نہیں ہو سکتی تھیں۔

تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد سے اب تک مسلم لیگ۔ اس قابل نہ ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے مطالبات کو منوانے کے لیے کانگریس کی طرح کوئی عملی جدوجہد کر سکتی۔ اس کے برعکس کانگریس ہندو مفادات کے لیے بڑی جارحانہ تحریکیں جاری کیے ہوئے۔ اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کل جماعتی مسلم کانفرنس ہی کو مستقل ادارے کی حیثیت سے برقرار رکھا جائے۔ چنانچہ مرکز میں ایک بورڈ اور مجلس عاملہ کے تحت تمام صوبوں اور اضلاع میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اور اس نے بڑی محنت سے رائے عامہ کی تربیت کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"گول میز کانفرنس" کا پہلا اجلاس لندن میں ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو شروع ہوا۔ ہندوستان سے تمام گروہوں کے نمائندوں نے شرکت کی مگر کانگریس نے عدم تعاون کیا۔ دوسرا اجلاس اگلے سال ہوا۔ جس میں کانگریس نے شرکت کی۔ کیونکہ گاندھی اور گورنر جنرل کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اس کی رو سے کانگریس نے قانون شکنی کی تحریک ختم کر دی اور حکومت نے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ گاندھی نے اقلیتوں سے مذاکرات کے بعد کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔ اس پر تمام اقلیتوں نے، جن میں مسلمان، ہندو، پسماندہ طبقے، ہندوستانی عیسائی اور ہندیورپی باشندے سب ہی شامل تھے، مشترکہ طور پر اپنے مطالبات کا اعادہ کیا۔ یہ مطالبات مسلمانوں کے مطالبات سے بڑی حد تک مطابقت رکھتے تھے۔ اگست ۱۹۳۲ء میں وزیراعظم برطانیہ نے مختلف قوموں کے مسئلے کے متعلق اپنے ثالثی فیصلے "کمیونل ایوارڈ" کا اعلان کیا۔ جس میں اقلیتوں کے لیے تحفظات دیئے گئے تھے۔ کیونکہ اب یہ امر واضح ہو گیا تھا کہ ہندوستانی اقلیتیں ایک متفقہ حل دریافت نہیں کر سکتیں۔ مسلمانوں کو وہ سب کچھ نہیں ملا جس کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا۔ کانفرنس کا تیسرا اجلاس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو منعقد ہوا۔ اس میں کانگریس نے پھر شرکت نہ کی۔ حکومت اور کانگریس کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ ٹوٹ گیا تھا۔ چنانچہ کانگریس نے دوبارہ قانون شکنی کی تحریک شروع کر دی۔ اس طرح گول میز کانفرنس ختم ہو گئی۔

گول میز کانفرنس کے مسلم ارکان میں آغا خان، مولانا محمد علی، علامہ اقبال اور محمد علی جناح زیادہ نمایاں تھے۔ پہلے اجلاس کے خاتمے پر مسلم مندوبین نے ایک بیان میں کہا تھا کہ انہوں نے اقلیتوں کی مجلس کے کام میں سمجھوتے کے جذبے سے حصہ لیا تھا اور انہیں یہ امید تھی کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے مسئلے کا کوئی حل نکل آئے، مگر کوئی تصفیہ نہیں ہوا۔ انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ مسلمانوں کے لیے کوئی دستور مناسب تحفظات کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ کانفرنسوں کے درمیان "کمیونل ایوارڈ" کا اعلان مسلمانوں کے لیے "نہرو رپورٹ" کے مقابلے میں بہتر تھا۔ ہندوؤں کی تمام جماعتیں "کمیونل ایوارڈ" کے خلاف تھیں لیکن مسلمان معقول شرائط پر سمجھوتے کے لیے رضامند تھے۔ چنانچہ متعصب اور زیادہ کٹر ہندوؤں نے "کمیونل ایوارڈ" کی مخالفت کے لیے کانگریس کے اندر قوم پرست جماعت تشکیل دی اور فرقہ وارانہ کشیدگی میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس طرح یہاں بھی متعصب ہندو ذہنیت آڑے آئی اور کوئی مثبت نتیجہ نہ نکل سکا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۳۵ء کا قانون — اور مسلم لیگ کا ردعمل

گول میز کانفرنسوں میں ہندوستانی نمائندوں کے درمیان فرقہ وارانہ نمائندگی کے متعلق کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا تھا۔ چنانچہ خود حکومت برطانیہ نے اس الجھے ہوئے مسئلے کو طے کرنے کے لیے نمائندگی کے اصول خود متعین کیے۔ یہ فیصلہ فرقہ وارانہ تقسیم یا "کمیونل ایوارڈ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس فیصلے کو اس آئین میں شامل کر لیا گیا جو ۱۹۳۵ء میں منظور کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کے سیاسی مفاد و حقوق کا تحفظ کیا جائے اور انہیں مطمئن کیا جائے۔ اس کی رو سے ہندوستان کو جو اختیارات حاصل ہوئے وہ ان سے کہیں زیادہ تھے جو سائمن کمیشن نے تجویز کیے تھے۔ یہ آئین ہندوستان کی خود مختاری کی طرف ایک بڑا اقدام تھا۔ صوبوں کو تقریباً وہ تمام اختیارات سونپ دیئے گئے جو عام طور پر کسی آزاد وفاقی مملکت کی وحدتوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی رو سے صوبوں کی مجموعی تعداد گیارہ ہو گئی اور ان سب کو تقریباً مکمل خود مختاری مل گئی۔ جو اختیارات آئین میں صوبوں کے لیے مخصوص کر دیئے گئے ان میں مرکزی مداخلت کا اب کوئی امکان نہ رہا۔ ہر صوبے کے لیے ایک علیحدہ قانون ساز اسمبلی رکھی گئی اور صوبائی وزارت اس اسمبلی کے سامنے جواب دہ تھی۔ وزیروں کے تقرر کا اختیار گورنر کو تھا، مگر شرط یہ تھی کہ تمام وزیر اسمبلی کے ممبر ہوں۔ اس کے علاوہ عملاً گورنر پر لازم تھا کہ وہ صرف ایسے لوگوں کو وزیر بنائے جن کو اسمبلی کے ممبروں کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔ اسی طرح وہ مجبور تھا کہ ایسے شخص کو وزیر اعلیٰ بنائے جس کو اسمبلی کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو اور پھر اسی کے مشورے سے دوسرے وزیروں کا انتخاب کرے۔ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ اس طرح کیا گیا کہ ہر صوبائی اسمبلی میں ان کے لیے جداگانہ نشستیں مخصوص کر دی گئیں اور ہر اقلیتی فرقے کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا۔ نئے آئین میں کوئی شق ایسی نہ تھی جس کی رو سے اکثریت اس بات پر مجبور ہو کہ اقلیتوں کے نمائندے وزارت میں شامل کرے۔ اس آئین کا دوسرا حصہ مرکزی معاملات سے متعلق تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ایک کل ہند وفاق کی تشکیل کی جائے اور مرکز میں بھی ایسی

محکمہ دارالمعارف سے مذہبی موضوع پر مستند کتب کے آن لائن مطالعہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت قائم کی جائے جو عوام کے نمائندوں کے سامنے جواب دہ ہو۔ لیکن آئین کا یہ حصہ کبھی نافذ نہ ہو سکا۔ کیونکہ دیسی ریاستوں کے فرمانرواؤں نے وفاق میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا مرکزی حکومت کا ڈھانچہ وہی رہا جو پہلے تھا۔

انگریز ہندوستانیوں کی امنگوں اور خواہشات کو کچلنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۹۱۹ء کا رولٹ ایکٹ منسوخ کرنے مگر اس کے مقاصد بحال رکھنے کی عجیب و غریب کارروائی کر کے ۱۹۳۵ء کے قانون کے مقاصد متعین کرنے کی دستوری ضرورت کو نظر انداز کر دیا۔ اس قانون میں ہندوستان کے مفاد کے خلاف دیگر امور کے علاوہ ایسی دفعات بھی تھیں جن سے ہندوستان میں انگریزوں کے تاجرانہ مفادات کا مناسب و معقول تحفظ موجود تھا اور اس سلسلے میں ہندوستان کی اسمبلیوں کو ایسا کوئی قانون منظور کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا جس سے برطانیہ کے تجارتی مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

اس قانون سے مسلمانوں کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ان کے مطالبے کے مطابق ان کے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لیے دستور میں قابلِ عمل دفعات نہیں رکھی گئیں بلکہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت گورنروں اور گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات میں داخل کر دیں۔ جو مخصوص پابندیوں میں رہ کر انجام دے سکتے تھے۔ اس سے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت تو کچھ نہ ہوئی البتہ ان کی خود اعتمادی اور ان کے حوصلے پر یہ برا اثر پڑا کہ وہ اکثریت کے مقابلے میں انصاف حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ گورنروں اور گورنر جنرل کی خوشامد کرتے رہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ نے اس قانون کے نفاذ کی مخالفت کی اور احتجاج کیا۔ اس قانون کا نفاذ ۱۹۳۷ء میں ہوا۔ اس کے تحت اس سال انتخابات ہوتے تھے۔ مسلم لیگ نے اس پر نکتہ چینی کی۔ لیکن اس نے یہ مناسب سمجھا کہ اس قانون کی دفعات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کے مجموعی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے سرگرم عمل ہو گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم لیگ کی تنظیمِ نو

۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات ۱۹۳۷ء میں ہونے والے تھے۔ انتخابات میں شرکت کے لیے اس وقت کانگریس تذبذب کی حالت میں تھی۔ کیونکہ وہ "کمیونل ایوارڈ" کو مسترد کر چکی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے انتخابات کی تیاریاں ۱۹۳۴ء ہی میں شروع کر دی تھیں۔ اس نے اپنا انتخابی بورڈ بھی قائم کر دیا تھا اور یہ بورڈ اسی باقاعدگی اور اسی پیمانے پر کام کر رہا تھا جیسے انگلستان کی بڑی بڑی سیاسی جماعتیں کرتی ہیں۔ وہ بورڈ کانگریس کی انتخابی حکمتِ عملی تشکیل دے رہا تھا اور اپنے امیدواروں کو ضروری ہدایتیں دے رہا تھا۔ اس کے برعکس کانگریس کی مخالف جماعتیں بہت دیر میں بیدار ہوئیں۔ اور انہوں نے اس کے دو برس بعد انتخابات کے سلسلے میں کام شروع کیا۔

جس زمانے میں کانگریس اس حد تک منظم طریقے پر کام کر رہی تھی اس وقت تک مسلم لیگ ابھی عوامی جماعت بھی نہ بن سکی تھی۔ نہ اس کی صوبہ وار شاخیں تھیں اور نہ اس کی کثیر رکنیت سازی تھی۔ جب دستور میں رکنیت کے لیے یہ شرط ہو کہ ہر شخص رکنیت کے لیے باقاعدہ درخواست دے، جس پر دو سابق ارکان تصدیق کریں اور سالانہ چندہ چھ روپے بھی ادا کیے جائیں تو ان شرائط کے ساتھ اس کے عوامی جماعت بننے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ ان نامساعد حالات میں محمد علی جناح نے لیگ کی تنظیمِ نو کا اہتمام کیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں لیگ کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے رکنیت سازی کی شرائط میں بہت نرمی پیدا کر دی۔ اسے متعارف کرانے کیلیے جگہ جگہ جلسے کیے اور اطرافِ ملک کے دورے کیے اور صلاح مشورے کے بعد بالآخر اس کا ایک انتخابی بورڈ تشکیل دیا۔ اس میں مسلمانوں کی مختلف الخیال جماعتوں جمعیت العلماء، مجلس احرار اور قوم پرست مسلمان سب ہی کی نمائندگی تھی۔ اس کا ایک آئین بھی ترتیب دیا گیا۔ اس کے بعد صوبوں میں انتخابی بورڈ قائم کیے گئے۔ پنجاب، بنگال، صوبہ سرحد اور سندھ جو مسلم اکثریت کے صوبے تھے، نئے آئین کے تحت اپنے صوبائی اختیارات برتنے کے لیے بے قرار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ چنانچہ وہاں زیادہ تر سرگرمیاں صوبائی معاملات تک محدود رہیں۔ پنجاب میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ نئی جماعت "یونینسٹ پارٹی" کا زور رہا۔ بنگال میں "کرشک پرجا پارٹی" نمایاں تھی۔ صوبۂ سرحد میں کانگریس کا اثر زیادہ تھا۔ اس لحاظ سے لیگ کے لیے انتخابی میدان صرف مسلم اقلیتی صوبوں تک محدود تھا۔

برعظیم کے مسلمان اس وسیع و عریض ملک کے مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ اور ایک صوبے کے مسلمان دوسرے صوبے کے مسلمانوں سے اچھی طرح واقف بھی نہ تھے۔ محمد علی جناح نے جب لیگ کی تنظیم نو شروع کی تو اس وقت ہر صوبے میں کوئی نہ کوئی جماعت فعال اور مقبول تھی۔ مسلم لیگ تقریباً ہر صوبے کے لیے اب مقابلتاً نئی جماعت تھی اور ابھی بہت کمزور بھی تھی۔ لہٰذا اس وقت یہ امید نہ ہو سکتی تھی کہ دوسری جماعتوں کے رہنما اور کارکن ان سے علیحدہ ہو کر لیگ میں شریک ہو جائیں گے۔ اس صورتِ حال میں محمد علی جناح نے مسلمانوں کے اس منتشر گروہ کو متحد اور منظم کرنے کا عہد کیا تھا، جو بڑا کٹھن اور دشوار گزار کام تھا۔ لیکن ان کی فراست، دور اندیشی اور مستقل مزاجی کے طفیل بہت جلد لیگ کا نہ صرف تعطل ختم ہو گیا بلکہ وہ ایک سرگرم اور مستعد جماعت بن گئی۔ اب اس کے پیشِ نظر، جیسے تیسے بھی ہوں، عنقریب ہونے والے پہلے انتخابات تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۳۷ء کے انتخابات

محمد علی جناح کی بے مثال قائدانہ صلاحیتوں کے باوجود ایک بہت قلیل مدت میں مسلم لیگ اس قابل نہ ہو سکی کہ وہ کانگریس جیسی منظم اور برتر جماعت کے مقابلے میں اپنی مساویانہ حیثیت ثابت کروا سکتی۔ اسے بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ ہندوستان کے تمام مسلمان اس وقت لیگ کے ساتھ نہ تھے۔ لیکن یہی ایک بہت بڑا کام تھا کہ اسے انتخابات میں حصہ لینا تھا اور یہ اقدام اب اسے مزید ایک عوامی جماعت کی حیثیت دے رہا تھا۔ اس کے انتخابی منشور میں کہا گیا تھا کہ "انگریزی حکومت کے نافذ کردہ قوانین مسلمانانِ ہند کے لیے فائدہ مند نہیں ہیں۔ چنانچہ موجودہ مجوزہ صوبائی اور مرکزی آئین کی جگہ فوری طور پر جمہوری اور مکمل حکومت اختیاری قائم کی جائے گی۔ اس عرصے میں مسلم لیگ کے نمائندے اسمبلیوں میں رہ کر اس بات کی کوشش کریں گے کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے آئین سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کر سکیں۔ تمام جابرانہ قوانین منسوخ کرائے جائیں گے۔ ملک کی اقتصادی لوٹ روکی جائے گی۔ حکومت کے گراں بار اخراجات گھٹائے جائیں گے۔ فوج کو قومی بنیادوں پر استوار کیا جائے گا۔ صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے گی۔ دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود اور صوبائی بجٹ میں قومی تعمیر کی سرگرمیوں کے لیے زیادہ رقم منظور کرائی جائے گی۔ ابتدائی تعلیم مفت کی جائے گی۔ مسلمانوں کے مذہب، زبان اور رسم الخط کا تحفظ کیا جائے گا اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں گی جن سے عام مسلمانوں کی زندگی سنور سکے۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم لیگ نے انتخابی منشور کی بنیاد پر عام انتخابات میں اپنے امیدوار نامزد کیے۔ اس وقت ہندوستان کے تیس کروڑ باشندوں میں سے صرف تقریباً تین کروڑ باشندوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا اور ان میں سے بھی محض تیس فیصد مسلمان تھے۔ مسلمانوں نے جو ووٹ ڈالے ان میں سے بمشکل پانچ فیصد مسلم لیگ کے امیدواروں کو ملے۔ ہندو اکثریت کے تمام صوبوں میں کانگریس کو توقع کے خلاف نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ بمبئی اور صوبۂ سرحد،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہار، یو پی، سی پی اور اڑیسہ میں مکمل اکثریت حاصل ہو گئی۔ بمبئی اور صوبۂ سرحد کے چند آزاد امیدوار بھی اس میں شامل ہو گئے۔ اور اس طرح کانگریس نے ان دونوں صوبوں کی اسمبلیوں میں بھی اکثریت حاصل کر لی۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کو کسی صوبہ میں اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔ اسے مسلم اکثریت کے صوبوں پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد میں مسلمانوں کی ۲۷۳ نشستوں میں سے صرف ۱۱۴ نشستیں مل سکیں۔ اس وجہ سے ہندوستان کے کسی صوبے میں لیگ کو وزارت بنانے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں کانگریس کو گیارہ میں سے سات صوبوں میں اکثریت حاصل تھی۔ وہ اس قابل تھی کہ بغیر کسی دوسری جماعت کے تعاون کے خود اپنی وزارتیں تشکیل دے۔ اس نے غرور کے نشے میں یہ فیصلہ کیا کہ جب تک اسمبلی میں کانگریس کو یہ اطمینان نہیں ہو جاتا کہ گورنر اپنی مداخلت کے خصوصی اختیار استعمال نہ کریں گے یا دوسری سرگرمیوں کے سلسلے میں اپنے وزیروں کے مشورے کو نظر انداز نہ کریں گے کانگریس وزارتیں قبول نہ کرے گی۔ گورنروں کی خصوصی ذمہ داریوں میں یہ امر بھی شامل تھا کہ تمام اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا، جن میں مسلمان بھی شامل تھے۔ مسلمانوں کا یہ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے ہندو باشندوں کے دباؤ میں آکر کانگریس وزارت مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچائے۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ لیگ اور کانگریس مل کر بعض صوبوں میں ایک مخلوط حکومت بنائیں گے مگر جب کانگریس اس قدر بڑی تعداد میں منتخب ہو گئی تو اس نے اپنی حکمتِ عملی بدل دی اور لیگ کے ارکان سے مطالبہ کیا کہ وہ کانگریس میں شامل ہو جائیں اور مسلم لیگ کا وجود ہی ختم کر دیں۔ اور یہ وعدہ کریں کہ آئندہ لیگ کے ٹکٹ پر کوئی امیدوار کھڑا نہیں کریں گے۔ یہ بالکل واضح تھا کہ اس قسم کا مطالبہ مسلم لیگ کے وجود کو ختم کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس پیشکش کو لازمی طور پر رد کر دیا گیا۔ ہندو مسلم مسئلے کے متعلق کانگریس کے طرزِ عمل کا یہ کھلا اظہار تھا۔ مسلمانوں کا غصہ بڑھ گیا۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ انہیں اقتدار میں اس لیے شریک نہیں کیا گیا کہ کانگریس دراصل ہندوؤں کی جماعت ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.Kitabo5unnat.com

کانگریس کا رویہ ـــــ اور مسلمان

"شدھی" اور "سنگھٹن" اور دیگر مسلم دشمن تحریکوں کی ناکامی سے ہندوؤں کو یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ باوجود پریشانی و انتشار اور مالی بدحالی کے مسلمانوں کے مذہبی جذبے کو ختم نہیں کیا جا سکتا، نہ مذہبی حیثیت سے ان کو ہندو مت میں ضم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کانگریس اور بااثر ہندوؤں نے مسلمانوں کو مغلوب کرنے اور انہیں ہندو قومیت اور ہندو تہذیب میں ضم کرنے کے لیے، اب اس نئی صورتِ حال میں کہ متعدد صوبوں میں کانگریس اور ہندوؤں کو اقتدار حاصل تھا، کچھ نئی کاوشیں شروع کیں جو بلاشبہ "شدھی" سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن تھیں۔ کانگریس کے منظر پر اس وقت جواہر لال نہرو کی شخصیت ابھر رہی تھی جو سوچ اور طرزِ فکر کے اعتبار سے دو ہاتھ آگے نکل چکے تھے اور بہت جلد گاندھی کے جانشین بننے والے تھے۔ انہوں نے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ قومیت اور فریب کاری کے تازہ اصول بھی سیکھے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خیالات سے کانگریس کی ایک بڑی جماعت "سوشلسٹ پارٹی" کی آبیاری کی اور بڑے دلنشین انداز میں مذہب کو دقیانوسی اور ذاتی معاملہ قرار دیا اور مذہب اور سیاست کو دو علیحدہ شعبے قرار دیتے ہوئے بالخصوص مسلمانوں کو کانگریس یا اس کی سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

ہندو اب کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کو اپنی قومیت اور تہذیب میں ضم کر لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے کانگریس نے اپنے بے پناہ وسائل استعمال کیے اور سرمایہ خرچ کیا۔ اپنی ہم خیال مسلم جمعیتوں کو خاطر خواہ مالی امداد دی جاتی رہی۔ چنانچہ اس کے خیالات اور نظریات مقدس اور محترم ہستیوں کی زبانوں سے بھی اسی طرح ادا ہوئے جس طرح گاندھی اور نہرو ادا کرتے۔ اس صورتِ حال میں سادہ لوح مسلمانوں کا ایک طبقہ پر فریب الفاظ کی زد میں آگیا اور ایک عرصے تک اصل حقیقت ان سے پوشیدہ رہی۔ مسلمانوں میں مذہب کے تعلق سے شکوک و شبہات اور اشتراکیت یا اس قبیل کے دیگر رجحانات اسی وقت کی یادگار ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے کانگریس نے اپنی ماتحتی میں شعبۂ اسلام کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا، جہاں سے اپنے ہم خیال مسلم علماء سے ایسا ادب وافر مقدار میں تحریر کرایا گیا۔ جو مسلمانوں میں قومیت اور سیاست کے تعلق سے شکوک وشبہات پیدا کرنے کا سبب بنا۔ لاکھوں روپیہ مسلمانوں میں کانگریس کا پیغام پہنچانے کے لیے صرف کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے کچھ مذہبی علماء کو مستعد کیا گیا۔ جو دیہاتوں میں جاکر سیدھے سادے مسلمانوں کو مذہبی تقدس اور کفر کے فتووں سے ڈرا کر کانگریس کا ہم خیال بناتے۔ کانگریس کی مسلم عوام سے رابطے کی مہم بھی نہرو کی جدتِ خیال کا سبب تھی۔ یہ مہم شد و مد سے جاری رہی۔ کیونکہ متعدد صوبوں میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ وہاں کانگریس با اقتدار تھی۔ جب کانگریسی وزارتوں نے کام شروع کیا تو مسلمانوں کے ساتھ کہیں بھی انصاف نہ کیا گیا۔ بلکہ وہ سارے عزائم جو کھل کر ظاہر نہ ہوتے تھے اب اعلانیہ سامنے آئے۔ ان سے بجا طور پر مسلمانوں کو اپنی تہذیب کے مستقبل کا خطرہ تھا۔ کانگریس نے تعلیم کے لیے "وارد ھا منصوبہ" منظور کیا تھا۔ یہ گاندھی کے نظریات پر مبنی تھا۔ جس میں مسلمانوں کے مذہب اور ان کی ثقافت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کیا گیا تو وہ اور بھی ہندوانہ اور اسلام دشمن ہو گیا۔ بہت سے اسکولوں میں مسلمان بچوں سے کہا جاتا تھا کہ وہ گاندھی کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہیں یا پوجا کریں۔ مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود یہ منصوبہ نافذ کر دیا گیا۔ صوبۂ متوسط میں اسکولوں کا نام "ودیا مندر" رکھا گیا، نصابی کتابیں ہندی زبان اور ہندوانہ تہذیب و تاریخ کے مضامین پر مشتمل ہوتیں۔ مسلمان بچوں کو جن کی زبان اردو تھی، جبراً ہندی پڑھائی جاتی اور ہندو روایات سکھائی جاتیں۔

ملازمتوں اور سہولتوں کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا یا اس میں کسی تناسب کا خیال نہ رکھا جاتا تھا۔ کانگریسی حکومتوں کے مظالم کے نتیجے میں مسلم لیگ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے جو مسلمانوں پر کانگریس کے مظالم کی تحقیقات کرائے۔ خود مسلم لیگ نے ایک تحقیقاتی رپورٹ تیار کی۔ کانگریس اور ہندوؤں کے اس رویے سے مسلمانوں کا غصہ بڑھ گیا اور دونوں طرف اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔ اس رویے کے نتیجے میں مسلم لیگ نے بڑی مستعدی سے اپنی تنظیم کو دور دراز دیہاتوں میں پھیلا دیا۔ اس تنظیم نو کے بعد محمد علی جناح مسلمانوں کے قائد اعظم کی حیثیت سے ابھرے اور مسلم عوام نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وطنی قومیت اور اسلامی قومیت کا مسئلہ

مسلمانوں میں لامذہبیت پھیلانے اور ان کی مذہبی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے کانگریس نے جو سب سے زیادہ خطرناک ہتھیار استعمال کیا وہ اس کی وطنی قومیت کی تحریک تھی۔ اس زمانے میں یہ ایک جدید نظریہ تھا جس کے مطابق وطن کا درجہ خدا کے درجے سے کم نہیں۔ ایک وطن پرست کے نزدیک حب الوطنی خدا پرستی سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس نظریے کی رو سے حکومت غیر مطلق ہے اور انسان وطن اور حکومت کا کلی طور پر محکوم ہے۔ اس کا ہر عمل خواہ وہ کیسا ہی مذہبی فریضہ کیوں نہ ہو، اگر وہ وطن سے متصادم ہو تو بغاوت کے مترادف ہے۔ فرد حکومت کے لیے ہے نہ کہ حکومت فرد کے لیے۔ اس نظریے کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ مذہب اور سیاست دو علیحدہ علیحدہ شعبے ہیں۔ مذہب صرف انسان اور خدا کے انفرادی تعلق کا نام ہے اور سیاست کا تعلق حکومت سے ہے اور حکومت ہی قادرِ مطلق ہے۔ لہٰذا مذہب سیاست کے ماتحت ہے۔ یہی وہ نظریہ تھا جس کی اشاعت کانگریس کے ہر رہنما کا روزمرہ کا مشغلہ بن گیا۔ "بندے ماترم" کا گیت اسی وطن پرستی کا ایک انداز ہے جس میں وطن کو دیوی تسلیم کر کے لکشمی اور درگا وغیرہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس عقیدے کا نتیجہ تھا کہ بنارس میں ایک بھارت مندر تعمیر کیا گیا۔ جس میں بھارتی دیوی کی مورت کی پوجا کی جاتی لیکن اس میں کرشن اور رام کے بجائے گاندھی اور دوسرے رہنماؤں کے بت رکھے گئے۔

مغربی اقوام نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی وحدت کو تقسیم کرنے کے لیے اسی وطن پرستی کے نظریہ سے فائدہ اٹھایا تھا۔ عراق، فلسطین اور ترکوں کی ہم آہنگی اور اتحاد کا اسی تصور کی وجہ سے خاتمہ ہوا۔ اسی نظریے سے مغربی اقوام نے مسلمانانِ عالم کی مرکزیت اور وحدت کو جس طرح پارہ پارہ کیا تھا اب کانگریس ہندوستان میں مسلمانوں کی وحدت کو ختم کرنے اور ان کا بیرونِ ہند کے مسلمانوں سے سیاسی و مذہبی تعلق ختم کرنے کے لیے اسی حربے کو اختیار کر رہی تھی۔ اس نے باقاعدہ علمی اور فکری حیثیت سے اسلامی نظریہ حیات کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنا اور انہیں کبھی کم ہمتی، انگریز دوستی اور احساسِ کمتری کے طعنے دے کر اور کبھی بہادر اور جری قوم کے الفاظ سے مخاطب کر کے انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی کہ وہ کانگریس کے متحدہ قومیت اور وطنی قومیت کے تصور اور نظریے کو قبول کر لیں۔ اسے اس حد تک کامیابی ضرور ہوئی کہ خود مسلمانوں میں سے علماء کا ایک طبقہ اس کے نظریات و مقاصد سے متفق ہو کر اس کی تحریک میں شامل ہو گیا اور لاشعوری طور پر ہندو راج کیلیے زمین ہموار کرنے لگا۔

تحریکِ خلافت میں کانگریس کی مصلحت آمیز اور خود غرضانہ شرکت نے "مصنوعی اتحاد" کا جو نمونہ پیش کیا تھا اسے علماء کے اس گروہ نے متحدہ قومیت کے تصور کی دلیل کے طور پر پیش کیا۔ اس دلیل اور نظریے کے توسط سے کہا جا رہا تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کی تمام قومیتوں اور قومی امتیازات کو مٹا کر پوری ہندوستانی آبادی کو ایک قوم بنا دیا جائے۔ اسی مقصد کے لیے "وار دھا کا تعلیمی منصوبہ" اور "ودیا مندر منصوبہ" نافذ کیا گیا۔ اور بڑے پیمانے پر "مسلم رابطہ مہم" شروع کی گئی۔ کانگریس کے ماتحت جو شعبۂ اسلام تشکیل دیا گیا اور جہاں سے ان نظریات کی پیروی میں بے شمار کتابیں شائع ہوئیں، وہ کانگریسی علماء تحریر کرتے۔ علماء کو سفر خرچ کے طور پر مستقل وظیفہ بھی جاری ہوا۔ چنانچہ کانگریسی خیالات کے حامل متعدد علماء اس تصنیفی و تبلیغی کام میں مستعد ہوئے۔

متحدہ قومیت اور وطنی قومیت کی اس بحث میں اس نظریے کے مقابلے میں راسخ الخیال اور ثبت فکر کے حامل علماء نے اسلامی قومیت کے نظریے کو پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ ان کی اس ثبت کوشش سے یہ نکتہ واضح ہو کر ابھرا کہ اسلام ہی مسلمانوں کا وطن ہے اور یہی مسلمانوں کی قومیت ہے۔ اس اعتبار سے دنیا میں صرف دو ہی قومیں آباد ہیں۔ ایک مسلمان اور دوسری غیر مسلم۔ اس نظریے کو بڑی شد و مد کے ساتھ عام کرنے والوں میں مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی محمد شفیع، مولانا مودودی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور پھر خاص طور پر علامہ اقبال زیادہ نمایاں ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کی بیداری میں اقبال کا حصّہ

تاریخ میں بہت کم شاعر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اتنا گہرا اثر ڈالا ہو جتنا علامہ اقبال نے خصوصاً برِعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں پر ڈالا۔ تیرھویں صدی میں جو کام مولانا روم نے اپنی مثنوی کے ذریعے انجام دیا تھا، اسے بیسویں صدی میں علامہ اقبال نے اپنی فکر اور اپنی شاعری کے ذریعے آگے بڑھایا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی پر ان کے اثرات یورپ سے ان کی واپسی کے بعد مرتب ہونے شروع ہوئے۔ ان کی مثنوی "اسرارِ خودی" کی اشاعت اور "انجمن حمایتِ اسلام" کے جلسوں میں ان کی روح پرور شرکت نے فکرِ اقبال ہی کے نئے دور کا آغاز نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کی قومی زندگی کے نئے باب کا افتتاح بھی کیا۔ علامہ اقبال نے اپنا پیغام نظم اور نثر دونوں طریقوں سے پیش کیا اور بالآخر عملی سیاست میں شرکت کر کے تعبیر اور تدبیر کے عمل میں مؤثر کردار ادا کیا۔ ان کے پیغام اور ان کی کوششوں کو اسلامی فکر کی تشکیلِ نو، ملت کی مزاجی کیفیت کی نئی تعمیر، ایک آزاد قوم کے احیاء اور ایک عظیم اسلامی مملکت کے قیام کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کی ابتدا ہندوستانی قوم پرستی کے جذبات سے کی۔ وطن کی تعریف میں نظمیں لکھیں اور ہندو مسلم اتحاد کے خیالات پیش کیے۔ لیکن فکر کی پختگی کے بعد ان کے خیالات میں بڑا نمایاں انقلاب رونما ہوا اور انہوں نے ہر قسم کی قوم پرستی کی مذمت کی۔ انہوں نے اسے سب سے زیادہ تباہ کن اور مذہب کا مخالف بتایا۔ اپنے اس قسم کے خیالات اور اپنی فکر کو علامہ اقبال نے اولاً "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" اور پھر "جاوید نامہ" اور "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کے ذریعے پیش کیا۔ "اسرارِ خودی" میں مسلمانوں کے جمود اور زوال کے اصل اسباب کی نشاندہی کی اور تصوف پر یونانی اور ایرانی اثرات کی وجہ سے مسلمانوں پر جو منفی تصور مسلط ہو گیا تھا، اس کی تباہ کاریوں کو بیان کیا اور ترکِ دنیا کی جگہ تعمیرِ حیات کا عین اسلامی تصور اجاگر کیا۔ "اسرارِ خودی" کا مرکزی تصور ایمان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی قوت سے ایک نئے انسان "مردِ مومن" کی تشکیل ہے۔ "رموزِ بے خودی" میں فرد اور ملت کا تعلق، اجتماعی نصب العین، خلافتِ الٰہیہ کی توحیت اور خودی کی تعمیر اور قومی تشخص کی دریافت جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

"جاوید نامہ" میں مشرق و مغرب کی نمائندہ شخصیات کی زبان سے آج کی دنیا کے حالات، مسائل، افکار اور مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے نقوش نمایاں کیے گئے ہیں۔ "پس چہ باید کرد" میں مغربی تہذیب کے چیلنج کا مطالعہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مغرب کی ترقی کا اصل سبب کیا ہے اور مغربی تہذیب کے روشن اور تاریک پہلو کیا ہیں۔ مغرب کی اندھی تقلید کے خطرے سے قوم کو خبردار کیا گیا ہے اور ترقی کی اصل راہ دکھائی گئی ہے۔ "پیامِ مشرق" اور "ارمغانِ حجاز" میں یہی پیغام دوسرے انداز میں بیان ہوا ہے۔ یہی فکر اور پیغام ان کے اردو کلام میں بھی نظر آتا ہے۔ خصوصیت سے "بانگِ درا" کی قومی نظموں، "بالِ جبریل" کے ولولہ انگیز تغزل اور "ضربِ کلیم" کے گرجدار لہجے میں اقبال اپنی بھرپور شخصیت کے ساتھ موجود ہیں۔

علامہ اقبال گو کہ ساری قوم بلکہ پوری انسانیت سے مخاطب تھے لیکن خصوصیت کے ساتھ انہوں نے قوم کے ذہین اور بااثر تعلیم یافتہ طبقے سے خطاب کیا۔ اپنے افکار اور اپنے پیغام کے لیے انہوں نے بنیادی طور پر شعر کو ذریعہ بنایا اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک شکست خوردہ اور محکوم قوم کو حرکت اور جدوجہد پر ابھارنے کے لیے فکری غذا کے ساتھ ساتھ جذباتی توانائی کی ضرورت تھی۔ وقت کی ضرورت محض عقل کو مطمئن کرنا نہ تھی بلکہ یہ بھی تھی کہ جذبات میں ہیجان پیدا کر کے اس جمود کو توڑا جائے جو ملت پر مسلط تھا۔ ایک طویل عرصے سے ملتِ اسلامیہ عقیدے سے تو سرشار تھی مگر اس میں وہ حرکت اور حرارت نہ تھی جو جذبے کو بے عملی اور مایوسی کے بجائے اضطراب اور بے چینی سے آشنا کرتی۔ علامہ اقبال نے اسی جذباتی کیفیت میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے شعر کا مؤثر ذریعہ اختیار کیا۔ وقت کے فکری اور جذباتی رجحان کو تبدیل کرنے میں ان کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا حل۔ اقبال کی نظر میں

علامہ اقبال بیسویں صدی میں ملتِ اسلامیہ کے ذہن کے اولین معمار ہیں۔ اسلامی فکر کی تشکیل جدید اور وقت کے فکری اور جذباتی رجحان کو تبدیل کرنے میں ان کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے انحطاط کے حقیقی اسباب کا جائزہ لیا تھا اور ان کی تشخیص کے بعد اصلاح کی جو تشریح و توضیح کی ہے اس کی امتیازی خصوصیت اس کا حرکی اور انقلابی پہلو ہے۔ اپنے مقاصد کے تحت انہوں نے ایک تو اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کی اور اسلامی قومیت کے تصور کو اجاگر کیا اور دوسرے مغربی افکار اور ان کے زیرِ اثر رونما ہونے والی مختلف تحریکوں پر سخت تنقید کی اور قوم کو تمدنی اور سیاسی اعتبار سے اسلام کی تعلیمات کو اختیار کرنے کی تلقین کی اور اس کے جذبۂ عمل کو بیدار کیا۔ ان کے خیالات نے برعظیم کے مسلمانوں میں اتحادِ اسلامی کے جذبات کو تقویت پہنچائی جو کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں مقبول ہو رہے تھے۔

علامہ اقبال کی شاعری اور فکر کا اہم دور ۱۹۱۵ء میں اسرارِ خودی کی اشاعت سے ہوا ہے اور ۱۹۳۰ء میں تصورِ پاکستان کے اظہار سے اس میں ایک نمایاں اور انقلاب آفریں موڑ رونما ہوا ہے۔ یہی دور عالمِ اسلام کے لیے نہایت ابتلا و انتشار کا حامل تھا۔ علامہ اقبال پر عالمِ اسلام کی ساری بے چارگی اور بے بسی واضح تھی۔ اور اس کے پس منظر میں مغربی طاقتوں کی جو ریشہ دوانیاں، جارحیت اور اسلام دشمنی کارفرما تھی وہ ان سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ سیاسی اور تہذیبی مسائل کو وہ ایک مفکر شاعر کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ قیامِ یورپ کے مشاہدات نے ان کی فکر و نظر میں وسعت پیدا کی تھی اور مسلم ممالک کے مسائل و حادثات سے ہم آہنگ ہونے کے بعد اس میں مفکرانہ گہرائی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ملی نقطۂ نظر سے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ اب ان کی توجہ زیادہ تر مستقبل کے امکانات پر تھی۔ علامہ اقبال کا یہ ایک اہم کام تھا کہ انہوں نے اسلامی قومیت کے حقیقی تصور کو اجاگر کیا اور اس طرح مسلمانوں میں اتحادِ اسلامی کے جذبات کو تقویت پہنچائی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عالمِ اسلام کا انتشار علامہ اقبال کے خیال میں اہلِ مغرب کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ مغربی اقوام کی کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے اور انہیں متحد نہ ہونے دیا جائے۔ ان خیالات کے مطابق علامہ اقبال نے عالمِ اسلام کے اتحاد پر زور دیا۔ خواہ یہ اتحاد ایک عالمگیر ریاست کی صورت میں ہو یا مختلف اسلامی ریاستوں کی صورت میں۔ انہوں نے تمام مسلمانوں کے لیے ایک مرکز پر بھی غور کیا۔ اور دوسرے انہوں نے جمال الدین افغانی کے اس تصور کو بھی تسلیم کیا کہ مکہ معظمہ مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کا مرکز رہے۔ اپنے ان خیالات کے تحت علامہ اقبال نے ہر قسم کی قوم پرستی کی مذمت کی اور اسے سب سے زیادہ کن اور مذہب کے منافی بتایا۔ انہوں نے کہا کہ ایک مسلمان قوم پرست نہیں ہو سکتا۔ خواہ اس کا وطن ایک مسلم ملک ہی کیوں نہ ہو۔ انہوں نے اس خیال کو بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیا کہ مسلم ملت زمان و مکان میں محدود ہے۔ دنیائے اسلام کے ناقابلِ تقسیم ہونے کے نظریے پر زور دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مسلمان اپنے آپ کو ترکوں، عربوں، ہندوستانیوں، ایرانیوں اور افغانیوں میں تقسیم نہ کریں۔ ہندوستان کے مسلمان بھی اقبال کو انہیں امراض میں مبتلا نظر آتے جن سے دنیائے اسلام کے دیگر مسلمان دوچار تھے۔ علامہ اقبال کو اپنی اور اپنی قوم کی محکومی کا شدید احساس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا یہ احساس عام ہو جائے۔ چنانچہ ان کی شاعری کا زیادہ تر حصہ درسِ خود آگاہی، آزادی اور پیغامِ عمل پر مشتمل ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا حل ان کی نظر میں صرف آزادی حاصل کرنے ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام میں تھا۔ ۱۹۲۸ء میں "نہرو کمیٹی" کے سامنے انہوں نے تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر اپنے تاریخ ساز خطبے میں انہوں نے ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کو ہندوستانی مسلمانوں کے قومی مسائل کا واحد حل قرار دیا۔ اسی خیال کو علامہ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں نیشنل لیگ لندن کے جلسے میں اور ۱۹۳۷ء میں قائداعظم کے نام متعدد خطوط میں زیادہ وضاحت سے پیش کیا۔ یہ ان کا عین مطمحِ نظر تھا کہ ہر قوم کے لیے ایک ملک ضروری ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزاد اسلامی مملکت کے تصور کا ارتقاء

انگریزوں اور ہندوؤں کے رویے سے مجبور ہو کر ایک عرصے سے مسلمان اپنے لیے برعظیم میں ایک آزاد اسلامی مملکت کے حصول کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ سید احمد خان سے لے کر علامہ اقبال تک کئی ملکی اور غیر ملکی مسلم اور غیر مسلم افراد نے آزاد اسلامی مملکت کے تصورات پیش کیے تھے۔ سید احمد خان نے کسی علیحدہ مسلم مملکت کا تصور پیش نہیں کیا لیکن ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ مفادات اور مقاصد ضرور متعین کیے تھے۔ ابتداءً جمال الدین افغانی نے ایک مسلم جمہوریہ کا خواب دیکھا تھا جس میں مرکزی ایشیا کی ریاستیں، افغانستان اور برعظیم کے شمال مغرب کے مسلم اکثریتی علاقے شامل تھے۔ ۱۸۸۳ء میں اسکاون بلنٹ نے کلکتہ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ شمالی ہند کے تمام صوبوں کو عملی طور پر مسلم حکومت کے تحت دیدیا جائے۔ اپنے زمانے کے حالات سے مجبور ہو کر عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالے "مہذب" کے اداریے میں اگست ۱۸۹۰ء میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ صوبوں کی تقسیم کے سلسلے میں خیری برادران نے ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی اصطلاح استعمال کی اور پہلی جنگِ عظیم کے دوران ہندوستان کی اسی انداز میں تقسیم کا منصوبہ پیش کیا۔ ۱۹۲۰ء میں عبدالقادر بلگرامی نے بدایوں کے اخبار "ذوالقرنین" میں ایک کھلی چٹھی گاندھی کے نام شائع کرائی تھی جس میں زور دیا تھا کہ برعظیم کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اضلاع کی ایک فہرست بھی دی جو مغربی اور مشرقی پاکستان کی حدود سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس دوران معتدل مسلم رائے بھی تقسیم ہند کے تصور کی طرف مائل ہوتی رہی۔ مسلمانوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ انکی جداگانہ انفرادیت باقی رہے۔ سردار محمد گل خان نے ۱۹۲۳ء میں ایک سرسری تحقیقاتی کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے اس خیال پر زور دیا تھا کہ ہندوستان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے اور اگر یہ منصوبہ قابلِ عمل بنایا جا سکے تو پشاور سے آگرہ تک کا علاقہ مسلمانوں کو دیدیا جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۹ء کے درمیان جداگانہ مسلم ریاست کا تصور کافی قوی ہو چکا تھا۔ کل جماعتی کانفرنس کا جو اجلاس ۱۹۲۸ء میں منعقد ہوا تھا، اس میں آغا خان نے ہر ہندوستانی صوبے کے لیے مکمل خود مختاری پر اصرار کیا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں "ہندوستانی مسلمان" کے نام سے ایک کتابچہ انگریزی زبان میں شائع ہوا جس کے مصنف نے اپنے نام کے بجائے "ایک ہندوستانی مسلمان" لکھا، اس میں مصنف نے ہندو اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ قومیتوں کی بنیاد پر ایک دستور کا مطالبہ کیا۔ کانگریس سے مایوس ہونے کے بعد مولانا محمد علی نے ہندو واحدوں کے ساتھ ایک وفاقی ڈھانچے میں مسلم اکثریتوں کی خود مختاری پر بار بار زور دیا۔ مرتضیٰ احمد خان میکش نے روزنامہ "انقلاب" میں مسلسل مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں انہوں نے لکھا کہ ہندو مسلم مسئلے کا واحد حل مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک کا قیام ہے جو پنجاب، سندھ اور بلوچستان اور صوبہ سرحد پر مشتمل ہو۔

اب ضروری ہے کہ علامہ اقبال کے تصور کا ذکر کیا جائے۔ شاعر فلسفی اقبال نے لیگ کے سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۳۰ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ "پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ حکومت خود اختیاری خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا اس کے باہر مجھے ایک متحدہ شمال مغربی ہندوستانی مسلم ریاست کی تشکیل مسلمانوں کا آخری مقدر معلوم ہوتی ہے"۔ تیسری گول میز کانفرنس میں انہوں نے اس رائے کا اعادہ کیا کہ برعظیم میں کوئی مرکزی حکومت نہیں ہونی چاہیے۔ اور صوبے خود مختار و آزاد مملکتیں ہوں۔ چودھری رحمت علی نے ۱۹۳۳ء میں مسلم اکثریت پر مشتمل علاقوں میں "پاکستان" کے نام سے ایک ریاست قائم کرنے کا تصور پیش کیا۔ اس تصور کی رو سے پنجاب، کشمیر، سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد اور بنگال و آسام پاکستان کے علاقے قرار پاتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے برعظیم کے تمام مسلمانوں کے لیے، خواہ وہ اکثریتی صوبوں میں آباد تھے یا اقلیتی صوبوں میں، جداگانہ قومی مملکتوں کا دعویٰ کیا۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے دو اساتذہ ڈاکٹر ظفر الحسن اور ڈاکٹر افضال حسین قادری نے قومیتوں کی بنیاد پر ہندوستان کو ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس اصول کی بنیاد پر برعظیم کو تین مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ریاستوں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ مولانا عبد الودود نے مشرقی افغانستان کا خیال پیش کیا جس کا مطمح نظر شمالی ہند میں کلیۃً مسلمانوں کے لیے ایک مسلم ریاست کا قیام تھا۔ مولانا مودودی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے تین متبادل صورتوں کی ایک تجویز تہذیبی منطقوں کے تعین، تہذیبی وحدتوں کے ایک وفاق یا پھر تقسیم ملک کے اصول پر مبنی پیش کی۔ مولانا آزاد سبحانی نے حکومتِ ربانی کی تجویز اور افضل حق نے حکومتِ الٰہیہ کا تصور پیش کیا۔ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے خلافتِ پاکستان کی تجویز پیش کی، جس میں سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد، پنجاب، کشمیر، صوبجاتِ متوسط، صوبجاتِ متحدہ کے بعض حصے اور برار کے علاقے شامل تھے۔ اس کی حدیں گنگا کے ساتھ ساتھ بنگال اور آسام تک پہنچتی تھیں۔ ان سب سے آگے بڑھ کر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں لیگ کے سالانہ اجلاس میں وہ مشہور قرارداد منظور ہوئی جسے مطالبے کی صورت میں عوام نے "قراردادِ پاکستان" کا نام دیا اور حصولِ پاکستان کے لیے جدوجہد شروع کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قراردادِ پاکستان

سنہ ۱۹۴۰ء کا سال برعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی و قومی زندگی میں نہایت اہم اور انقلاب آفریں ثابت ہوا۔ اس سال مسلم لیگ نے ہندوستان میں ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ ۲۳ مارچ کو لاہور میں مسلم لیگ کے ایک عظیم الشان سالانہ اجلاس میں پیش کیا گیا۔ اس وقت تک برعظیم کے مسلمانوں میں ایک آزاد اسلامی مملکت کا تصور عام ہو چکا تھا اور اب وہ اسے اپنے قومی اور سیاسی مسائل کا واحد حل سمجھنے لگے تھے۔ اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے محمد علی جناح کو مسلمانوں میں قائداعظم کی حیثیت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ قراردادِ پاکستان کے پیش کیے جانے سے کچھ ہی دن قبل لندن کے ایک جریدے میں قائداعظم کا ایک بہت اہم مضمون شائع ہوا جس کے آخری حصے میں انہوں نے لکھا کہ ہندوستان کے لیے ایک ایسا آئین وضع کرنا چاہیے جو اس حقیقت پر مبنی ہو کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں اور جس کی رو سے دونوں قومیں حکومت میں برابر کی حصہ دار ہوں۔

تقریباً نصف صدی تک قائداعظم ہندو مسلم اتحاد کے سفیر رہے تھے اور اس اتحاد کو فروغ دینے کے لیے بڑی جدوجہد کی تھی۔ لیکن اب ان کے خیالات میں انقلاب آچکا تھا اور وہ ہندوستان کو تقسیم کرانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ ان میں اس بات کی غیر معمولی صلاحیت تھی کہ اگر وہ کسی تصور کو ایک دفعہ قبول کر لیتے تو اس پر قائم رہتے اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں جن دقتوں اور رکاوٹوں کا اندیشہ ہوتا ان کا قطعاً خیال نہ کرتے۔ اسی یکسوئی اور پامردی میں ان کی قوت و اعتماد کا راز پنہاں تھا۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کی سندھ شاخ نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی اور لیگ سے سفارش کی تھی کہ ایسی دستوری تجاویز مرتب کی جائیں جن کے تحت مسلم اکثریتی صوبے اپنے وفاق کی صورت میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔ اسی اجلاس میں قائداعظم کو اس بات کا اختیار دیا گیا کہ وہ ایسا لائحہ عمل تیار کریں جس کے ذریعے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ سب کچھ اس بات کی صاف علامات تھیں کہ مسلمان اب اپنے مقاصد میں برابر آگے بڑھ رہے تھے اور اب خود کو اقلیت سمجھ کر تحفظات اور رعایتوں کی بھیک نہیں مانگ رہے تھے۔ ان کے سیاسی فکر کی رسائی بلند ہو گئی تھی اور ان کے سیاسی مقاصد میں کوئی پیچیدگی نہ رہی تھی۔ یہ بات صاف تھی کہ اگر مسلمان متحد ہو جائیں تو وہ ایک عظیم قوت بن سکتے ہیں۔ قائداعظم ان کے مستقبل سے پر امید تھے اور انہیں یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی قیادت ان کا مقدر بن چکی ہے۔ اب ان میں ایک نئی قوت اور ایک نیا عزم پیدا ہو گیا تھا۔ وہ انتہائی خلوص اور لگن کے ساتھ حصولِ مقصد کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ انہوں نے لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی جس میں وہ تاریخی مطالبہ پیش کیا گیا جو بعد میں "قراردادِ پاکستان" کے نام سے مشہور ہوا۔

اپنی صدارتی تقریر میں قائداعظم نے نہایت واضح الفاظ میں دو قومی نظریے پر روشنی ڈالی اور اس غلط فہمی کی تردید کی کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان قومیت کی ہر تعریف کی رو سے ایک قوم ہیں، ان کا ایک علاقہ اور ایک وطن ہونا چاہیے۔ ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس مسئلے کو بین الاقوامی سمجھ کر حل کرنا چاہیے۔ اگر برطانوی حکومت یہ چاہتی ہے کہ ہندوستانیوں کو امن اور سکون حاصل ہو تو اس کی صرف ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے جداگانہ قومی وطن منظور کیے جائیں۔

لیگ کے اس تاریخی اجلاس میں مسلم ہندوستان کے بیشتر سرکردہ رہنما شریک تھے اور حاضرین کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق پچاس ہزار سے زائد تھی۔ اے۔ کے فضل الحق نے اس موقعہ پر وہ تاریخی قرارداد پیش کی جسے لیگ کی ایک ذیلی مجلس نے مرتب کیا تھا۔ اس قرارداد کے اہم حصے میں کہا گیا تھا کہ "ہندوستان کے آئینی مستقبل کے متعلق مسلمانوں کو وہی تجویز قابلِ قبول ہو گی جس کے تحت صوبائی سرحدوں میں ضروری ردوبدل کر کے ملک کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ ان علاقوں میں آزاد ریاستیں قائم ہو سکیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یعنی ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی خطے۔ ان ریاستوں میں جو صوبے شامل ہوں گے ان کو مکمل خود مختاری اور اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو گا۔"

اس قرارداد نے برعظیم کے مسلمانوں میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ مسلمانوں نے جب ایک متعین مقصد کی حیثیت میں اس نظریے کو اختیار کر لیا تو ان کی جدوجہد آزادی ایک نہایت اہم مرحلے میں داخل ہو گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم لیگ کی جدوجہد کا نیا دور

"قرارداد پاکستان" مسلمانوں کے عقیدے کا ایک جزو بن چکی تھی۔ مگر انھوں نے اپنی جو منزل متعین کی تھی اس تک پہنچنے کے لیے انہیں ابھی بہت دور چلنا تھا۔ ہندوؤں کا ردعمل بہت ہیجانی تھا، انہوں نے جتنی زیادہ قوت اور شدت سے مخالفت کی مسلمانوں کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی احساس ہوتا گیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ میں حائل خلیج مزید وسعت اختیار کر گئی۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوتے ہی ہندوستان کی سیاسی فضا میں بھی ہلچل پیدا ہو گئی۔ مسلم لیگ نے ستمبر ۱۹۳۹ء میں حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ کوئی بھی آئینی منصوبہ لیگ کی صلاح و مشورے اور منظوری کے بغیر ہندوستان میں نافذ نہ کیا جائے۔ ۲ر جون ۴۰ء میں قائداعظم نے وائسرائے سے ملاقات کی اور اسے آگاہ کیا کہ مسلم لیگ حکومت سے جنگ میں صرف اس صورت میں تعاون کرے گی جب کہ ہندوستان میں کوئی بھی مستقل یا عبوری آئینی ڈھانچہ لیگ کی منظوری کے بغیر نافذ نہ کیا جائے۔ کچھ دن کے بعد قائداعظم نے حکومت کو یہ بھی تجویز کیا کہ حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ایسا کوئی اعلان نہیں ہونا چاہیے جو کسی طرح اس بنیادی اصولوں کے خلاف ہو جو ہندوستان کی تقسیم اور شمال و مغرب اور مشرق میں مسلم ریاستیں قائم کرنے کے لیے "قراردادِ پاکستان" میں طے کر دیے گئے ہیں۔ وہ نصب العین اب مسلم ہندوستان کا عام عقیدہ بن گیا ہے۔ وائسرائے نے ان تجاویز کے ایک حصے کو تسلیم کر لیا چنانچہ مسلم لیگ نے اس کو اپنے اس موقف اور نقطہ نظر کی کامیابی قرار دیا جو اس نے "قراردادِ پاکستان" میں اختیار کیا تھا۔

مسلمانوں کے لیے اب ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام صاف اور معین مقصد تھا اور اس کے لیے ان میں بڑا جوش پایا جاتا تھا۔ ایک سمجھدار طبقہ اس کے لیے منصوبے، نقشے اور خاکے بنانے میں منہمک ہو گیا۔ مسلم لیگ بہت زیادہ منظم اور فعال ہوئی۔ اس کی شاخیں اپنی اپنی تنظیم کو درست اور مستعد کرنے میں لگ گئیں۔ رضاکاروں کی جمعیتیں تشکیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پانے لگیں اور انہوں نے اپنے آپ کو لیگ کے ضوابط کے مطابق منظم کرنا شروع کیا۔ لیگ کی مرکزی مجلسِ عاملہ نے ایک قرارداد میں طے کیا کہ ہر سال ۲۳ مارچ کا دن مسلم لیگ یومِ پاکستان کے طور پر منائے۔ اس دن "قراردادِ پاکستان" کے اصولوں کی تشریح کی جائے اور تمام مسلمانوں پر واضح کیا جائے کہ تمام قومی اور سیاسی مسائل کا یہی واحد حل ہے۔ ایک اور قرارداد میں یہ طے کیا گیا کہ ہر تیسرے مہینے صوبائی اور ضلعی لیگیں ہفتۂ مسلم لیگ منائیں جس میں مسلم لیگ کے مقاصد اور لائحہ عمل کی وضاحت کی جائے، مسلم لیگ کے لیے رکنیت سازی کی جائے اور مسلمانوں کی اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے لیے تعمیری کام کیے جائیں۔

اس دوران مسلم لیگ کا مزاج بہت مشتعل رہا۔ وہ حکومتِ برطانیہ کی بے اعتنائیوں اور بدعہدیوں پر شدت سے تنقید بھی کرتی رہی اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی تنظیم کی طرف اس نے اپنی توجہ اور زیادہ بڑھا دی۔ جنگِ عظیم کے خطرات پر بھی اس کی مسلسل نظر رہی۔ اور چونکہ جاپان بھی جنگ میں شریک ہو چکا تھا اس لیے مسلمانوں کو، لیگ کی شاخوں کو اور نیشنل گارڈز کو اس نے ہدایت کی کہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔

جنگ کے دوران میں قائداعظم نے تعاون کے مسئلہ پر ایک متوازن رویہ قائم کیے رکھا۔ "قراردادِ پاکستان" کے بعد حالات میں ایک اصولی تبدیلی آئی جس کے مضمرات مطالبۂ پاکستان کی بڑھتی ہوئی قوت اور شدت کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے۔ اب مسلم لیگ کا اصل مقصد صوبائی وزارتیں چلانا نہ تھا بلکہ پاکستان حاصل کرنا تھا اور مطالبۂ پاکستان کے لیے سیاسی جنگ اس بات کا تقاضہ کرتی تھی کہ صوبائی اسمبلیوں کی مسلم لیگ پارٹیاں بھی مطالبۂ پاکستان کی تائید میں مثبت کردار ادا کریں اور جو وزارتیں مسلم لیگ پارٹیوں کی حمایت اور پشت پناہی پر بھروسہ کرتی تھیں وہ بھی لیگ کی مرکزی قیادت کے ساتھ اپنے آپ کو عملاً اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ وابستہ کریں۔ یہ قیادت اور تنظیم کے اعتبار سے مسلم لیگ کا نیا دور ہی تھا کہ اس نے جن ضمنی انتخابات میں بھی حصہ لیا، سوائے ایک آدھ کے تمام نشستیں اس کے امیدواروں نے جیتیں۔ مرکزی اسمبلی میں بھی مسلمانوں کی تیس نشستوں میں سے اٹھائیس نشستیں لیگ کے قبضہ میں تھیں۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلمان ہر لحاظ سے آگے بڑھ رہے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرپس مشن کی تجاویز ——— اور مسلمان

دوسری جنگِ عظیم کے شروع ہونے سے ہندوستان کی سیاسی فضا میں بھی ایک ہیجان پیدا ہوا۔ یہ جنگ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی تھی اور برطانیہ اس میں شریک تھا۔ چنانچہ ۳ ستمبر کو وائسرائے نے ہندوستان کی طرف سے بھی جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس طرح ہندوستان کو بھی اس جنگ میں برطانیہ کے حلیف اور جرمنی کے مخالف کی حیثیت سے ملوث ہونا پڑا۔ ہندوستانی رہنماؤں نے اس شرط کے ساتھ جنگ میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے اور اس سے بڑھ کر کانگریس کا یہ مطالبہ تھا کہ مرکز میں قومی حکومت قائم کر دی جائے۔ جنگ کے زمانے میں چرچل برطانیہ کے وزیراعظم بنے۔ لیکن ان کی ذہانت اور شجاعت کے باوجود جرمنی کے مقابلے میں برطانیہ پے در پے شکستوں کی زد میں تھا اور جاپان کی مسلسل پیش قدمی اس کے لیے پریشان کن تھی، کیونکہ جاپان ہندوستان کی سرحد تک پہنچ چکا تھا۔ حکومت اس کے لیے بے قرار تھی کہ پورا ہندوستان متحد ہو کر جنگ میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ اس موقعے پر وائسرائے اور حکومتِ برطانیہ کے مابین صلاح و مشورہ ہوتا رہا کہ ہندوستان کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔ مگر کانگریس کی ہٹ دھرمیاں کسی صورت ختم نہ ہوئیں۔ اس صورتِ حال میں چرچل نے وزارت کے ارکان کی ایک خاص کمیٹی تشکیل دی جس کا نام "انڈیا کمیٹی" رکھا۔ اس کے صدر مسٹر ایٹلی تھے، جو کانگریس نوازی اور ہندو دوستی میں مشہور ہوئے۔ اس کمیٹی کے مشورے سے حکومتِ برطانیہ نے یہ طے کیا کہ سر اسٹیفرڈ کرپس کو، جو اس کمیٹی کے ایک رکن تھے، ہندوستان بھیجا جائے۔ وہ مختلف الخیال جماعتوں کے رہنماؤں سے گفتگو کر کے ان کے درمیان اتفاق اور تعاون کے لیے کوئی بنیاد پیدا کریں۔ حکومت یہ چاہتی تھی کہ مختلف قوموں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور آئندہ دستورِ اساسی کی تشکیل کی ذمہ داری خود ہندوستانیوں پر عائد ہو۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۲ء میں سر اسٹیفرڈ کرپس کو نئی تجاویز دے کر ہندوستان بھیجا گیا۔ وہ اس سے دو سال قبل بھی ہندوستان آئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے اور قائداعظم سے ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ قائداعظم کو ان سے کوئی بہتر امید نہیں تھی کیونکہ وہ ان سے گفتگو کر کے مایوس ہو چکے تھے۔

سر اسٹیفرڈ کرپس نے ہندوستان آ کر تمام اقوام کے رہنماؤں سے گفتگو کی اور پھر اعلان کیا کہ "حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان میں حکومتِ خود اختیاری کے قیام کے لیے واضح اور قطعی اصول مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حکومت کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک نئی وفاقی مملکت قائم کی جائے جس کو دولتِ مشترکہ کے دوسرے ممالک کی طرح ماتحت ریاست کا درجہ حاصل ہو۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ایک منتخب دستور ساز اسمبلی تشکیل دی جائے گی جس کا بنایا ہوا دستور حکومت فوراً منظور کر لے گی اور اسے نافذ کر دے گی۔" اس اعلان میں مسلمانوں کے مطالبے کا کوئی براہِ راست ذکر نہیں تھا مگر ہر صوبے کو یہ حق دیا گیا تھا کہ اگر اسے نیا آئین قبول نہ ہو تو وہ اپنی سابقہ آئینی حیثیت برقرار رکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے صوبوں کو یہ اختیار بھی دیا گیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو برطانوی حکومت ان کے لیے ایسا آئین وضع کر دے گی جس کی رو سے ان کو وفاقِ ہند کے برابر آزادی اور اختیارات حاصل ہوں۔ یہ تجویزیں خاصی معقول تھیں مگر چونکہ اس وقت برطانیہ شکست خوردگی کی طرف مائل تھا اور جنگ میں اس کے حالات بڑے غیر یقینی تھے۔ اس لیے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ان تجاویز کو خاص اہمیت نہ دی اور انہیں رد کر دیا۔ ہندوستانی یہ سوچ رہے تھے کہ مشن کا حقیقی مقصد محض ہندوستان کو جنگ میں دھکیلنا ہے۔ اس کے علاوہ کانگریس کو اس میں پاکستان کے قیام کا امکان نظر آ رہا تھا۔ مسلم لیگ اور قائداعظم کو اس سے یہ شکایت تھی کہ گو اس میں صوبوں کی علیحدگی کا تصور موجود تھا لیکن حکومتِ برطانیہ نے مسلمانوں کی بحیثیت قوم جداگانہ حیثیت واضح طور پر تسلیم نہیں کی۔ مسلم لیگ نے اس سلسلے میں واضح کر دیا کہ مستقبل کے بارے میں وہ کسی بھی تجویز کو اس وقت تک قبول نہیں کرے گی جب تک قراردادِ لاہور کے مطابق پاکستان کے قیام کی ضمانت نہ دی جائے۔ اور ہندوستانی مسلمان اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک ان کا حقِ خود ارادیت قطعی طور پر تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"ہندوستان چھوڑ دو" تحریک — اور مسلمان

کرپس مشن کی ناکامی نے ہندوستان میں عام مایوسی اور غصے کی ایک فضا پیدا کر دی۔ ہندوستانیوں کو شبہ تھا کہ چرچل کی وزارت نے صرف امریکی اور چینی دباؤ کی وجہ سے کرپس مشن کو ہندوستان بھیجا تھا ورنہ حکومت کو ہندوستان کی آزادی یا مسلمانوں کو ایک علیحدہ ملک دینے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو محض یہ فکر تھی کہ جنگ جیتنے کے لیے ہندوستان سے کس طرح زیادہ سے زیادہ امداد حاصل کی جا سکتی ہے۔ اب حکومت دنیا کو یہ دکھا سکتی تھی کہ خود ہندوستانیوں میں آپس میں اتحاد اور اتفاق رائے نہیں ہے اور یہی امر آزادی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب ہے۔ کانگریس اس صورتِ حال میں خاصی پریشان تھی۔ اس کے رہنما کرپس مشن کی تجاویز کو رد کر کے افسوس کی حالت میں تھے۔ کانگریس نے جو ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر رکھی تھی اب وہ خود اسی کے لیے پریشان کن ثابت ہو رہی تھی۔ جنگِ عظیم شروع ہوتے ہی صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے کانگریس نے یو۔پی، سی۔پی، بہار، مدراس اور اڑیسہ کی وزارتوں سے استعفا دے دیا تھا لیکن جب دیکھا کہ برطانوی حکومت پر استعفا کا کچھ اثر نہیں ہوا اور وہ کانگریس کی شرطیں ماننے کو تیار نہیں تو "انفرادی قانون شکنی" شروع کی گئی۔ کانگریسی راہنما ایک ایک کر کے سڑک یا بازار میں کھڑے ہو کر جنگ میں شریک نہ ہونے کے لیے نعرے لگاتے اور گرفتار ہوتے۔ لیکن یہ "انفرادی قانون شکنی" بھی آہستہ آہستہ اپنا زور کھو بیٹھی۔ کانگریسی رہنما حیران تھے کہ اب کیا کریں۔ کرپس کی تجاویز مسترد کر دینا ان کو غلط محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ملک بھر میں ایک سیاسی بحران پیدا ہو گیا۔ جو ایک تو ہندوستان کی اپنی سیاسی صورتِ حال کی وجہ سے تھا اور دوسرے جنگ کی وجہ سے بڑھ گیا تھا۔ اس موقعہ پر گاندھی نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلا دیا اور "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا آغاز کیا۔

آغازِ جنگ میں گاندھی کسی بھی تحریک کو شروع کرنا اپنے عدمِ تشدد کے فلسفے کے خلاف سمجھتے تھے لیکن اب جنگ کے نازک مرحلے پر وہ بہت ہی بڑی تحریک شروع کرنے کے درپے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاپانی فوجیں برما کو عبور کر چکی تھیں اور اب کلکتہ اور مدراس کا رخ کر رہی تھیں۔ اس حالت میں تحریک شروع کرتے ہوئے گاندھی نے جو بیان دیا تھا اس میں بظاہر تو کہا گیا تھا کہ جاپانی فوج انگریز دشمنی کی وجہ سے ہندوستان کی طرف آ رہی ہے۔ اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو جاپانیوں کے لیے ہندوستان پر حملہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے گی۔ لیکن اس تحریک کے پس منظر میں دراصل گاندھی اور کانگریس کی یہ حکمتِ عملی کارفرما تھی کہ اس شدید بحران اور ہنگامی حالت میں اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو حکومت اکثریت کے ہاتھ میں آجائے گی اور اس طرح ہندوستان پر رام راج قائم ہو جائے گا۔ چنانچہ کانگریس نے تحریک شروع کرنے کے لیے قرارداد منظور کر لی اور سارے ہندوستان میں تحریک کو پھیلا دیا گیا۔ اس تحریک کے دوران جو واقعات رونما ہوئے انہوں نے تشدد، قانون شکنی اور خوں ریزی سے سارے ملک کو بری طرح متاثر کیا۔

قائداعظم نے اس تحریک کے خلاف فوراً اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ اور ایک بیان میں کہا کہ کانگریس کی صاف طور پر نیت یہ ہے کہ ہندو راج قائم ہو اور مسلمانوں کو کانگریسی راج کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ مسلم لیگ نے بھی اس موقعے پر اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ اس وقت کی صورتِ حال پر غور کرتے ہوئے اس کی مجلسِ عاملہ نے ایک قرارداد میں کہا کہ یہ تحریک شروع کر کے کانگریس نے مسلمانوں کے مطالبۂ حق خود ارادیت کی سخت مخالفت کی ہے اور اس طرح فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے دروازہ بند کر دیا ہے، جو آزادی کی بنیادی شرط ہے۔ یہ اس کی خام خیالی ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ صرف اس وقت حل ہو سکتا ہے جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں۔

قائداعظم اور مسلم لیگ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ کانگریس کی تحریک میں ہرگز شریک نہ ہوں۔ قائداعظم نے اس دوران اپنے قانونی اور آئینی طریقِ کار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ دل جمعی سے اپنا کام کرتے رہے اور سارے ملک میں مسلم لیگ کی قوت بڑھتی رہی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جناح گاندھی گفت و شنید

حکومت "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے تشدد آمیز ہنگاموں اور تخریبی کارروائیوں کو دبانے میں کامیاب ہو گئی اور امن و امان قائم کر دیا۔ یہ تحریک جتنی انگریزوں کے خلاف تھی اتنی ہی مسلمانوں کے مطالبے کے خلاف بھی تھی۔ چنانچہ مسلمان اس سے الگ تھلگ رہے اور کانگریس اور لیگ کے درمیان خلیج مزید وسیع ہو گئی۔ اس صورتِ حال میں وہ واحد کانگریسی رہنما جس نے ہندو مسلم سمجھوتے کی ضرورت محسوس کی، راج گوپال اچاری تھے۔ انہوں نے مئی ۱۹۴۴ء میں کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں ایک ایسی قرارداد پیش کی جسے "سی۔ آر فارمولا" کہا گیا اور جو مسلمانوں کے لیے پاکستان کے اصول کو تسلیم کرتی تھی۔ اس کے مطابق کانگریس اور لیگ کو ہندوستان کی فوری اور مکمل آزادی کا مطالبہ کرنا تھا، اور اس کے بعد شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کے باشندوں سے یہ معلوم کرنے کیلیے کہ آیا وہ ہندوستان سے الگ ہونا چاہتے ہیں یا نہیں، رائے شماری کرانا تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ہندو بھی متحدہ ہندوستان کے لیے رائے عامہ کی حمایت حاصل کر سکتے تھے اور رائے شماری میں حصہ لے سکتے تھے۔ اس فارمولے کی چند باتیں معقول تھیں۔ لیکن راج گوپال اچاری اسے کانگریس سے منظور نہ کرا سکے۔ پھر بھی انہوں نے گاندھی کو اس بات پر ضرور آمادہ کر لیا کہ وہ قائداعظم سے گفت و شنید کریں۔

گاندھی کے لیے یہ موقع بھی بڑا سنہرا تھا۔ قائداعظم سے ملاقات کو انہوں نے مفید سمجھا۔ حکومت کو مرعوب کرنے کے لیے انہوں نے یقین دلانا چاہا کہ وہ مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار ہیں اور اب ہندو مسلم مسئلے کا تصفیہ یقینی ہے، اس طرح دونوں مل کر انگریزوں سے اقتدار ضرور چھین لیں گے۔ گاندھی کے نزدیک حکومتِ برطانیہ سے کانگریس کے مطالبات منوانے کی یہ آخری تدبیر تھی۔

قائداعظم اور گاندھی کے مابین ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ پہلی ہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملاقات میں گفتگو اس مرحلے میں پہنچ گئی کہ منقطع ہو جائے۔ قائداعظم نے اپنی اصول پسندی کے تحت مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ سے باضابطہ طور پر گاندھی سے گفت و شنید کی اجازت لی تھی۔ اس کے برعکس گاندھی نے برملا اقرار کیا کہ وہ اس گفت و شنید کے لیے ذاتی حیثیت میں آئے ہیں، کانگریس کے نمائندے کے طور پر یا ہندوؤں کی طرف سے نہیں۔ یہ صورتِ حال خاصی تعجب خیز تھی کہ گاندھی جو کچھ منظور یا نہ منظور کریں کانگریس یا ہندو قوم پر کوئی پابندی نہیں اور قائداعظم کا فیصلہ پوری مسلم قوم کا فیصلہ ہو۔ اس حالت میں اصول کا تقاضہ تو یہ تھا کہ گاندھی کی کوئی نمائندہ حیثیت نہ ہونے کے سبب مسلمانوں کا نمائندہ اور مسلم لیگ کا صدر ان سے گفتگو جاری نہ رکھتا۔ لیکن بڑے تحمل اور وقار کے ساتھ ہندو مسلم مسئلے کے حل کی خاطر قائداعظم نے یہ برداشت کر لیا۔

قائداعظم اور گاندھی کے درمیان تقریباً تین ہفتے گفتگو جاری رہی۔ ہر ملاقات کے بعد دونوں ایک دوسرے کو گفتگو کی روداد اور مباحث ایک دوسرے کے نام خطوں میں لکھتے رہے جو بعد میں شائع کر دیے گئے۔ گاندھی نے اس گفتگو میں راج گوپال اچاری کے فارمولے کو گفت گو کی بنیاد بنایا اور آخر میں اپنی طرف سے بھی تجاویز پیش کیں۔ اس بات کو تو انہوں نے تسلیم کر لیا کہ ہندوستان تقسیم کیا جائے لیکن اس کے لیے ہرگز رضامند نہ ہوئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو قومیں قرار دیا جائے۔ وہ اس بات پر مُصر تھے کہ پہلے آزادی حاصل کر لی جائے بعد میں تقسیم عمل میں آئے۔ قائداعظم نے ان دونوں باتوں کو تسلیم نہیں کیا، چنانچہ یہ گفتگو بے نتیجہ رہی۔

اس گفت و شنید کا فائدہ یہ ہوا کہ دنیا کی نظر میں گاندھی نے ہندوستان کی تقسیم کا اصول تسلیم کر لیا اور مسلم لیگ کے مطالبے کی شکل زیادہ نمایاں ہوئی۔ اس سے مسلمانوں میں قائداعظم کی حیثیت بڑھی اور ان کا وقار بلند ہوا۔ گاندھی کا ایک اور پہلو سامنے آیا کہ ایک طرف تو وہ قائداعظم سے گفتگو میں مصروف رہے اور ملاقاتوں کو طول دیتے رہے اور دوسری طرف درپردہ ایک خاص نامہ بر کے ذریعے حکومتِ برطانیہ کو بھی مراسلہ بھیجا، جس میں قومی حکومت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس مطالبے کو تقویت دینے کے لیے ان ملاقاتوں کے دوران وہ اس قسم کے مظاہرے کرتے رہے کہ جیسے یہ گفت و شنید کامیاب رہے گی اور کانگریس اور لیگ سمجھوتہ کر لیں گے۔ اس طرح حکومت کو یقین آ جائے گا اور وہ گھبرا کر کانگریس کا مطالبہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منظور کرلے گی۔ مگر جب حکومت نے گاندھی کے مراسلے کو اہمیت نہ دی تو انہوں نے قائداعظم سے گفتگو ختم کر دی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شملہ کانفرنس

دوسری جنگِ عظیم کا اختتام ہندوستان کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے ذہنوں میں کئی اندیشے پیدا کر رہا تھا۔ ایک کثیر فوج، جو جنگی ضرورتوں کے لیے بھرتی کی گئی تھی، اب برخواست ہونے والی تھی۔ سامانِ جنگ اور رسد کی فراہمی کے لیے جو کارخانے چل رہے تھے اور جن میں لاکھوں مزدور کام کر رہے تھے ان کا بند ہونا اور ایک بڑے پیمانے پر بیروزگاری کا پھیلنا یقینی تھا۔ جنگ کے اختتام کے ساتھ قانونِ تحفظِ ہند بھی ختم ہو جاتا، چنانچہ ہندوستانیوں کے وہ مشتعل جذبات جو کسی حد تک ضبط کی حدود میں تھے، اب احتجاج اور شورش کے طوفان میں تبدیل ہو جاتے۔ لہٰذا لارڈ ویول نے، جو اس وقت وائسرائے تھے، اس انداز پر سوچنا شروع کیا کہ آزادی اور خود مختاری دینے کے سلسلے میں ہندوستانیوں سے جو وعدے کیے گئے تھے ان کے متعلق ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ امید پیدا کی جائے کہ حکومتِ برطانیہ اپنے وعدے پورے کرنا چاہتی ہے تاکہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کا خطرہ دور ہو جائے۔

انہوں نے اس کے متعلق خود سوچا، صوبوں کے گورنروں سے مشورے کیے، وزیرِ ہند سے خط و کتابت کی، چرچل تک اپنی بات پہنچائی اور پھر بالآخر خود انگلستان جا کر انڈیا کمیٹی کے ارکان سے تبادلۂ خیال کیا۔ اسی اثنا میں ۶ مئی ۱۹۴۵ء کو جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے اور یورپ میں جنگ ختم ہو گئی۔ اب یہ اور بھی ضروری ہو گیا کہ ہندوستان کی سیاسی بے چینی رفع کرنے کے لیے کوئی مناسب منصوبہ تیار کیا جائے۔ چنانچہ وہ ایک منصوبہ لے کر ہندوستان واپس آئے جو "ویول پلان" کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ منصوبہ دراصل کانگریس کے قومی حکومت کے مطالبے کی تائید میں مرتب ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ایک نئی مجلسِ عاملہ تشکیل دی جائے گی جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے فرقوں کو نمائندگی حاصل ہو گی اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمان نمائندوں کی تعداد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برابر ہوگی۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک پرفریب منصوبہ تھا جس کے دھوکے میں وہ نہیں آئے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں سب ہندو ایک ہوتے ہیں چاہے وہ اعلیٰ ذات کے ہوں یا ادنیٰ ذات کے۔ ان کے علاوہ دوسری غیر مسلم اقلیتوں کے ووٹ بھی ہمیشہ ہندوؤں یا کانگریس ہی کو ملتے۔ وائسرائے نے اپنے منصوبے پر غور کرنے کے لیے ہندوستانی نمائندوں کی ایک کانفرنس شملہ میں بلائی جو بعد میں "شملہ کانفرنس" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں اکیس نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ جن میں سے چھ مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے اور باقی کانگریس، سکھ، پست اقوام اور دیگر اقلیتوں کے نمائندے تھے۔ ان غیر لیگی نمائندوں میں تین کانگریسی مسلمان بھی شریک ہوتے۔

وائسرائے کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کانگریس کی طرح مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ ورنہ اس کے کیا معنی کہ مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کے لیے کانگریس بھی مجلسِ عاملہ کی رکنیت کے لیے مسلمانوں کے نام پیش کرے اور وائسرائے انہیں کانفرنس میں مدعو کرے؟ اس وقت مسلمانوں کے ذہن میں یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوا کہ کانگریسی مسلمان حکومت میں کانگریس کی نمائندگی اور تائید کرتے یا مسلمانوں کی؟

کانفرنس کے دوران کانگریس نے ایک کانگریسی مسلمان کو نامزد کرنے کے حق کا مطالبہ کیا اور وائسرائے کی خواہش یہ تھی کہ وہ پنجاب کی غیر مقبول یونینسٹ پارٹی کو ایک نشست مسلمانوں کے حصے میں سے دے دیں۔ قائداعظم اور مسلم لیگ نے اس خواہش اور تجویز کو رد کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم صرف اس صورت میں تعاون کریں گے جب مجلسِ عاملہ میں مسلمانوں کی تعداد دوسروں کے برابر ہو۔ اس طرح شملہ کانفرنس ناکام رہی اور ہندوؤں کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ عارضی قومی حکومت میں اقتدار حاصل کر کے پورے ہندوستان پر مستقل قبضہ کر لیں۔

مسلم لیگ نے "ویول پلان" کے تحت تعاون سے انکار کر کے مطالبۂ پاکستان کی بنیادیں زیادہ مضبوط کر دیں۔ اس کے نتیجے میں قائداعظم کا اثر سارے ملک میں مزید بڑھ گیا اور مسلم لیگ کی قوت میں اضافہ ہوا۔ اس طرح ان مسلمانوں کی حیثیت کمزور ہوئی جو مسلم لیگ کی مخالفت کر رہے تھے۔ خصوصاً پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو بڑی زک پہنچی۔ اور چوں کہ یہ بات واضح ہو گئی کہ قائداعظم ہی ایک ایسے رہنما ہیں جو کچھ منوا سکتے ہیں تو ایسے مسلمان جو تذبذب کی حالت میں تھے، قائداعظم اور لیگ کی طرف آنے لگے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنہ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات

شملہ کانفرنس ختم ہونے کے فوری بعد دو ایسے اہم واقعات رونما ہوئے جنہوں نے دنیا کا سیاسی نقشہ بدل دیا۔ جاپان پر ایٹم بم کا وحشیانہ حملہ ہوا، جس سے جاپان نے شکست تسلیم کر لی اور دوسری جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوا۔ اس مرحلے پر انگلستان میں نئے انتخابات ہوئے جن میں چرچل کو شکست ہوئی اور لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آئی۔ یہ جماعت کانگریس اور ہندوؤں کی سرپرست تھی، چنانچہ کانگریس کے حلقوں میں خوشیاں منائی گئیں اور ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اس تبدیلی کا ایک بڑا اثر مسلمانوں کی قومی زندگی پر پڑنا ناگزیر تھا۔ انہیں اس سے دلچسپی نہ تھی کہ انگلستان میں کون برسرِ اقتدار آتا ہے۔ دونوں ان کے لیے ایک تھے۔ ایک تسلط پسند اور دوسرا ہندو پرور۔ اتنا ضرور ہوا کہ اب وہ اپنی تنظیم کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ قائداعظم نے شملہ کانفرنس کے آخری اجلاس ہی میں یہ کہہ دیا تھا کہ ہندوستان کے مستقبل کے لیے کوئی مستقل فیصلہ کیا جائے ہم عارضی انتظامات میں شریک نہیں ہوں گے۔ مسلم لیگ چند سالوں سے یہ ضرورت محسوس کر رہی تھی کہ عام انتخابات ہونے چاہئیں کیونکہ سابقہ انتخابات کو اتنی مدت گزر چکی تھی کہ اس وقت کے نمائندوں اور عوام کے درمیان کوئی رابطہ باقی نہیں رہا تھا۔ مسلم لیگ کا یہ مطالبہ بڑا برمحل تھا، چنانچہ حکومت نے جلد ہی انتخابات کی نوید سنائی اور یہ انتخابات سنہ ۱۹۴۶ء کے شروع میں منعقد ہوئے۔

کانگریس کے لیے یہ انتخابات کسی دشواری کا سبب نہیں تھے، کیونکہ اول تو کوئی ہندو جماعت اس قابل ہی نہ تھی کہ وہ کانگریس کے سامنے آئے اور دوسرے ہندو جماعتوں میں آپس میں اس قدر اصولی اختلافات نہ تھے کہ وہ ایک دوسرے سے لڑ پڑتے۔ ان کے مقابلے میں مسلم لیگ کے لیے یہ انتخابات بڑے دشوار اور سخت آزمائش کے حامل تھے۔ قائداعظم کا اثر گو تمام ملک میں بہت بڑھ چکا تھا تاہم بعض بڑے اہم علاقوں میں لیگ ابھی تک بہت کمزور تھی۔ صوبۂ سرحد میں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی لیکن اس کے وزیرِ اعلیٰ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیگر وزراء اب تک کانگریس میں شامل تھے۔ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ خضر حیات خاں ٹوانہ مسلم لیگ اور قائداعظم دونوں کے مخالف تھے۔ کئی علاقوں میں لیگ کے امیدواروں کے خلاف کچھ جماعتیں مختلف ناموں سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھیں۔ جیسے مجلسِ احرار، جمعیت العلمائے ہند، مسلم مجلس اور آزاد بورڈ وغیرہ۔ یہ سب لیگ کے مقاصد کے خلاف ایک بڑا محاذ بنائے ہوئے تھیں۔

لیگ نے ان انتخابات کو مسلمانوں کے مستقبل کے لیے خاص اہمیت دی اور اپنے سارے وسائل اس میں کامیابی کے لیے وقف کر دیے۔ پارلیمنٹری بورڈ کا دوبارہ تقرر کیا گیا اور اس کو موثر بنانے کے لیے ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ قائداعظم نے مسلمانوں کو ان انتخابات کی اہمیت جتانے اور اس کے لیے سرمایہ جمع کرنے کی خاطر سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ان دوروں میں انہوں نے جو تقریریں کیں وہ مسلمانوں کی سیاسی تربیت کے لحاظ سے بڑی اہم تھیں۔ ان سے مسلمانوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ لیگ کو بھی اس طرح بڑے فائدے حاصل ہوئے۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد بہت سے ایسے لوگ جو اب تک لیگ سے خاص دلچسپی نہ رکھتے تھے یا اس کے مخالف تھے اب اس میں شمولیت اختیار کرنے لگے۔

انتخابات کی تیاریوں کے دوران قائداعظم اور لیگ کو علمائے کرام کے ایک ممتاز اور بااثر طبقے کی عملی حمایت بھی حاصل ہوئی۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے دائرۂ اثر کے علماء، جس میں ممتاز اور بااثر علماء شامل تھے، یہ ہدایت کی تھی کہ وہ لیگ میں شامل ہوں اور پاکستان کے لیے کام کریں۔ اسی سال جنوری میں ان کی ایک طاقتور تنظیم "جمعیت العلمائے اسلام" قائم ہوئی۔ جس کے تعاون اور تائید سے لیگ کو تنظیم اور انتخابات میں بڑی مدد ملی۔ علماء نے دور دراز علاقوں کے مسلمانوں کو انتخابات میں لیگ کے نمائندوں کو ووٹ دینے کی ہدایت کی اور تبلیغی دورے کیے۔

لیگ نے یہ انتخابات پاکستان کے نام پر لڑے تھے۔ انتخابات ہوئے اور ان میں مسلم لیگ نے مرکز میں قریب قریب تمام صوبوں میں نمایاں اور امتیازی کامیابی حاصل کی۔ مسلمانوں کے انتخابی حلقوں سے اس کو ۷۸ فیصد ووٹ ملے۔ یہ قائداعظم اور لیگ کی سیاسی زندگی کے سب سے زیادہ تابناک اور شاندار دور کا آغاز تھا۔ ان کی سیاسی جدوجہد بالآخر کامیاب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئی اور یہ ثابت ہوگیا کہ جو مطالبے انہوں نے مسلمانوں کے نام پر کیے تھے ان کو قوم کی واضح اکثریت کی تائید اور حمایت حاصل ہے۔ پاکستان کے طلب گار برعظیم کے ہر خطہ اور ہر گوشے میں موجود تھے۔ اس سے چند سال قبل قائداعظم نے بڑے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ پاکستان کے قیام کو اب دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ انتخابی نتائج کے حوالے سے واقعی ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ پاکستان اب مسلمانوں کا طے شدہ مقدر ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیبنٹ مشن کی تجاویز

۱۹۴۶ء کے انتخابات کے دوران حکومتِ برطانیہ نے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ایک وزارتی مجلس تشکیل دی جائے جو مسائل کے حل کے لیے تجاویز مرتب کرے اور ہندوستانیوں سے ان تجاویز پر صلاح و مشورہ کرے۔ چنانچہ وزیرِ اعظم برطانیہ مسٹر ایٹلے نے اپریل میں تین وزیروں کا ایک وفد ہندوستان بھیجا۔ اس کی روانگی سے قبل انہوں نے کہا تھا کہ ہم کو اقلیتوں کے حقوق کا خیال ہے اور اقلیتوں کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ خوف سے آزاد رہ سکیں۔ مگر دوسری طرف ہم یہ اجازت بھی نہیں دے سکتے کہ اقلیت اکثریت کی ترقی کے خلاف رکاوٹ بن جائے۔ کانگریس کے لیڈروں نے مسٹر ایٹلے کے اس بیان کو خوب سراہا اور اس مشن کے تقرر کا خیر مقدم کیا۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ وزیرِ اعظم برطانیہ کس قدر کانگریس نواز اور ہندو پرور تھے۔ گاندھی، نہرو اور مولانا ابوالکلام سب نے حکومت کے اس اقدام کی تعریف کی۔ اس کے برعکس مسٹر ایٹلے کا بیان مسلمانوں کے لیے بدگمانی کا سبب بنا۔

وفد نے سرکردہ رہنماؤں، قائداعظم، گاندھی اور دوسرے نمائندوں سے گفتگو کی اور مئی ۱۹۴۶ء کے اوائل میں شملہ میں ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کی جس میں کانگریس کی نمائندگی ابوالکلام آزاد، نہرو، پٹیل اور عبدالغفار خاں نے کی اور لیگ کے نمائندوں کے طور پر قائداعظم، لیاقت علی خاں، نواب محمد اسماعیل اور سردار عبدالرب نشتر شریک ہوئے۔ گاندھی شملے میں موجود تھے لیکن انہوں نے کانفرنس میں باقاعدہ شرکت نہ کی۔ کانفرنس میں کانگریس اور لیگ نے جو موقف اختیار کیے وہ معمولی ردو بدل کے ساتھ ان کی سابقہ روش کے عین مطابق تھے۔ کوئی بھی فریق دوسرے کی تجاویز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ برعظیم میں ایک ہی آزاد و خود مختار مملکت ہونی چاہیے یا دو آزاد و خود مختار ملک بنیں۔ جو بھی حل اختیار کیا جاتا اس میں اقلیتوں کی موجودگی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناگزیر تھی۔ اور کانگریس اور لیگ دونوں اس بات پر متفق تھیں کہ اقلیتوں کے لیے مناسب آئینی تحفظ کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس دوران لیگ نے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنے ارکان کے ایک بڑے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی تھی، جس میں قراردادِ پاکستان کے مطالبے کو دہراتے ہوئے مزید کہا گیا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کے علیحدہ علیحدہ آئین بنانے کے لیے دو جداگانہ آئین ساز اسمبلیاں قائم کی جائیں۔

وزارتی وفد کے ساتھ اپنے مذاکرات میں لیگ نے بطور پیشکش یہ آمادگی ظاہر کی کہ اسے دونوں آئین ساز اداروں کا مشترکہ اجلاس بھی منظور ہے۔ بشرطیکہ مرکزی حکومت میں ہندو مسلم صوبوں کو مساویانہ نمائندگی دی جائے۔ اور یہ شرط بھی لگائی کہ مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے کا کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیے۔

یہ شرائط کانگریس نے مسترد کر دیں۔ چنانچہ وزارتی مشن اور وائسرائے نے ایک بیان شائع کیا جس میں انہوں نے اپنی طرف سے تجاویز پیش کیں۔ ان کے منصوبے کا مقصد ایک ہی مملکت کو برقرار رکھنا تھا۔ انہوں نے انتظامی، اقتصادی اور فوجی امداد کی بنا پر دو آزاد اور خود مختار مملکتوں کی تجویز رد کر دی۔ تاہم انہوں نے جو تجویز پیش کی، اس کے مطابق ایک مجلس دستور ساز کا انتخاب کیا جائے جو ایک متحدہ ہندوستان کا دستور بنائے، جس میں امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات مرکز کے تحت رہیں اور صوبوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک میں ہندو اکثریت والے علاقے ہوں، دوسرے میں پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ شامل ہوں اور تیسرا بنگال اور آسام پر مشتمل ہو۔ اس کے علاوہ وفد نے ایک مختصر مدت کے لیے عبوری حکومت کے قیام کو بھی اہمیت دی۔

اس منصوبے کے تعلق سے مسلم لیگ نے اپنی مجلسِ عاملہ کا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں قائداعظم کی تجویز کے مطابق منصوبہ قبول کر لیا گیا۔ ایک قرارداد میں اپنے فیصلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا کہ اس منصوبے کی رو سے مسلم اکثریت کے چھ صوبوں کو ایک علیحدہ ذیلی وفاق قائم کرنے کا حق ہوگا اور آگے چل کر اس وفاق کی بنیاد پر آزاد اور خود مختار پاکستان کی تشکیل ہو سکے گی۔

لیگ نے یہ منصوبہ اس لیے قبول کیا تھا کہ اس طرح اس کے خیال میں ہندوستان کے آئینی مسائل تسلی بخش طور پر حل ہو سکیں گے۔ لیکن قائداعظم کو اس بات پر اصرار تھا کہ یہ منصوبہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۰

انہوں نے محض حصولِ پاکستان کا ایک ذریعہ سمجھ کر قبول کیا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے حکومت برطانیہ اور کانگریس دونوں کو جتا دیا کہ ہندوستان کو جلد از جلد آزاد کرانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ پاکستان کا مطالبہ پوری طرح تسلیم کر لیا جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم لیگ کا راست اقدام

مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو منظور کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ اگرچہ وہ اس منصوبے کو منظور کر رہی ہے مگر اس کا نصب العین پاکستان ہی ہے۔ دوسری طرف کانگریس نے منصوبے کے بارے میں تاویلات پیش کرنی شروع کیں اور وہ معنی پہنائے جو لیگ کے لیے ناقابلِ قبول تھے۔ اس منصوبے کے حوالے سے وائسرائے نے قائداعظم کو یقین دلایا تھا کہ دونوں فریقوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا اور کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہ برتا جائے گا، لیکن وائسرائے کے آئندہ رویے نے یہ ثابت کر دیا کہ برطانوی حکومت ہر قیمت پر کانگریس کو خوش رکھنا چاہتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے وعدوں کو بھول جاتی ہے۔ ایک موقعہ پر وائسرائے نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ ملک کی تمام سیاسی جماعتیں بالخصوص کانگریس اور لیگ عبوری حکومت کو، جو دستور ساز اسمبلی کے عام انتخابات کے بعد تشکیل پانے والی تھی اور اب کیبنٹ مشن منصوبے کا ایک حصہ تھی، کامیاب بنانے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کریں گی۔ پھر انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر یہ دونوں جماعتیں یا ان میں سے کوئی ایک حکومت میں شریک نہ ہو تب بھی عبوری حکومت قائم کی جائے گی۔ مسلمانوں نے اس وعدے کا مطلب یہ سمجھا کہ اگر کانگریس عبوری حکومت میں شرکت پر تیار نہ ہوئی تو وائسرائے باقی جماعتوں کے تعاون سے نئی حکومت بنا لیں گے۔ وائسرائے نے اس امر کی تصدیق بھی کر دی، لیکن جب کانگریس نے بعض مخصوص مصلحتوں کے تحت عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تو اس کے نتیجہ میں حکومت نے اعلان کیا کہ عبوری حکومت کی تشکیل ترک کر دی گئی۔ یہ صاف وعدہ خلافی تھی اور ظاہر ہو رہا تھا کہ حکومت کو کانگریس کا مفاد کس قدر عزیز ہے۔

اس دوران مسلم لیگ نے مجلس آئین ساز کے انتخابات میں حصہ لیا۔ یہ انتخابات جولائی ۱۹۴۶ء میں ہوئے۔ مسلمانوں کی ۷۹ نشستوں میں سے لیگ نے ۷۶ نشستوں پر شاندار کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی نے اس امر کی توثیق کر دی کہ لیگ تمام ہندوستانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کی نمائندہ جماعت اور محمد علی جناح ان کے قائد ہیں۔ اس بے مثال کامیابی سے قائداعظم کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ دوسری طرف کانگریس نے بھی ہندوؤں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ جس کے نتیجے میں اس نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ اس کامیابی سے پورا فائدہ اٹھائے گی۔ کانگریس کے اس وقت کے صدر نہرو نے ایک بیان میں کہا کہ ہندوستان کی آئندہ مملکت متحدہ کے قیام کے بعد صوبائی گروہوں کی تشکیل کی گنجائش ہی نہیں رہیگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کانگریس مسلمانوں کو اس داخلی خود مختاری سے بھی محروم رکھنا چاہتی ہے جو کیبنٹ مشن منصوبے کے تحت انہیں حاصل ہونے والی تھی۔ قائداعظم اور لیگ نے یہ منصوبہ قبول ہی اس لیے کیا تھا کہ اس کے ذریعے مسلم اکثریت کے صوبوں کو داخلی امور میں خود مختاری حاصل ہو جائے گی اور اس طرح پاکستان کی بنیاد قائم ہو سکے گی۔ نہرو کے بیان سے مسلمانوں کے لیے اندیشے پیدا ہونا یقینی تھا۔ چنانچہ قائداعظم نے اس بیان پر احتجاج کرتے ہوئے کہہ دیا کہ کانگریس نے کیبنٹ مشن کے منصوبے کو صدق دل سے قبول نہیں کیا۔ وہ مجلس آئین ساز میں صرف اس لیے شریک ہو رہی ہے کہ اس کو اپنے مخصوص سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرے۔

ان دنوں وائسرائے کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح کانگریس کو عبوری حکومت میں شرکت پر آمادہ کر لیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے عبوری حکومت میں کانگریس کو ایک ایک زیادہ وزارت دینے کی تجویز پیش کی۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے خاصی اشتعال انگیز تھی۔ یہ لیگ اور مسلمانوں کی حیثیت کو کم کرنے کی کوشش تھی۔ چنانچہ لیگ نے اس تجویز کو حکومت کی وعدہ خلافی، بے وفائی اور دغابازی سے تعبیر کیا۔ اور شدید احتجاج کی صورت میں اور نئے حالات کے پیش نظر کیبنٹ مشن کی تجاویز کو نہ صرف رد کر دیا بلکہ یہ فیصلہ بھی کیا کہ جلد از جلد آزاد پاکستان حاصل کرنے کے لیے براہِ راست سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی وجوہات اور اس کے پس منظر اور آئندہ اقدامات مسلمانوں کو سمجھانے کے لیے سارے ملک میں عام جلسے کیے جائیں۔ یہ مسلم لیگ کا راست اقدام تھا۔ اس کے لیے ۱۶ اگست کا دن مقرر کیا گیا۔ تمام شہروں میں جلوس نکالے گئے، جلسے منعقد ہوئے اور لیگ کے موقف کی حمایت میں قراردادیں منظور کی گئیں۔ بنگال اور سندھ کی حکومتوں نے اس موقع پر عام تعطیل کا اعلان کیا اور بنگال کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وزیراعظم حسین شہید سہروردی نے ایک بیان میں کہا کہ اگر حکومت نے مرکز میں کانگریس کو حکومت بنانے کا موقع دیا تو بنگال کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اسی احتجاج کے دوران تمام خطاب یافتہ مسلمانوں نے اپنے خطابات واپس کر دیے۔ مسلم لیگ نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو نہ صرف انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائے گی بلکہ ملک میں کوئی ایسا سیاسی نظام بھی قائم نہ ہونے دے گی جس میں مسلمانوں کو مرکزی حکومت میں ہندو اکثریت کا محکوم بن کر رہنا پڑے۔ اس اقدام سے لیگ کو زبردست تنظیمی اور سیاسی قوت حاصل ہوئی جو اس کو منزل سے قریب تر کر رہی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عبوری حکومت اور مسلم لیگ

کیبنٹ مشن کی آمد سے لے کر عبوری حکومت میں شریک ہونے تک مسلم لیگ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ کانگریس من مانی نہ کر سکے۔ اس کے برعکس کانگریس کا ہمیشہ یہ مقصد رہا کہ وہ اقتدار میں بلا شرکتِ غیرے شریک رہے۔ لیگ ہمیشہ فراخ دلی اور اصول پسندی کے تحت بار بار یہ پیش کش کرتی رہی کہ اگر اختیار اور ذمہ داری کے ساتھ اس کو موقع دیا جائے تو وہ دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر برابری کے اصول پر مرکز میں حکومت قائم کرنے کے لیے تیار ہے۔ مگر ہندوؤں اور حکومتِ برطانیہ نے یہ کسی طرح منظور نہیں کیا۔ سیاسی جدوجہد کے ہر مرحلے پر یہ ثابت ہوا کہ حکومت ہندوؤں اور کانگریس کی دوست اور مسلمانوں کی مخالف ہے چنانچہ اس مرحلے پر کہ جب مسلم لیگ نے احتجاج کے طور پر عبوری حکومت میں شرکت سے انکار کر دیا اور راست اقدام کا فیصلہ کیا کہ حکومت لیگ اور کانگریس میں امتیاز کر رہی ہے اور وعدہ خلافی کرتے ہوئے کانگریس کو لیگ سے زیادہ وزارتیں دے رہی ہے، وائسرائے نے جانبداری کا ثبوت دیا اور عبوری حکومت تنہا کانگریس کے حوالے کر دی۔ یہ مسلم لیگ اور مسلمانوں کے مفاد پر ایک کاری ضرب تھی۔ اس وقت اہم مسئلہ اصولوں کے علاوہ وزارتوں کے تناسب کا تھا۔ اگر مسلمان اپنے بہتر مفاد میں اصولوں کو نظر انداز کر دیتے تب بھی وزارت کی ایک نشست میں انہیں ایثار سے کام لینا پڑتا۔ مسلمانوں کا ایک سمجھ دار طبقہ یہ شعور رکھتا تھا کہ اگر ایک مرتبہ کانگریس اقتدار حاصل کر لے تو پھر اسے کوئی ہٹا نہ سکے گا۔ افواج میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کو غالب حیثیت حاصل تھی۔ اور انتظامیہ تو تقریباً تمام تر ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ انگریزوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی اور زیادہ عرصے تک وہ ہندوستان میں نہیں رہ سکتے تھے۔ اگر انگریز چلے جائیں تو کانگریس کو مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کا گر آتا تھا۔ اگر وہ مسلمانوں کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب نہ بھی ہو سکی تو انہیں کچلا جا سکتا تھا، خواہ اس کا نتیجہ خانہ جنگی ہی کیوں نہ ہو۔ انجام کار کے بارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ہندو نہ صرف تعداد میں زیادہ تھے بلکہ معاشی طاقت، افواج، انتظامیہ اور تنظیمی قوت میں بھی انہیں فوقیت حاصل تھی۔ اور پھر نشر و اشاعت اور مواصلات کے ذرائع بھی پوری طرح ان کی دسترس میں تھے۔ چنانچہ یہی پس منظر تھا کہ کانگریس کابینہ میں قوم پرست مسلمانوں کی شمولیت پر اصرار کر رہی تھی اور آئینی سمجھوتوں میں رکاوٹیں ڈالتی تھی۔

عبوری حکومت میں کابینہ نے وائسرائے کی منظوری سے نہرو کی سربراہی میں ۲ ستمبر ۴۶ء کو حلف اٹھایا۔ مسلم لیگ نے اس دن سارے ہندوستان میں احتجاج کیا۔ اکتوبر کے شروع میں قائداعظم اور وائسرائے میں پھر گفتگو ہوئی اور اب اس مرتبہ نتیجہ قائداعظم کے حق میں بہتر رہا۔ قائداعظم نے محسوس کیا کہ عبوری حکومت کا ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا جانا مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے عبوری حکومت میں لیگ کو شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کابینہ میں پانچ نشستیں اس کے حصے میں آئیں۔ قائداعظم نے لیاقت علیخاں کو مسلم لیگی وزیروں کا قائد مقرر کیا۔ اپنے وزیروں کو انہوں نے ہدایت کی کہ وہ ملک کے عوام کی بھلائی کے لیے کام کریں اور محض لیگ کے مفاد کا خیال نہ کریں۔

مسلم لیگ کو جو محکمے کابینہ نے سونپے وہ مالیات، تجارت، مواصلات، صحت اور قانون تھے۔ یہ محکمے لیگ کو بڑی کشمکش کے بعد حاصل ہوئے اور ویسے بھی یہ بچے کھچے محکمے تھے۔ امور خارجہ، امور داخلہ، اور اطلاعات کے محکمے ہندوؤں نے خاص مصلحت کے تحت اپنے پاس رکھے، لیکن انہیں جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ مالیات کا محکمہ لیگ کو دے کر انہوں نے بڑی غلطی کی ہے۔ اب ہر محکمے کو اپنے ہر اقدام کے لیے، جس میں خرچ کا ذرا سا بھی مسئلہ ہوتا، اسے محکمہ مالیات سے منظوری حاصل کرنی پڑتی۔ پھر لیاقت علی خاں نے، جن کے پاس مالیات کا محکمہ تھا، جو سالانہ بجٹ پیش کیا وہ بڑا انقلابی اور ہندو سرمایہ داروں اور مہاجنوں کے لیے بڑا پریشان کن تھا۔ مسلمان نہ سرمایہ دار تھے اور نہ زیادہ تجارت کرتے تھے۔ ساری ضرب ہندو بنیوں پر پڑتی تھی، چنانچہ ایک شدید احتجاج کی صورت پیدا ہو گئی اور اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ترقی پسند ہونے کے متعلق کانگریس کا دعویٰ محض ایک ڈھونگ تھا۔ کانگریس کے سرپرست ہندو مہاجن اب تقسیم ملک کو ناگزیر سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر آئے دن کے واقعات بھی ایسی صورت اختیار کر رہے تھے کہ عبوری حکومت کا دور کم سے کم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظر آنے لگا۔ لیگ اور کانگریس اپنے اپنے اصولوں سے نہ ہٹ سکیں اور مقاصد کا فرق بہرحال موجود رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبوری حکومت کوئی ٹھوس اور قابلِ ذکر کام نہ کر سکی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دستور ساز اسمبلی سے مسلم لیگ کا بائیکاٹ

عبوری حکومت میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں اصولی طور پر ایک ہی حیثیت کی حامل تھیں دونوں نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو مسترد کر دیا تھا اور بغیر دوبارہ قبول کیے عبوری حکومت میں شریک ہوئیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ کانگریس جھوٹا دعویٰ کر رہی تھی کہ اس نے تجاویز قبول کر لیں جب کہ لیگ برملا تسلیم کر رہی تھی کہ اس نے وہ تجاویز مسترد کر دیں۔ ان تمام زیادتیوں اور سابقہ غلطیوں کے باوجود کانگریس اکثریتی جماعت تھی۔ اس کے لیے موقع تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور لیگ کے ساتھ مساویانہ رویہ اختیار کر کے وہ خطرات اور اندیشے رفع کر دیتی جو مسلمان ایک عرصے سے ظاہر کر رہے تھے۔ لیکن اس کے برعکس کانگریس نے عبوری اختیارات حاصل کرتے ہی یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ عبوری حکومت ایک قومی حکومت ہے اور جواہر لال نہرو نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا کہ گویا وہ وزیرِ اعظم ہیں۔ سردار پٹیل کے پاس امورِ خارجہ اور نشر و اشاعت کے محکمے تھے۔ انہوں نے ایسے کروفر کے ساتھ ان محکموں کا انتظام کیا کہ مسلمانوں کو ایک اجنبی اور ظالمانہ حکومت کا تسلط محسوس ہوا۔

جس وقت سے لیگ عبوری حکومت میں شامل ہوئی، نہرو نے اس امر پر اصرار شروع کیا کہ لیگ کیبنٹ مشن کی تجاویز کو مسترد کرنے کا فیصلہ واپس لے اور وہ منصوبہ دوبارہ منظور کر لے۔ خود مسلم لیگ کا بھی کانگریس سے یہی مطالبہ تھا کہ کانگریس کیبنٹ مشن تجاویز منظور کر لے۔ چونکہ ان تجاویز میں کسی حد تک صوبائی خود مختاری کا تصور موجود تھا، جو کانگریس کے لیے ناقابلِ قبول تھا اور مسلم لیگ کو اس سے دلچسپی تھی۔ لیگ کے خیال میں کانگریس نے یہ منصوبہ قبول نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود وائسرائے نے اس کو عبوری حکومت تشکیل دینے کی دعوت دی تھی۔ کانگریس یہ نہیں چاہتی تھی کہ لیگ عبوری حکومت میں شریک ہو۔ چنانچہ حکومت تشکیل دیتے وقت نہرو نے لیگ کے لیے مخصوص نشستیں خالی نہ رکھیں بلکہ ان پر غیر لیگی مسلمانوں کا تقرر کیا۔ عام انتخابات میں کانگریس اپنی وسیع تنظیم، سرمایہ کی بہتات اور جمعیت العلماء ہند کی طرف سے کانگریس نواز کوششوں کے باوجود لیگ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مقابلے میں ذلت سے ہار چکی تھی۔ نہرو یہ چاہتے تھے کہ عبوری حکومت میں قوم پرست مسلمانوں کو رکھ کر مسلمانوں سے ان کا اقتدار تسلیم کرائیں۔ وائسرائے اور برطانیہ کی لیبر حکومت اگرچہ کانگریس کی بڑی طرف دار تھی لیکن انتخابات کے نتائج دیکھ کر وہ آسانی سے لیگ کو نظر انداز نہ کر سکتی تھی۔ وہ یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھی جو مسلمانوں کی بغاوت سے پیدا ہوتا اور یقیناً لیگ بغاوت کے لیے تیار تھی۔ چنانچہ وائسرائے نے یہ کوشش کی کہ لیگ اور کانگریس کے درمیان تصفیہ ہو جائے اور یہ کوشش عبوری حکومت کے دوران بھی جاری رہی۔

ہندوؤں کے لیے یہ صورتِ حال تکلیف دہ تھی کہ حکومت میں لیگ کو کانگریس کے برابر کا درجہ حاصل ہو۔ نہرو نے وائسرائے پر شدت سے دباؤ ڈالا کہ وہ لیگ کو اس بات کے لیے آمادہ کریں کہ وہ کیبنٹ مشن کی تجاویز کی منسوخی کے فیصلے کو واپس لے اور انہیں دوبارہ تسلیم کر لے۔ یہ مطالبہ اس لیے شدت سے کیا جا رہا تھا تاکہ لیگ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہو سکے۔ نہرو کے اصرار پر وائسرائے نے قائداعظم سے ملاقات کی۔ قائداعظم نے وائسرائے کو بتایا کہ صرف مسلم لیگ کونسل ہی اس کی مجاز ہے۔ لیکن چونکہ خود کانگریس نے یہ تجاویز منظور نہیں کیں لہٰذا یہ نتیجہ خیز نہ ہوگا کہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا جائے۔ اس سلسلے میں قائداعظم نے اپنا نقطۂ نظر ثابت کرنے کے لیے کانگریس کی مجلسِ عاملہ کی قراردادوں اور گاندھی کے بیانات کا حوالہ دیا۔ قائدِ اعظم نے ایک مکتوب میں ہندوؤں کے ہاتھوں پورے ہندوستان سے خاص طور سے بہار میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی مذمت کی۔ انہوں نے وائسرائے پر زور دیا کہ اس صورتِ حال میں وہ ملک میں امن و امان بحال کرنے پر تمام تر توجہ دیں اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس فی الحال ملتوی کر دیں تاکہ تمام وسائل قیامِ امن میں صرف ہو سکیں اس مشورے کے برعکس وائسرائے نے اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ کا اعلان کر دیا اور دعوت نامے جاری کر دیے۔ قائداعظم نے اس اقدام کو انتہائی سنگین اور خطرناک غلطی قرار دیا۔ اس دوران کانگریس بھی جنگ و جدل کی راہ اختیار کر چکی تھی۔ اس کے زیرِ اثر علاقوں میں متعدد مقامات پر مسلم کش فسادات ہوئے۔ اس کے اطوار سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ دستور ساز اسمبلی کو مرکزی وحدانی حکومت قائم کرنے اور پاکستان کے مطالبے کو ختم کرنے کے لیے استعمال کرے گی۔ وائسرائے اور کانگریس نے جو حالات پیدا کر دیے تھے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے قائداعظم نے دستور ساز اسمبلی کے مسلم لیگی ممبروں کے نام ہدایات جاری کیں کہ وہ اجلاس میں شریک نہ ہوں۔ حکومتِ برطانیہ نے کیبنٹ مشن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تجاویز کے متنازعہ امور پر سمجھوتہ کرانے کے لیے آخری کوشش کی اور لندن میں ایک کانفرنس منعقد کی، لیکن یہ بھی نتیجہ خیز نہ رہی۔ چنانچہ عبوری حکومت میں کانگریس اور لیگ کے تعلقات اور بھی خراب ہو گئے اور ان کا رویہ ایک دوسرے کے لیے سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔ حکومتِ برطانیہ کے لیے اب سخت دشواری کا سامنا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ لیگ کو کسی بھی حالت میں پاکستان کے مطالبے سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اس نے بھی ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر لیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم کش فسادات

عبوری حکومت میں شامل ہونے کے بارے میں مسلم لیگ کے فیصلے کے بارے میں مسلم لیگ کے فیصلے کے اعلان کے ساتھ ہی ہندوستان کے کئی علاقوں، خاص طور سے بہار اور نواکھالی میں شدید مسلم کش فسادات شروع ہو گئے۔ یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک طویل عرصے سے اس قسم کے مسلم کش فسادات متواتر ہوتے آرہے تھے۔ جب سے ہندوؤں میں تعصب آمیز قومی شعور پیدا ہوا ہے، اور اس کی ایک طویل عرصہ پر مشتمل ایک تاریخ ہے، اس وقت سے لے کر آج تک کبھی اتفاقاً اور کبھی مسلسل ایک مدت تک فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے ہیں۔ ایسے مواقع پر مسلمانوں پر عام اجتماعی حملے کرنے، انہیں قتل کرنے، زندہ جلانے اور ان کی املاک لوٹنے کے واقعات عام طور پر پیش آتے ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی بھی کوشش، جو ان کے حقوق کی بازیافت کے لیے ہوتی یا انہیں ہندوؤں کے برابر کا درجہ دیتی، ہندوؤں کے اشتعال کا سبب ہوتی اور اس طرح فسادات کا شروع ہونا ایک متوقع بات تھی۔

عبوری حکومت میں شرکت کے مسئلے پر ابتداءً جب لیگ نے مساویانہ درجہ نہ ملنے پر "راست اقدام" کا فیصلہ کیا اور احتجاج کے طور پر عبوری حکومت میں شرکت سے انکار کیا تو ہندوؤں نے شدید اشتعال کی صورت پیدا کر دی اور تشدد پر اتر آئے۔ کلکتہ میں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔ یہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور وہ کلی طور پر کانگریس کے زیر اثر تھے۔ اس موقع پر قائداعظم نے ایک بیان میں کہا کہ کلکتہ کے واقعات کی اصل ذمہ داری وائسرائے، گاندھی اور کانگریس پر ہے، اگر یہی صورتِ حال رہی تو ہر طرف خوں ریزی اور خانہ جنگی شروع ہو جائیگی اور واقعی چند ہی ہفتے بعد قائداعظم کے اس اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔ سب سے پہلے نواکھالی میں ایک فرقہ وارانہ فساد ہوا پھر یہ آگ ہر طرف پھیل گئی۔ چھپرا، احمد آباد، احمد نگر اور دوسرے متعدد مقامات پر ہندوؤں نے مسلمانوں پر منظم حملے کیے اور جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ سب سے شدید صورتِ حال بہار میں تھی۔ وہاں حکومت کانگریس کی تھی اور مسلمان آبادی ۱۳ فیصد اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ بھی دیہاتوں میں منتشر تھی۔ ہزاروں ہندوؤں کے جتھے یکایک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حملے پوری تیاری کے بعد شروع ہوئے تھے۔ چنانچہ دو ہفتوں تک بہار کے پانچ اضلاع میں مسلمانوں کا مسلسل قتلِ عام ہوتا رہا۔

بہار کے فوراً بعد یو۔پی کے شمالی و مغربی اضلاع میں گنگا اشنان کے میلے کے دوران مسلمانوں پر حملے ہوئے۔ میلے کے بعد جب یہی ہندو اپنے اپنے شہروں کو لوٹے تو راستے کے گاؤں اور دیہاتوں پر حملے کرنا ان کا وقتی مشغلہ سا بن گیا۔ یہ واقعات اتفاقی نہیں تھے۔ یہ سب کچھ عبوری حکومت کے اختیار و انتظام کے زمانے میں ہوا۔ کانگریس کے ذمہ دار عام ہندوؤں کو یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کا راج قائم ہو چکا ہے اور پولیس اور فوج ان کے ماتحت ہے۔ "راشٹریہ سیوک سنگھ" جو پندرہ سال کے عرصے سے خود کو منظم کر رہی تھی اور زیر زمین دوز تھی، اب اعلانیہ سرگرم ہوئی۔ عبوری حکومت قائم ہونے کے بعد اس نے اپنی تنظیم کو چھوٹے بڑے تمام شہروں میں پھیلا دیا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصے کے اندر خاص دارالحکومت دہلی میں انفرادی قاتلانہ حملے روز کا معمول بن گئے اور پھر مسلمانوں پر ہندوؤں کے اجتماعی حملے شروع ہوئے۔

یہ فسادات جس انداز اور جس زمانے میں شروع ہوئے ان سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہندو مسلمانوں کو ہندوستان میں باعزت مقام حاصل ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اس رویے کی وجہ سے ہندوستان کے طول و عرض میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس صورتِ حال کا اثر اس کشمکش پر بھی پڑا جو مرکزی حکومت میں کانگریس اور لیگ کے حلقوں میں جاری تھی۔ مسلمانوں کو رہی سہی تسکین محض اس امر سے حاصل ہو رہی تھی کہ یہ سب کچھ انہیں اپنی آزادی اور حصولِ پاکستان کے لیے سہنا پڑ رہا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تقسیم ہند کا منصوبہ

کیبنٹ مشن کی ناکامی اور دستور ساز اسمبلی سے مسلم لیگ کے بائیکاٹ کے سبب حکومت برطانیہ کو بڑے نازک حالات کا سامنا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ فرقہ وارانہ صورتِ حال بھی سنگینی اختیار کر رہی تھی۔ مزید فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں خود فوج اور سرکاری ملازمین کی وفاداری بھی مشکوک تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر حکومتِ برطانیہ یہ سوچنے لگی تھی کہ ہندوستان میں اقتدار و اختیارات کی منتقلی کے متعلق ایک تاریخ مقرر کر دی جائے۔ یہ سمجھا جا رہا تھا کہ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ ہونے کے بعد دونوں بڑی قومیں اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کریں گی۔ اور یہ بات مصلحت کے عین مطابق سمجھی گئی کہ جون ۱۹۴۸ء سے قبل ہی اقتدار ہندوستان کو سونپ دیا جائے۔ اس ذمہ داری کو نبھانے اور منصوبہ تشکیل دینے کے لیے لارڈ ویول کی جگہ مونٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا۔ اس تبدیلی کی وجہ نہیں بتائی گئی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ کانگریس کی ریشہ دوانیوں کے سبب ویول کو برخواست کیا گیا، کیونکہ کانگریس کی نظر میں ویول کا قصور یہ تھا کہ اس نے مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں کانگریس کے برابر جگہ دی تھی۔

مونٹ بیٹن کے پیشِ نظر اس وقت ہندوستان کی آزادی کے سوا کوئی اور متبادل صورت باقی نہیں تھی۔ ہندوستان میں سب فریق حصولِ آزادی پر متفق تھے۔ صرف اختلاف اس امر پر تھا کہ آزادی کے بعد ایک آزاد و خود مختار مملکت ہونی چاہیے یا دو۔ برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کی آزادی کے فیصلے کا لیگ اور کانگریس دونوں نے خیر مقدم کیا۔ لیکن اس اعلان نے بیک وقت دونوں کے لیے جہاں بہتر امیدیں پیدا کی تھیں وہیں خدشات کو بھی ابھارا تھا۔ کانگریس ابھی تک پورے برعظیم پر اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، لیکن اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید پورا برعظیم اس کی گرفت میں نہ آسکے۔ ایسی صورت میں وہ برعظیم کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی تھی، چنانچہ اس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ بھی کر دیا۔ اس صورتِ حال میں مسلم لیگ کو انگریزوں کے رویے سے بڑی حد تک تشویش سی تھی۔ اس کیلیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم اکثریتی صوبوں بالخصوص پنجاب اور صوبہ سرحد کی سیاسی حالت بھی تشویشناک تھی۔ پنجاب میں مسلمانوں اور سکھوں اور ہندوؤں کی باہمی کشمکش نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اور صوبہ سرحد میں لیگ کا اثر اور زور اس قدر بڑھ چکا تھا کہ عوام کانگریسی بغاوت کے خلاف بغاوت پر آمادہ تھے۔ اب وہاں لیگ کی بڑھتی ہوئی قوت نے کانگریس کی اس دولت کا اثر خاک میں ملا دیا تھا کہ جس سے وہ کسی زمانے میں اپنے ہم خیال رہنماؤں کے ذریعے سرحدی مسلمانوں کے ووٹ خرید اکرتی تھی۔ پنجاب میں سکھوں کے رہنما خاصا اشتعال پیدا کر رہے تھے۔ حکومتِ برطانیہ کے لیے اب یہی راستہ تھا کہ جلد از جلد ہندوستان کو تقسیم کر کے خود کنارہ کش ہو جائے۔ چنانچہ کئی ابتدائی مرحلوں کے بعد اس نے ایک منصوبہ ہندوستانیوں کی بہت حد تک اتفاق رائے سے تیار کیا جو حرفِ آخر تھا اور اس میں کسی رد و بدل کی گنجائش نہ تھی۔ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو اس فیصلے کا اعلان کیا گیا، جو یہ تھا کہ برطانیہ کے واپس جانے سے پہلے ہندوستان کو دو آزاد اور خود مختار مملکتوں بھارت اور پاکستان میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ دونوں مملکتوں کو اس کا اختیار ہو گا کہ چاہیں تو دولتِ مشترکہ سے الگ ہو جائیں۔ پہلے یہ کہا گیا تھا کہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کو مکمل آزادی دے دی جائے گی۔ لیکن اس منصوبے کے تحت یہ کہا گیا کہ ۱۵ر اگست تک تقسیم کے سلسلے میں تمام ضروری کارروائی مکمل ہو جائے اور اس تاریخ کو ہندوستان پر برطانیہ کا اقتدار ختم ہو جائے۔ اسی تاریخ کو دیسی ریاستوں پر بھی برطانوی حکومت کا اقتدارِ اعلیٰ ختم ہو جائے۔ اس کے بعد ہر ریاست کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہو کہ بھارت میں شامل ہو یا پاکستان میں یا بالکل آزاد ہو جائے۔

یہ فیصلہ بہت کچھ مسلمانوں کی خواہش اور منشاء کے مطابق تھا۔ پاکستان کے قیام کا مطالبہ منظور کر لیا گیا تھا اور یہ قائداعظم اور لیگ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ لیکن ابھی اور بھی دشواریاں موجود تھیں۔ حکومتِ برطانیہ نے تقسیم کا فیصلہ تو کر لیا تھا۔ لیکن یہ تقسیم اس صورت میں عمل میں آسکتی تھی کہ بنگال اور پنجاب کے صوبے بھی تقسیم ہوں۔ مسلم اکثریت کے صوبوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو پاکستان میں شامل ہوں یا اس سے الگ رہیں۔ مغربی پنجاب، مشرقی بنگال اور سندھ میں یہ فیصلہ کرنے کا اختیار اسمبلی کو دیا گیا اور بلوچستان میں شاہی جرگے کو، صوبۂ سرحد اور آسام کے مسلم اکثریتی ضلع سلہٹ میں عام استصواب کا اہتمام کیا گیا اور ہر بالغ کو رائے دینے کا حق دیا گیا۔ ۱۰ر جون کو لیگ نے اور ۱۲ر جون کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کانگریس نے اس منصوبے کو منظور کر لیا۔ ۳۰ر جولائی تک مسلم اکثریت کے علاقوں میں رائے شماری مکمل ہو گئی۔ ان تمام علاقوں کے مسلمانوں کی غالب اکثریت نے پاکستان کے حق میں رائے دی۔ چنانچہ اب ہندوستان کے سیاسی نقشے میں بہت بڑا تغیر یقینی تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تقسیم کے مسائل اور قیامِ پاکستان

صوبوں کی تقسیم کے ساتھ ۳ر جون کا منصوبہ مسلم لیگ نے صرف اس لیے قبول کیا تھا کہ حصولِ پاکستان کی اس کے سوا اور کوئی صورت بھی نہیں تھی۔ وائسرائے مونٹ بیٹن نے یہ دھمکی دی تھی کہ وہ ملک کو کانگریس کے حوالے کر دیں گے۔ حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان چھوڑ کر چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے لیے تاریخ مقرر کر دی تھی اور برطانوی افواج تو رفتہ رفتہ واپس بھی جانے لگی تھیں۔

اصولی طور پر تو اقتدار کی منتقلی کا عمل جون ۱۹۴۸ء تک مکمل ہونا تھا لیکن اس دوران کانگریس نے ایک بہت دور رس منصوبہ بنایا اور وائسرائے سے یہ طے کیا کہ اگر آزادی مقررہ مدت سے پہلے دے دی جائے تو بھارت برطانوی دولتِ مشترکہ میں شمولیت اختیار کر لے گا۔ جو کام پندرہ ماہ کی مدت میں ہونا تھا اب ۱۵ر اگست کو دو ماہ کے قلیل عرصے میں انجام پانے والا تھا۔ اس عجلت کے تمام تر فوائد بھارت کے حصے میں اور نقصانات پاکستان کے حصے میں آتے تھے۔ مسلم لیگ کے لیے یہ تاریخ بڑی پریشان کن تھی اور کانگریس کے لیے اس میں کوئی دشواری نہ تھی۔ اسے حکومتِ ہند کی انتظامیہ جوں کی توں ورثہ میں مل رہی تھی۔ حکومت کے تمام محکموں کے علاوہ افواج کے صدر دفاتر بھی دہلی میں تھے۔ سلمان سول اور فوجی افسروں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کے نہ رہنے سے وہاں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ دو ماہ کا عرصہ اتنا کم تھا کہ اس کے اندر انتظامیہ اور افواج کی تقسیم خوش اسلوبی سے ناممکن تھی۔ چونکہ تقسیم مالی سال کے وسط میں ہو رہی تھی، اور مالی سال اپریل سے مارچ تک ہوتا تھا، اس لیے بجٹ اور حساب کتاب کی الجھنیں بھی اپنی جگہ تھیں جنہیں دور کرنا ضروری تھا۔ پھر کرنسی اور زرِ مبادلہ کے مسائل تھے۔ پاکستان کے لیے اپنی کرنسی ضروری تھی لیکن دو ماہ میں کرنسی نوٹوں اور نئے سکوں کی ڈھلائی ناممکن تھی۔ دیگر اثاثے ریلوے، مواصلات اور قرضے بھی ایک شدید مسئلے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان لاتعداد مشکلات اور مسائل کے علاوہ پاکستان کی ابتدا باقاعدہ افواج، منظم انتظامیہ، دفتری سازوسامان اور زندگی کی تمام ضروری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سہولتوں کے بغیر ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ کانگریس کی حکمتِ عملی کا ایک حصہ تھا۔ جس میں وائسرائے مونٹ بیٹن بھی برابر کے شریک تھے۔ وائسرائے ایک آزمودہ کار منتظم تھے اور بہت جلد اقتدار منتقل کرنے کے اس نئے منصوبے سے پاکستان کو جو لاتعداد مشکلات پیش آ رہی تھیں وہ ان سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس عجلت کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کے درمیان انتظامی لحاظ سے وہی فرق ہو گا جو ایک پختہ عمارت اور ایک کچے جھونپڑے میں ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک بھارت کی برطانوی دولتِ مشترکہ میں شمولیت اتنا عظیم مقصد تھا کہ اس کے مقابلے میں پاکستان کے ساتھ ناانصافی کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ تقسیم کے منصوبے پر عمل کرنے کیلیے اور اسے آخری شکل دینے کے لیے انتظامی طور پر دو الگ الگ حکومتوں کا وجود فرض کر لیا گیا۔ دونوں حکومتوں نے محکموں اور املاک کی تقسیم کے لیے مختلف درجے کی کمیٹیوں میں اپنے اپنے نمائندے نامزد کر دیے۔ جن امور پر یہ کمیٹیاں فیصلہ نہ کر سکتی تھیں ان کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک ٹریبونل مقرر تھا۔ ان سب پر ایک کونسل تھی جو منصوبے کے مطابق فیصلے کرتی تھی۔ اس کونسل میں وزارتی سطح پر دونوں حکومتوں کے دو دو نمائندے شامل تھے۔ تقسیم ہونے والے صوبوں کی نئی سرحدیں قائم کرنے کے لیے دو "سرحدی کمیشن" تشکیل دیے گئے۔ دونوں کمیٹیوں کا صدر ریڈ کلف کو مقرر کیا گیا جسے ہر صورت میں غیر جانبدار رہنا تھا لیکن بعد کی شہادتوں سے یہ افسوسناک امر سامنے آیا کہ اس کی نام نہاد "غیر جانبداری" میں وائسرائے اور مسلم دشمنی کا بھی دخل رہا۔ ورنہ اس کے کیا معنی تھے کہ جب متنازعہ امور پر فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو ریڈ کلف نے مشرق میں نہ صرف کلکتہ بلکہ ضلع مرشد آباد کا تمام اور مسلم اکثریت والے ضلع نادیہ کا بیشتر علاقہ بھارت کو دے دیا اور مغرب میں گورداسپور، بٹالہ اور پٹھانکوٹ کی تین تحصیلیں بھارت کو بخش دیں۔ حالانکہ یہ تمام علاقے مسلم اکثریت پر مشتمل تھے۔ یہ فیصلے آخر وقت تک مسلم لیگ سے پوشیدہ رکھے گئے۔ چنانچہ فیصلہ سن کر قائداعظم کو سخت تعجب اور صدمہ ہوا۔ ان کے خیال میں یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی تھا۔ اس فیصلے کو آئینی نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ بدنیتی کا آئینہ دار ایک سیاسی فیصلہ تھا۔ چونکہ قائداعظم نے ریڈ کلف کا تقرر منظور کر لیا تھا اس لیے فیصلے کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا اور آئین پسندی کا دامن نہ چھوڑا۔ اب ان کے سامنے پاکستان کی آزاد و خود مختار مملکت مسلمانوں کے معینہ مقدر کی صورت میں موجود تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فسادات اور مسلمانوں کی ہجرت

فرقہ وارانہ فسادات نے ہر زمانے میں ہندوستان کی تاریخ کو آلودہ رکھا ہے۔ ہندوستان کو غیر ہندوؤں سے نجات دلانے کے لیے ایسے فسادات قدیم زمانے سے ہوتے آئے ہیں۔ ابتداءً شنکر اچاریہ نے بدھوں کو فنا کرنے کے لیے ہندو آبادی کو ان کے خلاف مشتعل کر کے ان کا قتلِ عام کرایا تھا۔ اس وقت سے ہندوؤں کا یہ معمول ہے کہ وہ ہزاروں ہندوؤں کے جتھوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی غیر ہندو آبادیوں پر چڑھائی کرتے ہیں۔ اور پھر ان کو لوٹتے اور قتل کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو مٹانا تو یونہی ہندوؤں کا بڑا محبوب مشغلہ اور عین مقصد رہا ہے، چنانچہ تقسیم سے کچھ عرصہ قبل اس مقصد کے لیے باضابطہ جنگجو جمعیتیں قائم کر لی گئی تھیں جو اب مسلمانوں کے قتلِ عام کے لیے پوری طرح تیار تھیں۔ غلط پروپیگنڈے کا شکار سکھ بھی مسلمانوں کے حریف ہو گئے تھے اور ان کی جنگجو جمعیتیں اکالی دل، اکالی سینا اور شہیدی جتھے بھی قتل و غارت گری کے لیے سرگرم ہوئے۔ وہ اس وقت یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی شدید مخالفت کے باوجود ان سے پاکستان لے لیا گیا ہے۔ اب وہ برملا کہنے لگے تھے کہ اس کی سزا مسلمانوں کو بھگتنی پڑے گی۔ اس قسم کا شدید اشتعال سکھوں میں پھیل گیا تھا۔ کبھی انہوں نے خود پنجاب کی تقسیم پر اصرار کیا تھا، لیکن اب اپنے مطالبے کے نتائج پر وہ سیخ پا ہو رہے تھے۔

اب تک جتنے بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان کی نوعیت مقامی ہوتی تھی اور وہ چند دنوں کے بعد دب جاتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں بہار کے مسلمانوں کا قتلِ عام ایک وسیع علاقے میں پہلی منظم کوشش تھی۔ اب پنجاب میں قتلِ عام کا جو منصوبہ بنایا گیا وہ نہ صرف بڑے پیمانے پر تھا بلکہ تمام سابقہ فسادات سے شدید بھی تھا۔ یہ منصوبہ اس وقت قتلِ عام شروع کرنے کا تھا جب مسلمان ہجرت کر کے پاکستان جانے لگیں گے، اس وقت پاکستان کی انتظامیہ اپنے آپ کو از سرِ نو منظم کرنے میں مصروف ہو گی اور اس طرح اس کی توجہ اس قتلِ عام اور مہاجرین کی بحالی کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ وائسرائے اور کانگریس کے درمیان تقسیمِ ہند کی تاریخ کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان ہجرت

جون ۱۹۴۸ء سے بہت پہلے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں تبدیل کرنے کی جو خفیہ سودے بازی ہوئی تھی اس میں کانگریس کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ پاکستان کو منظم اور مستحکم ہونے کی مہلت نہ دی جائے۔ اس وقت ان کے پیشِ نظر دوسرا جو اہم مقصد تھا اس کے تحت اپنے گماشتوں کو بھیج کر پاکستان میں ایک باضابطہ درپردہ تحریک چلائی گئی اور بڑے پیمانے پر پاکستان کے ہندو باشندوں کو بھارت منتقل ہونے کی دعوت دی گئی۔ پاکستان کی تمام تجارت، بنکاری اور سرمایہ کاری ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ان کے فوری طور پر یہاں سے چلے جانے سے پاکستان میں اقتصادی، تجارتی اور انتظامی انتشار پیدا ہو جاتا۔ اور واقعی ایک عرصے کے لیے یہ صورتِ حال یہاں پیدا بھی ہوئی۔ حالانکہ بلوچستان اور سندھ میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا لیکن یہاں سے بھی غیر مسلم بھارت چلے گئے۔ چنانچہ اس کا یہی نتیجہ نکلا، جو ہندو چاہتے تھے کہ کچھ عرصے کے لیے منڈیاں ویران ہو گئیں، بنک بند ہوئے اور دیہات میں کاشتکاروں کو قرضہ دینے والا کوئی نہ رہا۔

اس بات کو بھی ضروری سمجھا گیا تھا کہ بھارت کے دارالحکومت دہلی کو احتیاط کے طور پر مسلمانوں سے خالی کرا لیا جائے۔ چنانچہ ایک بڑے پیمانے پر دہلی میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا، کئی آبادیاں سرے سے قتل کر دی گئیں اور شہر میں ہر جگہ نہتے مسلمانوں پر حملے کیے گئے۔ یہ سلسلہ کئی ہفتے تک جاری رہا، جس کے نتیجہ میں دہلی کی مسلم آبادی کا ایک بڑا حصہ قتل ہوا۔ دہلی کے آس پاس کی بستیوں اور شہروں میں بھی ایسا ہی قتلِ عام ہوا۔ یو۔پی کے دیگر کئی شہروں اور اضلاع میں اور مشرقی پنجاب کے تمام شہروں میں اسی قسم کے حملے ہوئے۔

مشرقی پنجاب کے تمام شہروں اور پاکستان کے راستوں پر ایک بڑے منظم طریقے سے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کیا گیا، جو ایک عرصے تک جاری رہا۔ لاکھوں مسلمان جان بحق ہوئے، سب کی املاک لوٹ لی گئیں اور جو کسی طرح بچ گئے وہ پاکستان کے راستے میں بھوک اور بیماری سے ہلاک ہوئے یا مزید حملوں کا شکار ہوئے۔ اس صورتِ حال میں دنیا کی تاریخ میں ہجرت کا سب سے بڑا واقعہ رونما ہو رہا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں نے ہجرت کی۔ اب ان کے سامنے ایک ایسی مملکت تھی جس کا خواب وہ مسلسل دو صدیوں سے دیکھتے آ رہے تھے۔ ان کی جدوجہد اور ان کی کامیابیاں قومی زندگی کی تیرہ سو سالہ پرانی روایت کو دہرا رہی تھیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیامِ پاکستان اور بھارت کی مسلم اقلیتیں

پاکستان کا قیام دراصل مسلمانوں کی ایک طویل جدوجہد اور دو قومی نظریے کی کامیابی تھی۔ مسلمانوں کے یقینِ محکم نے پاکستان کے تصور کو ممکن کر دکھایا تھا۔ قائداعظم کی قیادت کو برضا و رغبت قبول کر کے وہ اس منزل پر پہنچے تھے۔ قائداعظم کے دل و دماغ کی قوتیں، ان کا عزم و ایمان اور ان کی قیادت پر مسلمانوں کا کلی اعتماد، یہی وہ ذہنی اور اخلاقی اسلحہ تھا جس کی بدولت انہوں نے اپنی قوم کے لیے بالآخر پاکستان حاصل کیا۔ ملت دل و جان سے ان کی ممنون تھی، وہ بابائے قوم اور قائداعظم تھے۔ پاکستان کے لیے مستقبل کی آغوش میں خواہ کیسی بھی آزمائشیں اور مصیبتیں رہی ہوں بہرحال ایک آزاد و خود مختار مسلم مملکت کا ایک دیرینہ خواب اب حقیقت بن چکا تھا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں نے بے مثال صبر و استقلال اور عزم و ارادے کا ثبوت دیا تھا۔ اور اس راہ میں بے شمار جانیں قربان کی تھیں۔ ۱۵ اگست کو قائداعظم نے پاکستانیوں کے نام اپنے پیغام میں کہا تھا کہ "اس موقع پر مجھے سب سے زیادہ وہ بہادر مجاہد یاد آ رہے ہیں جنہوں نے ہمارے نصب العین کی خاطر سب کچھ حتیٰ کہ جانیں تک قربان کر دیں۔ ہمارے ان بھائیوں کو جو اب بھارت میں اقلیت میں ہیں پورا یقین ہونا چاہیے کہ ہم نہ کبھی انہیں نظر انداز کریں گے اور نہ کبھی فراموش کریں گے۔ یہ مسلم اقلیتی صوبے ہی تھے جنہوں نے جدوجہد میں پہل کی اور پاکستان کے حصول کا پرچم سربلند رکھا۔ اب انہیں نئے اور دشوار حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔" قائداعظم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ جس مملکت میں ہیں اس کے وفادار رہیں۔

یہ حقیقت کبھی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ تقسیم کی وجہ سے دونوں طرف اقلیتیں باقی رہیں گی۔ دونوں مملکتوں کا بہترین مفاد اس میں تھا کہ وہ فرقہ وارانہ مسئلہ مصالحت کے ساتھ حل کریں اور امن قائم رکھیں۔ قائداعظم نے بار بار اس بات کا اظہار کیا کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کو مسلمانوں کے برابر مساویانہ حقوق اور رعایتیں حاصل ہوں گی۔ قائداعظم کی یقین دہانی پاکستان کی پوری تاریخ میں کارفرما رہی ہے اور یہاں کی اقلیتوں کو کبھی علاقائی اور انفرادی سطح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر بھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ پاکستان کی تشکیل بالآخر ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے درمیان گفت و شنید اور سمجھوتے کے ذریعے عمل میں آئی تھی۔ اس سمجھوتے کا ایک واضح اور لازمی حصہ یہ تھا کہ دونوں مملکتوں میں اقلیتوں کو مساوی حقوق اور قانون کے تحت مناسب تحفظات حاصل ہوں گے۔

لیکن بھارت میں جہاں انصاف اور اصول کے دوسرے تقاضے نظر انداز کیے گئے وہاں اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے حقوق کو پامال کیا گیا یہ صورتِ حال کچھ غیر متوقع نہ تھی مسلمانوں کی سو سالہ تحریک ایسے ہی خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے تھی ۱۹۳۷ء میں مسلم اقلیتی صوبوں میں کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں پر جو زیادتیاں کی تھیں وہ اس کا عملی تجربہ اور مظاہرہ تھا کہ ہندوستان متحد رہے یا تقسیم ہو، اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو بڑی مشکلات سے سابقہ پڑے گا۔

پاکستان کی نئی مملکت قائم ہو جانے سے ہندوؤں کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی میں بہت جلد پانچ سے زیادہ مسلم ریاستیں بھارت نے اپنے قبضے میں لے لیں۔ ریاست حیدر آباد اور ریاست جوناگڑھ پر بھارت نے فوجی حملے کے ذریعے قبضہ کیا اور بعض ریاستوں کو جبر و تشدد اور ترغیب و لالچ سے اپنے تسلط میں لے لیا۔ تقسیم کے فوراً بعد مسلمان شہریوں کی املاک کو ہتھیانے کی باقاعدہ مہم شروع ہوئی۔ بعض ایسی تدابیر اختیار کی گئیں کہ مجبوراً مسلمان پاکستان کو ہجرت کر جائیں۔ انہیں نہ صرف اپنی املاک سے بلکہ روزگار کے تمام ذرائع سے بھی محروم کر دیا جاتا۔ لاکھوں مسلمان اس صورت میں مجبور ہو کر بھی ہجرت پر آمادہ ہوئے۔ عمداً ایسی کوششیں کی گئیں کہ مسلمان اپنی زبان اور اپنی تہذیب سے دور ہو جائیں اور ہندو قومیت میں جذب ہو جائیں۔ ان سے کہا جاتا، مسلمان قوم کا اپنی تاریخ، تہذیب اور ثقافت پر زور دینا بھارت کے وسیع تر مفاد کے خلاف ہے۔ ان سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے لیے تشویشناک اور تکلیف دہ وہ فسادات ہیں جو بھارت میں آئے دن کا معمول رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد جو فوری حالات پیش آئے ان کے ورثہ میں جو کچھ مسلمانوں کو ملا وہ ان کا خوف اور عدم تحفظ کا احساس ہے۔ ۸ اپریل ۱۹۵۰ء کو لیاقت علی خاں اور جواہر لال نہرو کے درمیان بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کی طرف سے ایک معاہدہ ہوا تھا کہ دونوں ملک اپنے اپنے علاقوں میں اقلیتوں کو مساویانہ شہری حقوق دیں گے لیکن بھارت نے کبھی اس معاہدے پر عمل نہ کیا اور نہ مسلمانوں کو اس پر یہ اعتماد رہا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کشمیر کا مسئلہ

قانونِ تقسیم ہند کی رو سے ہندوستانی ریاستوں کو تقسیم کے بعد پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کا حق دیا گیا تھا۔ ویسے ریاستوں کے حکمرانوں کو وائسرائے نے یہ تنبیہ کی تھی کہ وہ جغرافیائی تقاضوں کا بھی خیال رکھیں۔

کشمیر کے باشندوں کی ۸۰ فیصد آبادی مسلمان ہے۔ جغرافیائی، اقتصادی، مذہبی اور تمدنی اعتبار سے اس ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ انگریزوں نے یہ ریاست ۷۵ لاکھ روپے کے عوض ایک ڈوگرا سردار گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ ڈالی تھی۔ مسلم اکثریت کی اس ریاست پر نئے حکمرانوں نے تشدد کے ساتھ حکومت کرنا شروع کی اور اس کے جانشینوں نے بھی مسلمان عوام پر جبر سے تسلط قائم رکھا۔ ہندوستان میں سیاسی حقوق کے مطالبے کی تحریک کا اثر کشمیر پر بھی پڑا۔ وہاں بھی اسی نوعیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کے رہنماؤں میں شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس پیش پیش تھے۔ دونوں نے مل کر ایک سیاسی جماعت "مسلم کانفرنس" کی تنظیم کی۔ جب ایک مرحلے پر تحریک نے شدت اختیار کی تو کچھ آئینی اصلاحات عمل میں آئیں اور جزوی طور پر منتخب مجلس قانون ساز قائم کر دی گئی۔ کانگریسی لیڈروں نے انہیں یقین دلایا کہ اگر "مسلم کانفرنس" کو غیر فرقہ وارانہ جماعت بنایا جائے تو وہ مہاراجہ کشمیر کے خلاف جدوجہد میں ان کی مدد کریں گے۔ چنانچہ "مسلم کانفرنس" کو "نیشنل کانفرنس" میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن بہت جلد مسلمانوں اور ہندوؤں کے مفادات میں اختلاف سامنے آگیا۔ پھر پاکستان کے مطالبے نے ایک نئی صورتِ حال پیدا کر دی۔ پاکستان کے نام اور تصور میں کشمیر ایک لازمی جزو کے طور پر شامل تھا۔ چنانچہ کانگریس اور لیگ کے درمیان تقسیم ہند کے مسئلے پر کشمکش سے کشمیر بھی متاثر ہوا۔ چوہدری غلام عباس نے لیگ کے مؤقف میں "مسلم کانفرنس" کو بحال کر دیا۔ قائداعظم نے شیخ عبداللہ کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب کانگریسی رہنماؤں نے تقسیم ہند کے منصوبے کو قبول کیا تو ان کی نیت یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو پاکستان کی قطع و برید کی جائے۔ انہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبے کو پاکستان سے الگ رکھنے کے لیے پورا زور لگا لیا لیکن اس صوبے کا بھارت کے ساتھ سوائے کشمیر کے کوئی علاقہ نہ ملتا تھا۔ چنانچہ اس لحاظ سے بھی کشمیر ان کے لیے خاصا اہم تھا اور پھر بجائے خود کشمیر کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ کشمیر پر قبضہ کرنے سے وہ تمام دریا بھارت کے قابو میں آجاتے جن پر مغربی پاکستان کی معیشت کا انحصار ہے اور پاکستان کے نہایت اہم علاقے فوجی اعتبار سے غیر محفوظ ہو جاتے ہیں۔

کانگریسی رہنماؤں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے وسط میں ہندوستان کے حالات کیا ہوں گے اور آزادی کے بعد کشمیر کا مستقبل کیا ہوگا۔ تقسیم کے ان نازک ایام میں انگریزوں کا رویہ کشمیر اور مسلمانوں کے تعلق سے بڑا معاندانہ رہا۔ وائسرائے نے ہندو اکثریت کی دوسری ریاستوں کے معاملے میں، جن کے حکمران مسلمان تھے، انہیں بھارت سے فوری طور پر الحاق کا مشورہ دیا، لیکن کشمیر کے معاملے میں اس نے مہاراجہ کو یہ مشورہ نہ دیا کہ ریاست میں مسلمانوں کی غالب اکثریت کے پیش نظر اس کا قانونی فرض یہ ہے کہ وہ پاکستان سے الحاق کرے۔ انگریزوں کی ایک اور جانبداری ریڈکلف کے سرحدی فیصلوں سے بھی ظاہر ہوئی۔ کشمیر کی کوئی سرحد بھارت سے نہیں ملتی تھی لیکن ریڈکلف نے جو ناانصافیاں کیں انہوں نے بھارت کو پاکستان کے کچھ ایسے علاقے بھی بخش دیے جن کے سبب کشمیر کی سرحد بھارت سے مل گئی اور ریاست کا سڑک کے راستے بھارت سے رابطہ قائم ہو گیا۔

مہاراجہ کشمیر کو معلوم تھا کہ ریاست کے مسلمان لازماً پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں حکومت پاکستان کو بے پایاں مسائل درپیش تھے اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاست کے مسلح ہندوؤں اور فوج نے بھی ریاست کے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے بستیوں پر منظم حملے کرنے شروع کیے۔ مجبوراً مسلمانوں نے بھی راجہ کے خلاف بغاوت کر دی اور لڑائی کی آگ ریاست کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ پاکستان کے بہت سے مسلمان بھی اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے چل پڑے اور ان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہو گئے۔ اس اثنا میں ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ نے [illegible] الحاق کا اعلان کر دیا اور الحاق کی دستاویز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر دستخط کر دیے۔ قائداعظم نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے بھارتی حکومت پر زور دیا کہ وہ ریاست میں غیر جانبدار حکومت قائم کر کے عام رائے شماری کے لیے حالات سازگار بنانے میں مدد دے۔ لیکن بھارتی حکومت نے ایسا نہ کیا۔ جنگ شدید ہوتی گئی۔ بھارتی حکومت نے سلامتی کونسل سے رجوع کیا، جس کے نتیجے میں جنگ بند ہو گئی۔ اس عرصے میں جو علاقے آزاد کرا لیے گئے تھے وہاں کشمیریوں نے آزاد جموں و کشمیر حکومت قائم کر لی۔ بھارت اور پاکستان دونوں نے سلامتی کونسل کی یہ قرارداد منظور کر لی کہ کشمیری عوام کو حق خود ارادیت کے تحت فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن بعد میں بھارتی حکومت نے تعاون نہ کیا۔ انصاف، اخلاق اور بین الاقوامی قانون کے ہر تقاضے کو نظر انداز کرتے ہوئے بھارت نے کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے، لیکن سالہا سال کے بھارتی تسلط کے باوجود کشمیر کے عوام نے بھارت کے جبر اور استبداد کے سامنے ابھی تک سر نہیں جھکایا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سقوطِ حیدرآباد

برعظیم میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے باوجود مسلم حکومت کے چند مراکز ریاستوں کی صورت میں باقی رہ گئے تھے۔ انگریزوں نے بھی اپنی بعض مخصوص مصلحتوں کے تحت انہیں باقی رکھا تھا۔ مسلم ریاستوں میں حیدرآباد اسلامی علوم و ثقافت کا سب سے بڑا سرپرست بنا۔ برعظیم میں اسلامی سلطنت کے خاتمے کے بعد یہ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی آخری یادگار تھی۔ مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی، آئین اور نظمِ حکومت کی ساری صفات اور مغلیہ جاہ و جلال اور دولت و امارت کی ساری روایات وہاں موجود تھیں۔ رواداری اور علم پروری میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ اس کی صنعتی اور مادی ترقی، قدرتی وسائل کی بہتات اور معاشی ذرائع کی فراوانی اور دولت مندی کے سبب اس کو ہندوستان کے دیگر صوبوں اور ریاستوں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ انگریزی عہد کے مسلسل سیاسی انتشار کے باوجود اب تک حیدرآباد کا یہ امتیاز رہا تھا کہ ہندو مسلم مسائل پر رواداری اور غیر جانبدار حکمرانی کے سبب دونوں قوموں کا باہمی ربط و اتحاد مکدر نہیں ہوا تھا۔ وہاں ہندو اور مسلمان دونوں فراغت اور امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن یہ صورتِ حال صرف اس وقت تک رہی جب تک کہ ریاستیں کانگریس کی حکمتِ عملی کا شکار نہ بنی تھیں۔ ۱۹۳۸ء سے کانگریس، آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا نے ریاستوں میں بھی اپنی تحریکیں شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ حیدرآباد کی صورتِ حال بھی اس سے متاثر ہوئی۔ یہاں تک کہ تقسیمِ ہند کا فیصلہ ہونے تک یہاں کی فرقہ وارانہ صورتِ حال خاصی بگڑ چکی تھی۔ کانگریس کا یہ دعویٰ تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھارت کی نئی حکومت کو تمام ریاستوں میں اسی طرح کے بالادستی کے اختیارات حاصل ہوں گے جو برطانیہ کو حاصل تھے۔ حکومتِ حیدرآباد کا یہ جواب تھا کہ برطانوی حکومت نے حیدرآباد کو فتح نہیں کیا اور صدیوں سے اس کی مسلمہ خود مختار تاریخی حیثیت چلی آ رہی ہے، اب برطانیہ کے چلے جانے سے حیدرآباد کی وہی حیثیت بحال ہو جائے گی جو انگریزوں کے آنے سے قبل تھی۔ قانونِ آزادیٔ ہند میں واضح طور پر یہ شق موجود تھی کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزادی کے بعد ریاستوں کو بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک سے الحاق کا حق حاصل ہوگا اور اگر وہ چاہیں تو کسی سے الحاق نہ کر کے آزاد بھی رہ سکتی ہیں۔ چنانچہ اس قانونی گنجائش کے پیشِ نظر نظام حیدر آباد نے ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو اپنی مملکت کی کامل آزادی اور خود مختاری کا فرمان جاری کر دیا۔ اس فرمان میں یہ خیال موجود تھا کہ حیدر آباد کا پاکستان سے الحاق ریاست کے ہندوؤں کو اور بھارت سے الحاق مسلمانوں کے لیے ناقابلِ قبول ہوگا۔ حیدر آباد اس لحاظ سے آزاد رہ کر دونوں ملکوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے گا۔ وائسرائے نے ہندو نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے حیدر آباد کی آزادی سے قطع نظر اس کی جغرافیائی مشکلات کے سبب بھارت میں شرکت پر اصرار کیا۔ جغرافیائی مشکلات کا نکتہ حقیقت پر مبنی نہیں تھا۔ حیدر آباد جغرافیائی حیثیت سے ہندوستان سے گھرا ہوا نہیں تھا، اگر وہ سارے علاقے جو انگریزوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں چھینے تھے، واپس مل جاتے، اور انگریزوں کے جانے کے بعد انہیں اصولاً واپس بھی ملنا چاہیے تھا، تو حیدر آباد کو اپنی مچھلی پٹم کی بندرگاہ مل جاتی اور اس پر ہندوستان کی سرحدوں کے اندر واقع ہونے کی دلیل صادق نہ آتی۔ دراصل یہاں دلیل اور اصول سب کانگریس کے ایجاد کردہ تھے، ورنہ پرتگالی خطہ گوا کسی جغرافیائی اصول کے تحت بھارت کی جارحیت کا شکار نہ ہوتا۔ حیدر آباد کے آزاد رہنے کے سلسلے میں سارے دلائل اس کی حمایت میں تھے، لیکن سرد جنگ اور معاشی ناکہ بندی کے ذریعے اسے بھارت میں شرکت پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد حیدر آباد کے لیے بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ عوام میں ہندو کانگریس کے آلۂ کار تھے اور مسلمان اس کا الحاق پاکستان سے چاہتے تھے۔ بھارت کی عین خواہش تھی کہ وہ کسی طرح حیدر آباد کو اپنی مملکت میں شامل کر لے۔ اس مقصد کے لیے بھارت کی دھمکیوں اور دباؤ کے باوجود نظام حیدر آباد اپنی مملکت کو آزاد اور خود مختار رکھنے پر کمربستہ تھے۔ بھارت کو یہ ڈر تھا کہ کہیں نظام پاکستان سے الحاق کا اعلان نہ کر دیں۔ چنانچہ یہ طے کر لیا گیا کہ حیدر آباد کو کسی قیمت پر بھی پاکستان سے الحاق نہ کرنے دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے کئی طریقوں سے جارحانہ کارروائیاں شروع کی گئیں۔ ہر نئی صبح حیدر آباد کے مسلمانوں پر ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے ظلم و ستم سے شروع ہوتی۔ ان ہندوؤں کو مدراس اور بمبئی سے باقاعدہ تربیت کے بعد مسلح کر کے حیدر آباد بھیجا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے لیے اب وہاں صبر آزما حالات پیدا ہو گئے تھے۔ ان کے تحفظ کے لیے ان کی ایک جماعت "مجلس اتحاد المسلمین" سرگرم ہوئی

محکم دلائل سے مزین.متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حالات سے مجبور ہو کر نظام حیدر آباد نے عبوری طور پر مصلحت کے ایک سمجھوتے پر دستخط کر دیے۔ جس میں بھارت کے مقابلے میں اس کی حیثیت ایک ماتحت کی سی ہوتی۔ لیکن حیدر آباد کی مشکلات میں پھر بھی اضافہ ہی ہوتا رہا۔ مسلمانوں کے خلاف جو مہم ریاست کے ہندوؤں نے شروع کی تھی وہ اب قتل عام میں تبدیل ہو گئی۔ حکومت حیدر آباد نے صورتِ حال سے مجبور ہو کر بھارت کی حکومت کو مطلع کیا کہ وہ حکومتِ ہند کے ساتھ ریاست کے تنازعہ کو اقوامِ متحدہ میں پیش کرے گی۔ بھارت نے اس پر احتجاج کیا کہ حیدر آباد کا مسئلہ بھارت کا داخلی معاملہ ہے۔ حکومت حیدر آباد نے پاکستان سے رابطہ کی کوشش کو بھی ضروری سمجھا۔ قائداعظم جس طرح مسلمانانِ ہند میں مقبول اور عزیز تھے، حیدر آباد کے مسلمان بھی انہیں اپنا قائداعظم سمجھتے تھے۔ پاکستان سے وہاں کے مسلمانوں کی جذباتی وابستگی اس حد تک تھی کہ تحریکِ پاکستان وہاں بھی سرگرم رہی۔ حیدر آباد کے بحران کے دور میں پاکستان اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ پاکستان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے ان علاقوں کے حصول کے لیے یا ریاستوں کے تنازعہ میں بھارت کے خلاف اعلانِ جنگ کر سکے۔ قائداعظم نے حیدر آباد کے بارے میں حکومتِ ہند کو متنبہ کیا کہ وہ کوئی فیصلہ حیدر آباد کی مرضی کے خلاف نہ کرے، خود حیدر آباد کو اپنی قسمت کا مناسب فیصلہ کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ لیکن قائداعظم کے انتقال کے محض دو دن بعد بھارت نے حیدر آباد پر شدید جارحانہ حملہ کر دیا۔ اس نے یہاں بھی حق و انصاف کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ کشمیر کے بارے میں بھارت کا جو موقف تھا، حیدر آباد میں اس کے بالکل برعکس رہا۔

---

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جوناگڑھ اور دیگر مسلم ریاستیں

تحریک آزادی کے دوران کانگریس کے یہ عزائم کہ پورے ہندوستان پر وہ بلاشرکت غیرے خود حکومت کرے، کئی صورتوں میں تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ کشمیر اور حیدرآباد انہی عزائم کے سبب اس کی جارحیت کا شکار ہوئے۔ جبکہ قانونِ آزادیٔ ہند کے مطابق یہ ریاستیں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کی ہر طرح سے مجاز تھیں۔ ہندو ذہنیت نے اصول اور دلیل کے موقف کو، جہاں اس کے مفادات مجروح ہوں، کبھی تسلیم نہیں کیا ہے۔ جوناگڑھ اور دیگر مسلم ریاستوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ آزادی کے فوراً بعد جوناگڑھ نے اپنے آئینی حق کے تحت پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ قائداعظم نے ستمبر ۱۹۴۷ء میں اس ریاست کا الحاق منظور کر لیا۔ یہ واقعہ بھارت کے لیے اذیت ناک اور شدید تھا، اس کے مطابق پاکستان کا ایسے الحاق کو منظور کرنا بھارت کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت میں مداخلت کے مترادف تھا۔ اس احتجاج کے ساتھ ساتھ بھارت نے اس مسئلے کو مسلح ذرائع سے حل کرنے کے لیے بھی تیاریاں شروع کر دیں۔ کاٹھیاواڑ کے لیے ایک منظم فوج ترتیب دی گئی اور بھارتی فوجوں کے ساتھ مل کر کاٹھیاواڑ کی ان ہندو ریاستوں کی فوجوں نے جوناگڑھ کا محاصرہ کر لیا، جو جوناگڑھ کے آس پاس واقع تھیں اور بھارت سے الحاق کر چکی تھیں۔ جوناگڑھ کی معاشی ناکہ بندی کر دی گئی۔ بھارت سے ریلوں کی آمد و رفت بند ہو گئی، چنانچہ جوناگڑھ کے وسائل آمدنی بہت کم ہو گئے اور خوراک کی کمی نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ بمبئی میں گاندھی کے ایک بھتیجے کی صدارت میں جوناگڑھ کی ایک عبوری حکومت قائم کر دی گئی۔ اس عبوری حکومت نے اپنے صدر دفاتر جوناگڑھ کے ایک قریبی علاقے راجکوٹ میں منتقل کر لیے۔ اس نے رضاکار بھرتی کیے اور جوناگڑھ کی حدود میں حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

بھارت اور پاکستان کے مابین جوناگڑھ کے مسئلے پر اور ایسے علاقوں کی آئینی حیثیت پر بہت بحث مباحثہ ہوا۔ اس مسئلے پر پاکستان غیر جانبدارانہ قانونی رائے لینے کے لیے تیار تھا۔ پاکستان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس بات پر بھی رضامند تھا کہ جہاں الحاق متنازعہ ہو وہاں رائے شماری کرا لینا چاہیے۔ لیکن بھارت اس معاملے کو بزورِ طاقت طے کرنے پر تلا ہوا تھا۔ محاصرے اور حملوں نے ایک ہی ماہ میں جوناگڑھ میں اتنی افراتفری پیدا کر دی کہ وہاں کے حکمران اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آنے پر مجبور ہو گئے۔ چند دنوں بعد بھارت نے مانگرول اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ وہ مناودر پر اس سے پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا۔ قریبی علاقوں کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنا کر بھارت کی جدید اسلحہ سے لیس اور تربیت یافتہ فوج جوناگڑھ پر حملہ آور ہوئی۔ صرف دو ہی دن میں شدید تر حملے کے نتیجے میں بھارت نے ساری ریاست پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اس وقت پاکستان کسی طرح جوناگڑھ کا دفاع نہ کر سکتا تھا۔ ایک تو خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا اور دوسرے اس کی افواج ابھی تنظیم کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ بری فوج ان لاتعداد مسائل کے حل میں مصروف تھی جو مہاجرین کی نقل و حرکت سے پیدا ہو گئے تھے۔

جارحیت کے اپنے اس عمل کو بھارت نے اس طور پر پیش کیا کہ اس نے ریاست جوناگڑھ کا انتظام اس کے دیوان کی درخواست پر سنبھال لیا ہے تاکہ بدنظمی اور افراتفری نہ ہو۔ پاکستان نے بھارت کے اس جواز کو تسلیم نہیں کیا۔ حکومت نے مطالبہ کیا کہ بھارت جوناگڑھ سے فوری طور پر اپنی فوجیں واپس بلا لے اور ریاست کے جائز حکمران کی حکومت بحال کر دے۔ چونکہ جوناگڑھ نے پاکستان سے باضابطہ طور پر الحاق کر لیا تھا اس لیے اس کے دیوان کو بھارت کے ساتھ معاہدہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ بھارت کے اس اقدام سے پاکستان کے علاقے اور بین الاقوامی قانون کی صریح بے حرمتی ہوئی ہے۔

کوئی ہوش مند اور باشعور فرد جوناگڑھ، مناودر اور مانگرول کے متعلق بھارت کے جواز کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ بھارت کی یہ کارروائی سراسر مداخلتِ بیجا اور کھلی جارحیت تھی۔ حکومتِ پاکستان نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ تینوں ریاستیں بھارت کا جزو ہیں۔

بعض اور ریاستیں، جن کی سرحدیں پاکستان سے ملتی تھیں، پاکستان سے الحاق کے بارے میں تذبذب کی حالت میں تھیں۔ قائداعظم نے بعض ریاستوں کے راجاؤں سے گفتگو کر کے انہیں پاکستان سے الحاق پر آمادہ کر لیا تھا، لیکن بھارت کی ریشہ دوانیاں اور سازشی حربے اس عمل میں رکاوٹ ثابت ہوئے۔ بھارت نے کہیں لالچ اور کہیں دھمکی سے ریاستوں کو بھارت سے الحاق پر مجبور کر دیا۔ بھوپال کے حکمران بھی جو پاکستان سے الحاق چاہتے تھے مجبوری کی حالت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اپنے ارادے سے دست بردار کیے گئے۔ اس سے قطع نظر حیدر آباد، کشمیر اور جونا گڑھ تو اس کی جارحیت کے اعلانیہ شکار ہوئے۔ پاکستان نے نہ صرف اس جارحیت کی مذمت کی بلکہ کشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ میں پیش کرتا رہا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظریۂ پاکستان اور اس کا ارتقاء

برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کا یہ احساس ان میں ابتدا ہی سے موجود رہا ہے کہ وہ ہندوؤں سے قطعی طور پر علیحدہ ایک قوم ہیں۔ اس دو قومی نظریے کا ایک طویل تاریخی پس منظر ہے کہ جب اس سرزمین پر پہلا مسلمان وارد ہوا تو اس نے اپنے آپ کو یہاں کی ہر قوم کے فرد سے بالکل علیحدہ محسوس کیا۔ قائداعظم نے ایک بار کہا تھا کہ جب ہندوستان کا پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ اپنی قوم کا فرد نہ رہا، وہ ایک دوسری قوم کا فرد بن گیا۔ یہ حقیقت ہر موقع پر ظاہر ہوتی رہی ہے کہ اسلام اور ہندو دھرم صرف مذاہب نہیں بلکہ دراصل دو مختلف معاشرتی اور تہذیبی نظام ہیں۔ زبان و ادب، نام و نسب اور روایات و اخلاق ہر لحاظ سے مسلمانوں کا اپنا انفرادی نقطۂ نظر اور فلسفۂ حیات ہے۔ جس وقت سے اسلام ہندوستان میں آیا ہے اس نے کسی نہ کسی انداز میں اپنے منفرد سیاسی اور تہذیبی وجود کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے، حتیٰ کہ یہ کوشش تحریکِ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ قومیت کے علیحدہ تصور نے ہی پاکستان کو حقیقت سے ہمکنار کیا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران جو عوامل کارفرما رہے، وہ یہ تھے کہ ہندو اور مسلمان ہر اعتبار سے دو علیحدہ قومیں ہیں۔ لہٰذا ان دونوں قوموں میں مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے نمایاں فرق ہے اور ان کے مقاصدِ حیات بھی علیحدہ ہیں اس لیے ایک بڑی تعداد والی قوم کے ساتھ مسلمانوں کا مستقبل متحدہ ہندوستان میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ چونکہ ماضی میں مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے تلخ تجربات حاصل ہوتے رہے ہیں اس لیے مسلمانوں کو ہندوستان میں مکمل اور یقینی تحفظ حاصل رہنا چاہیے یا ہندوستان کی تقسیم ہونی چاہیے۔ پھر تقسیم کے بعد مسلمان اپنے ماتحت علاقوں یا پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کریں گے۔

پاکستان کا قیام دراصل مسلمانوں کی اس طویل ہزار سالہ جدوجہد کا نتیجہ ہے جس کے تحت مسلمان ہر زمانے میں اپنی جداگانہ ہستی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان کی اس انفرادیت کو مٹانے اور انہیں اپنے اندر ضم کرنے کی غرض سے ہندوؤں نے ان پر مختلف محاذوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے حملہ کیا۔ ایک محاذ تو میدانِ جنگ تھا کہ وقت آنے پر وہ اپنی تمام فوجی قوتوں کو متحد کر کے مسلمانوں کے مقابلے میں لے آتے تھے۔ محمد بن قاسم سے احمد شاہ ابدالی تک جس نے بھی ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا آغاز یا احیاء کیا، اسے اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوؤں کا دوسرا محاذ سیاسی اور تہذیبی تھا۔ عملاً مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم تسلیم کرنے کے باوجود ہندو ان کی جداگانہ حیثیت کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ سیاسی میدان میں ہمیشہ ہندو مسلم بھائی چارے کا نعرہ گونجا اور دونوں کو ایک ہی قوم ثابت کرنے میں سارا زور صرف کر دیا گیا۔ مقصد صرف ایک تھا کہ اکثریت کے بل بوتے پر حکومت کے اختیارات ہندوؤں کے ہاتھ میں رہیں اور مسلمان ان کے غلام بن جائیں۔ ان کے نفرت انگیز رویے نے کبھی اردو زبان کی مخالفت کا روپ دھارا اور کبھی گائے کے تحفظ کا۔ کسی نے مسلمانوں کو غیر ملکی حملہ آور قرار دے کر عرب لوٹ جانے کی تلقین کی اور کسی نے اس بات پر زور دیا کہ وہ اپنے مذہب، تاریخ، روایات اور تہذیب ہر شے کو ترک کر کے اپنے آپ کو ہندو قومیت میں جذب کر دیں۔ مسلمانوں نے اس صورتِ حال کا ہر موقع پر پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ ان کے لیے یہ مسئلہ انگریزی عہد میں زیادہ شدید صورت اختیار کر گیا تھا۔ اب انگریز یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے زوال کی انتہا تک پہنچ جائیں۔ اس کی وجہ محض یہ نہ تھی کہ مسلمان یہاں کے سابق حکمران تھے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ وہ دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ دینی اخوت کے رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ رشتہ انگریزوں کے لیے بھی تشویش کا باعث بن سکتا تھا۔ چنانچہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہندوستان میں اسلام ایک قوت نہ بن سکے۔ مسلمانوں کے سامنے ہندوؤں اور انگریزوں کے مشترکہ مقاصد پوری طرح نمایاں تھے۔ وہ محض ہندوستان میں بسنے والی ایک قوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے قومی وجود کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے متعدد مرتبہ بغاوت کی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان کے ملی وجود کو غیر قوموں کے ساتھ اشتراک سے روکا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کی قومی حیثیت کو مزید تقویت پہنچائی تھی۔ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے ایک طویل عرصہ تک دشمنانِ اسلام کے خلاف جہاد کیا، جو ان کے پیروؤں کے طفیل بیسویں صدی کے اوائل تک جاری رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بھی مسلمان ہی پیش پیش تھے، بلکہ یہ انہی کے دم قدم سے شروع ہوئی تھی اور انہی کی تباہی پر ختم ہوئی۔ بعد میں بھی اسی اضطراب اور بے چینی کے نتیجے میں مسلمانوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اکثر مواقع پر اپنے اس مزاج کا مختلف تصوراتِ آزادی اور ایک آزاد اسلامی مملکت کے تصور کی شکل میں اظہار کیا۔ اس طرح فی الحقیقت مجدد الف ثانی سے لے کر قراردادِ پاکستان تک ایک ہی رویہ اور ایک ہی نظریہ مختلف صورتوں اور مختلف تحریکوں میں کارفرما رہا۔ مسلمانوں کی سیاست برعظیم کی تاریخ میں ہمیشہ ایک متوازی راستے پر چلی ہے اور کبھی ہندو سیاست کے جال میں گرفتار نہ ہوئی۔ مسلمانوں نے اپنی ساری جدوجہد میں اسلام کے اس نظریے اور اس مزاج کا بار بار اظہار کیا کہ وہ غیروں کی غلامی کو کسی صورت قبول نہیں کر سکتے۔ پاکستان کا قیام دراصل اسی مزاج اور اسی نظریے کی عملی صورت ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قراردادِ مقاصد

برصغیر کے مسلمانوں کے لیے صرف ایک آزاد مملکت کا حصول ہی حتمی اور آخری مقصد نہیں تھا بلکہ اس کا حصول اس سرزمین پر ایک اسلامی معاشرے کے قیام، شریعتِ اسلامی کے نفاذ اور عدل و انصاف کی ترویج کا ذریعہ تھا۔ پاکستان کی بنیادیں ایک واضح اور ٹھوس نظریاتی اساس پر رکھی گئی تھیں۔ قراردادِ پاکستان سے ان بنیادوں کی نشاندہی ہوتی تھی۔ یہ مسئلہ کہ یہ بنیادیں نئی مملکت میں کس آئین کے توسط سے استوار ہوں گی، قیامِ پاکستان سے پہلے بھی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ قراردادِ پاکستان میں، جو ہمارے ملی تشخص اور قومی نصب العین کا مظہر ہے، آئینی نظام کی کسی قدر جھلک نظر آتی ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران قائداعظم نے پاکستان کے آئین کی تفصیلات پر اظہارِ خیال سے ہمیشہ گریز کیا۔ انہوں نے ہر موقع پر یہی کہا کہ یہ کام پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کرے گی۔ قائداعظم محض اپنی مرضی سے کوئی لائحہ عمل ترتیب نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ خود قانون دان تھے اور آئین پسندی کا دامن کسی حالت میں بھی ترک نہ کرتے تھے۔ انہوں نے آئین کی تیاری کو دستور ساز اسمبلی کی صوابدید پر منحصر رکھا۔

پاکستان کی قومی سیاسیات کو بالکل ابتدا ہی میں بڑے دشوار حالات کا سامنا تھا۔ آزادی کے بعد پہلا سال ایک نئی انتظامیہ کو ترتیب دینے اور لاکھوں مہاجرین کی آبادکاری اور ریاستوں کے بیحد مشکل اور ہمہ گیر مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں صرف ہو گیا۔ پاکستان کے لیے ایک نئے آئین کی تیاری بھی اس وقت کا ایک اہم اور ضروری مسئلہ تھا۔ قیامِ پاکستان کے وقت قانونِ آزادیٔ ہند کے تحت ۱۹۳۵ء کے قانون کو ہی بعض تبدیلیوں کے ساتھ وقتی طور پر ملک کا کام چلانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ چونکہ یہ پرانا قانون ملک کی نظریاتی ضرورتوں اور تقاضوں پر پورا نہ اتر سکتا تھا، اس لیے نظریۂ پاکستان اور عام قومی احساسات سے ہم آہنگ آئین مرتب کرنے کے لیے فوری طور پر ایک نئی دستور ساز اسمبلی قیامِ پاکستان کے صرف تین ہفتوں بعد ہی تشکیل دی گئی جس نے اپنا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوران ملک کے اندرونی مسائل اور بیرونی خطرات نے قومی جذبات کو مسلسل مضطرب اور منتشر رکھا اور اس دوران قوم کو قائداعظم کی رحلت کے شدید اور المناک سانحے سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ آئین سازی کا فریضہ پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کے سپرد ہوا۔

عام سازگار حالات میں بھی آئین سازی کا کام بہت مشکل اور ہمت آزما ہوتا ہے۔ آئین میں زیادہ سے زیادہ نقطہ ہائے نظر کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے، اس لیے کہ نظریاتی کشمکش اور مفادات میں تصادم کے ساتھ ساتھ لسانی اور علاقائی سوالات بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پاکستان میں آئین ساز اسمبلی کو جن مسائل اور مشکلات سے عہدہ برآ ہونا پڑا وہ گوناگوں اور بہت پیچیدہ ہونے کے علاوہ تعداد کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ تھے۔ اس کے باوجود حصولِ پاکستان کے مقاصد، قومی احساسات اور تقاضے اور پھر آئین سازوں کے عزم و استقلال کا نتیجہ تھا کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی نے مارچ ۱۹۴۹ء میں ایک قرارداد منظور کی جو "قراردادِ مقاصد" کے نام سے مشہور ہے۔ وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علیخان نے اس قرارداد کی منظوری کو حصولِ آزادی کے بعد اس ملک کی زندگی کا اہم ترین واقعہ قرار دیا۔ یہ قرارداد مستقبل کے آئین کی بنیاد بننے والے رہنما اصولوں پر مشتمل تھی۔

اس قرارداد میں پاکستان کا دستور قرآن اور سنت کے مطابق بنانے کا عہد کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا کہ ساری کائنات کی حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اس کے مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے اہلِ پاکستان اقتدار کا استعمال کریں گے۔ پاکستان میں اسلام کے اصولوں کے مطابق جمہوریت، آزادی اور معاشرتی عدل کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے گا اور پاکستان کے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اپنی زندگی کتاب و سنت کی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں۔ اقلیتوں کو اپنے مذہب و تہذیب کے فروغ اور اس پر عمل درآمد کی معقول ضمانت دی جائے گی۔ بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا، عدلیہ کی آزادی محفوظ رہے گی اور ملک کی سالمیت اور آزادی کا تحفظ کیا جائے گا۔

اب یہ موقع تھا کہ مسلمان ایک طویل جدوجہد کے بعد اپنے مقاصد اور اپنے خواب اور تصور کو اس قرارداد کی صورت میں ایک حقیقت کی صورت میں ڈھلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ان کی زندگی میں کئی صدیوں کی طویل اور صبر آزما جدوجہد اور کئی نسلوں کی قربانی سے یہ خوشگوار اور مسرت انگیز مرحلہ آیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان ـــــ بطور تحریکِ اتحادِ اسلامی

برعظیم پاک و ہند اور عالمِ اسلام کا رابطہ اسلام کے دوراوں سے قائم ہے۔ نزولِ اسلام کے بعد آس پاس کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت سے برعظیم پاک و ہند اور دنیائے اسلام کے درمیان ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہو گیا جو آج تک بدستور استوار ہے۔ جو مسلمان یہاں آباد تھے وہ برابر کسی نہ کسی خلافت سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں خلافت کی بیحد عظمت تھی اور وہ اسے اسلامی اقتدارِ اعلیٰ کا مرکز و منبع سمجھتے تھے۔ یہ صورتِ حال یہاں ہمیشہ رہی۔ چنانچہ یہاں کے مسلمانوں میں تحریکِ اتحادِ اسلامی کی مقبولیت کے بڑے امکانات موجود تھے۔ انگریزی عہد میں شاہ ولی اللہ اور ان کے پیروؤں نے خلافتِ عثمانیہ میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔ انہوں نے عام حالات میں تو سیاسی مصلحت کے تحت غیر جانبداری کا اظہار کیا، لیکن یہ طے کر لیا گیا تھا کہ جب بھی دولتِ عثمانیہ اور برطانیہ میں لڑائی ہو تو اس وقت یہ غیر جانبداری ختم کر دی جائے گی۔ شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ محمد اسحاق نے ترکی کی خلافت سے تعاون ضروری سمجھا تھا۔ وہ اپنی تحریک کا مرکز حجاز لے گئے اور وہاں پوری آزادی سے دولتِ عثمانیہ کے ساتھ سیاسی حکمتِ عملی کے تحت تعاون شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ برعظیم میں شاہ ولی اللہ کی تحریک سے وابستہ علمائے "دیوبند" اور "ندوۃ العلماء" نے خلافتِ عثمانیہ کو برعظیم میں مذہبی اہمیت دلانے میں نمایاں حصہ لیا۔

مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال میں جب مختلف اطراف اور صوبوں میں انگریزوں کا تسلط اور اقتدار قائم ہونے لگا تو اس کے ردِ عمل کے طور پر جہاں مختلف اسلامی و سیاسی تحریکیں ان کے خلاف سرگرمِ عمل ہوئیں، وہیں ایک ردِ عمل اس صورت میں بھی ظاہر ہوا کہ سلطانِ ترکی کا نام یہاں کی مسجدوں میں خطبے میں پڑھا جانے لگا۔ مملکتِ حیدرآباد میں تو یہ روایت اس کے سقوط تک برقرار رہی۔ لیکن عالمِ اسلام سے باضابطہ اور مسلسل رابطہ کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی صورت بظاہر ہندوستان میں موجود نہیں تھی۔ یہاں اتحادِ اسلامی کے جذبات دراصل خلافت کے ساتھ وابستہ نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کے عہدِ زوال اور سیاسی غلامی کے دور میں ترکی مسلمانوں کی واحد آزاد اسلامی مملکت کی حیثیت سے باقی تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے سیاسی زوال کے دور میں محض ترکی ایک ایسا ملک نظر آرہا تھا جو مستحکم تھا اور خلافت کی وجہ سے اسے مسلمانوں میں سیاسی مرکزیت حاصل تھی۔

اسلام برعظیم پاک و ہند میں ایک زبردست طاقت ثابت ہوا ہے۔ اس نے دیگر ممالکِ اسلامیہ کے مقابلے میں اقوام اور ذاتوں کے منتشر اجزا کو یہاں ایک قوم کی صورت میں یکجا کر دیا ہے۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اتحادِ اسلامی کے لیے سب سے زیادہ سازگار علاقہ برعظیم ہی ہے۔ یہاں اس کی مقبولیت کے خاصے امکانات موجود تھے۔ کیونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں یہاں اقلیت میں رہے ہیں اور ان کے لیے اتحاد کی ضرورت زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ انہیں اکثریت کے سیاسی اور تہذیبی غلبے کا شدید احساس تھا۔ انہیں ہندو اکثریت سے تحفظ کے لیے اپنے ہم عقیدہ اقوام کا تعاون درکار تھا۔ بیسویں صدی میں تحریکِ خلافت کے پسِ پشت انہی جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار ہوا ہے، جو احمد شاہ ابدالی کے نام شاہ ولی اللہ کے خطوط اور تحریک ریشمی رومال میں بھی موجزن رہے۔ تحریکِ خلافت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا ذہن ایک اور جانب بھی متوجہ ہو رہا تھا۔ وہ سید جمال الدین افغانی کے خیالات سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ تحریکِ آزادی اور پھر تحریکِ پاکستان کے دوران انہیں مولانا محمد علی، علامہ اقبال اور قائداعظم کے وہ خیالات بھی پسند آرہے تھے اور ان کی طمانیت کا باعث بن رہے تھے، جو ان کے وجود کی روحانی بنیادوں اور ان کے ملی رشتوں کی تشریح کرتے تھے۔ انہیں یہ بات پسند آتی تھی جب ان سے کہا جاتا کہ مسلمانوں کا دراصل کوئی خاص وطن نہیں ہے، دنیائے اسلام ناقابلِ تقسیم ہے اور مسلم ملت زمان و مکان میں محدود بھی نہیں۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ جو تحریک صرف برعظیم تک محدود ہو وہ مسلم ملت کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی۔ وہی تحریک کچھ مفید نتائج پیدا کر سکتی ہے جو دراصل تمام دنیا کے مسلمانوں کو اپنے میں سمیٹ لے۔ ان کی سیاست جہاں ایک طرف ہندوستان سے وابستہ تھی، اور مسلم ملت کی جداگانہ ہستی کو وہ ہندوستانی وطنی قومیت میں ضم کر دینے کے حق میں نہیں تھے، وہاں وہ دوسری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرف اسلام کی عالمی ملت کا بھی ایک جزو تھی۔

تحریک پاکستان کے دوران برعظیم کے مسلمانوں نے اپنی ایک مستقل ہستی کی تشکیل کرلی۔ کیونکہ وہ ہندوستان میں اپنے جداگانہ وجود اور مزاج کے اعتبار سے دنیا کی کثیر التعداد مسلم اقوام کا ایک حصہ تھے، جس کا انہیں کامل شعور تھا اور جس کو وہ انتہائی اہمیت دیتے تھے۔ وہ ایک ایسی قوم تھے جو دو دنیاؤں میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ ایک وہ جو بالکل اس کے گرد و پیش کی دنیا تھی اور دوسری وہ جو اس کے روحانی وجود کو قائم رکھنے کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس متوازی حیثیت نے برعظیم کے مسلمانوں کو خود اپنے وجود کو برقرار رکھنے اور پھر اپنے آپ کو اپنے ملی وجود سے وابستہ رکھنے کے لیے سرگرم رکھا، چنانچہ ان کی ہر تحریک، جس کا ایک مرحلہ تحریک پاکستان ہے، اسی جد و جہد کی عکاسی کرتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیامِ پاکستان کا اثر ـــــ عالمِ اسلام پر

برِعظیم پاک و ہند اور عالمِ اسلام کے درمیان اسلام کے دورِ اول سے رابطہ قائم ہے اور اسلامی سلطنت کے دوران یہاں یہ تصور کہ ہندوستان مسلمانوں کے ماتحت ہونے کی وجہ سے دنیائے اسلام کا ایک لازمی جزو ہے، عام طور پر حکمرانوں اور عام مسلمانوں میں موجود رہا ہے۔ چونکہ دیندار مسلمان کسی ایسے شخص سے کامل وفاداری کا اقرار کرنے کے خلاف تھے جس کے پاس اپنے اختیارِ حکومت کے لیے کوئی آئینی منظوری نہ ہو۔ یہ آئینی منظوری مغلیہ سلطنت سے پہلے خلافتِ عباسیہ سے اور اس کے بعد سلطانِ ترکی سے حاصل کرنے کی روایات موجود ہیں۔ آخری دنوں میں ٹیپو سلطان نے سلطانِ ترکی سے اپنے آپ کو تسلیم کرالیا تھا، لیکن یہ ایسا آخری واقعہ ثابت ہوا۔ غیر ملکی حکمرانوں نے ہندوستان اور عالمِ اسلام کے روابط کے اس تسلسل کو توڑ دیا، جو دورِ اول سے قائم تھا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت سے نہ صرف یہ تسلسل ٹوٹا بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بڑا محاذ بھی ختم ہوگیا۔ اس کے بعد کسی حکمران میں انگریزوں کے مقابلے میں خود اعتمادی نہ رہی۔ انگریزوں کو یقین ہوگیا کہ وہ سارے برعظیم پر قابض ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس خطے پر مضبوط گرفت رکھنے کے لیے رفتہ رفتہ یورپ اور برعظیم کے درمیان کے تمام بحری راستوں اور ممالک پر اپنا تسلط جمانا شروع کیا۔ اور یوں مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک اس کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار ہوئے۔ اس طرح ایک بڑی حد تک پورا عالمِ اسلام غیر ملکی اور استعماری طاقتوں کے زیرِ نگین آگیا۔

برعظیم میں صورتِ حال یہ رہی کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں آبادی کی اکثریت ہندوؤں سے ہمیشہ ترجیحی سلوک روا رکھا اور زندگی کے ہر شعبے میں ہندوؤں کو آگے بڑھنے کا موقعہ بہم پہنچایا۔ ان کے مقابلے میں وہ مسلمانوں سے ہمیشہ بدگمان رہے اور انہیں اپنا حریف اور دشمن سمجھتے رہے۔ مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے کچلنے کا سبب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محض یہ نہ تھا کہ وہ یہاں کے سابق حکمران تھے بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ دینی اخوت کے مضبوط رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ رشتہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ان کے لیے کسی بھی وقت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ مسلمانوں سے اس بنیاد پر ہمیشہ خائف اور محتاط رہے اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ برعظیم میں مسلمانوں کو ایک فعال قوت نہ بننے دیں۔

مسلمانوں کے سامنے صورتِ حال کا یہ پہلو پوری طرح اجاگر تھا۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف ہمیشہ اپنا جہاد جاری رکھا اور اپنی مخالفانہ تحریکوں اور کوششوں سے کبھی باز نہ آئے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصے میں کوئی مختصر دور بھی ایسا نہیں گزرا جب وہ کسی نہ کسی جگہ اور کسی نہ کسی صورت میں انگریزوں کے خلاف صف آرا نہ رہے ہوں۔ اس جدوجہد کے دوران وہ اس جذبے اور خواہش سے بھی سرشار رہے کہ نہ صرف وہ خود بلکہ دیگر اسلامی ممالک بھی غیر ملکی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کریں۔ انیسویں صدی میں ترکی اور روس کی جنگوں کے دوران یا بیسویں صدی میں مغربی طاقتوں کی جارحیت کے نتیجے میں ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے ساتھ جو واقعات پیش آتے رہے، ان کے ردعمل میں یہ جذبہ اور خواہش مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ "تحریک ریشمی رومال" اور "تحریک خلافت" اس جذبے کا بہت مثالی اظہار تھا۔ پھر تحریکِ آزادی کے دوران یہ امر ان کے عقیدے کا جزو ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی سے دنیائے اسلام پر غیر ملکی تسلط کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کے خیال میں جس قدر جلد انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا جاتا اتنا ہی عالمِ اسلام کے لیے بہتر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمِ اسلام میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات سے بھی ہندوستانی مسلمان بے تعلق نہ رہے۔ خلافت کے خاتمہ کا سانحہ بھی انہیں مایوس نہ کر سکا۔ انہوں نے عالمِ اسلام کے معاملات میں اپنی دلچسپیاں حسبِ سابق برقرار رکھیں۔ یروشلم میں ۱۹۳۱ء میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس میں ان کی دلچسپیاں شامل تھیں۔ وہ حجاز کے مسئلے میں بھی دلچسپی لیتے رہے اور فلسطین کے مسئلے میں انہوں نے عربوں کی پرزور حمایت کی۔ انڈونیشیا اور دیگر اسلامی ممالک کی تحریکِ آزادی بھی ان کی توجہ اور تائید کا موضوع بنی۔ خود عالمِ اسلام بھی ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت اور توجہ سے بہتر اثرات قبول کرتا رہا ہے۔ انڈونیشیا، ملایا، سوڈان، لیبیا، تیونس، مراکش، نائیجیریا اور الجیریا قیامِ پاکستان کے لیے مسلمانوں کی طویل اور مسلسل جدوجہد سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متاثر ہوئے ہیں اور خود پاکستان نے ان کی جدوجہدِ آزادی کی پرزور اور مخلصانہ تائید وحمایت کی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان ممالک میں جدوجہد آزادی کو مزید تقویت حاصل ہوئی اور وہ زیادہ مستعدی سے سرگرم ہوئے۔ پھر حکومتِ برطانیہ کے لیے بھی کوئی وجہ باقی نہ رہی کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کے ان دور دراز علاقوں تک اپنی طاقت کو پھیلائے رکھے، جو اب ویسے ہی زوال پذیر تھی۔ دیگر استعماری ممالک بھی اب اس بیداری کا مقابلہ کرنے کی اپنے میں زیادہ سکت نہ پاتے تھے، جو ان کے مقبوضہ اسلامی ممالک میں پیدا ہو رہی تھیں۔ گویا قیامِ پاکستان کے آس پاس کا زمانہ عالمِ اسلام کے لیے بڑا انقلاب انگیز اور خوشگوار رہا ہے۔ اب دنیائے اسلام کے اکثر ممالک آزاد ہیں اور ایک تیسری دنیا کی صورت میں اپنا اظہار کر رہے ہیں۔ اتحادِ اسلامی کا وہ خواب اب حقیقت بنتا نظر آ رہا ہے جو سید جمال الدین افغانی، علامہ اقبال اور ملت کے دوسرے اکابر دیکھتے آئے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان میں علماء کا حصّہ (۱)

برعظیم کی سیاست میں علماء کے حصہ لینے کی روایت کافی قدیم ہے۔ مجدد الف ثانیؒ سے لے کر ان علماء تک، جنہوں نے ایک کثیر تعداد میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا، ایک مستقل اور راسخ فکر کارفرما رہی ہے۔ اس دور میں علماء کی سیاسی جدوجہد اس مقصد کے لیے مخصوص رہی ہے کہ ہر قسم کے شرک اور غیر اللہ کی غلامی سے مسلمانوں کو نجات دلائی جائے تاکہ یہ ملک اگر کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام یا وہ جگہ بن جائے جہاں مسلمانوں کو کلی طور پر فکر و عمل کی آزادی ہو۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی بھی ان مجاہدین علماء کے جذبات کو دبا نہ سکی تھی جو شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی سیاسی و فکری تحریک سے متاثر تھے۔ بیسویں صدی کے نصف اول تک مجاہدین مختلف سرحدی علاقوں میں انگریزوں سے اپنی پوری قوت اور وسائل کے ساتھ برسرِپیکار رہے۔ اس دوران علماء کے بعض گروہ چند دینی اور تعلیمی ادارے قائم کر کے طلبہ کو فکری اور سیاسی اعتبار سے تیار کرتے رہے۔ علماء کی کچھ ایسی تحریکیں بھی درپردہ کام کرتی رہیں جو قوم میں ملی و سیاسی شعور پیدا کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد ترکی کے ساتھ، جو خلافت کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی و سیاسی اہمیت رکھتا تھا، نہایت ذلت آمیز سلوک کیا جا رہا تھا۔ اس سلوک کی بڑی ذمہ داری انگریزوں پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ برعظیم کے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف جذبات مشتعل ہو گئے اور اب وہ اس پر کمربستہ ہوئے کہ ہر قیمت پر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ کانگریس اور ہندو بھی اپنی بعض مصلحتوں کے تحت مسلمانوں کے ساتھ اس جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ مسلمانوں نے ایک "مجلسِ خلافت" تشکیل دی، جو اس وقت مسلمانوں کی سب سے زیادہ مؤثر اور فعال جماعت بن گئی۔ تمام قابلِ ذکر علماء اس جدوجہد میں پوری طرح شامل تھے۔ بیسویں صدی میں اس وقت تک علماء کی کوئی الگ سیاست نہیں تھی۔ ویسے مولانا محمود الحسن کی خفیہ تحریک "ریشمی رومال" کا انکشاف ہو چکا تھا اور ہندوستانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

علماء کے سامنے اس تحریک کی مثال موجود تھی۔ اب یہ سوچا جانے لگا تھا کہ مشترکہ مذہبی و سیاسی امور میں علمائے کرام مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض ادا کریں۔ اس وقت ان کے ذہن پر سب سے زیادہ جو جذبہ حاوی تھا، وہ یہی تھا کہ کسی طرح انگریز نکال دیے جائیں۔ "مجلس خلافت" کے ساتھ ہی ساتھ بعض علماء نے ایک "جمعیۃ العلمائے ہند" بھی تشکیل دی تھی۔ ان سب علماء کے اشتراک سے تحریک خلافت نے ایک مؤثر اور ہمہ گیر تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اس وقت عام سیاسی سطح پر بھی ہندو مسلم اشتراک و اتحاد کی ایک فضا طاری تھی، لیکن یہ اتحاد وقتی اور ناپائیدار ثابت ہوا۔ اس قسم کے اتحاد کی برعظیم کی تاریخ میں کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ فوراً ہی ہندوؤں نے کچھ ایسے اقدام کیے جن کے سبب اتحاد کا تجربہ ناکام ہونے لگا۔ "شدھی" اور "سنگھٹن" کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی جارحانہ جماعتیں قائم ہوئیں اور "نہرو رپورٹ" منظر عام پر آئی۔ بیشتر مسلمان رہنما ہندوؤں کے اس طرز فکر سے مایوس ہو کر کانگریس اور اس کی تحریکوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ "جمعیۃ العلمائے ہند" جو کانگریس کی ہمنوا تھی، اندرونی اختلافات کا شکار ہو گئی۔ کانگریس کے ساتھ تعاون اور علیحدگی کے مسئلے پر علماء میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ "جمعیۃ العلماء" کو کانگریس کا ہمنوا رکھنا چاہتا تھا اور دوسرا گروہ ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کو نقصان دہ سمجھتے ہوئے کانگریس سے علیحدگی پر زور دے رہا تھا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کا ایک کثیر گروہ "جمعیۃ العلمائے ہند" اور کانگریس کی تحریکوں سے کنارہ کش ہو گیا۔

جو علماء دو قومی نظریے کے حامی تھے، ایک بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود منظم نہ تھے، وہ اپنے حلقۂ اثر میں دو قومی نظریہ کو عام کرتے رہے۔ جب اپریل ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے یہ اعلان کیا کہ پاکستان میں حکومت کتاب و سنت کی بنیاد پر قائم ہوگی تو اس اعلان کے بعد وہ علماء جو "جمعیۃ العلمائے ہند" اور کانگریس کی تحریکوں سے بددل ہو کر کنارہ کش ہو گئے تھے، اب بڑی تعداد میں لیگ کی حمایت پر آمادہ ہوئے اور انہوں نے تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیا اور اس کی مقبولیت کا سبب بنے۔ ایسے علماء میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع اور مولانا ظفر احمد عثمانی بہت با اثر اور ممتاز تھے۔ ان علماء کی وجہ سے پورے برعظیم میں علماء کی ایک بڑی جمعیت کا تعاون لیگ کو حاصل ہوا۔ اس وقت تحریک پاکستان کو عام کرنے اور علماء کو منظم کرنے کے لیے ایک علیحدہ تنظیم کی ضرورت پر بھی غور کیا گیا۔ چنانچہ علماء کے ایک بہت بڑے اجتماع میں "جمعیۃ العلمائے اسلام" کا قیام عمل میں آیا۔ اس جمعیۃ کا قیام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ تحریک میں علماء کی شرکت کی وجہ سے عام مسلمان، جو علماء سے متاثر رہتے ہیں، تحریک پاکستان میں حصہ لینے لگے۔ نظریۂ پاکستان زیادہ وضاحت سے سامنے آیا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں اور علماء کی ایک بڑی تعداد کانگریس اور "جمعیۃ العلمائے ہند" سے علیحدگی اختیار کر کے مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان میں شمولیت اختیار کرنے لگی۔ اس عمل سے کانگریسی علماء کا اثر بڑی حد تک زائل ہو گیا اور تحریک پاکستان کو خاصی تقویت پہنچی۔ پھر انہی علماء کی بھرپور کوششیں تھیں کہ تقسیم کے موقع پر پاکستان میں شمولیت یا عدم شمولیت کے مسئلے پر ہونے والے انتخابات میں عام مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں رائے دی اور پاکستان کی تشکیل کو یقینی بنایا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان میں علماء کا حصہ (۲)

مولانا اشرف علی تھانوی

علماء کا جو گروہ تحریک آزادی میں شامل ہو کر نظریۂ پاکستان کی حمایت اور مسلم لیگ کے ساتھ اشتراکِ عمل کر رہا تھا، اس میں متعدد نمایاں اور ممتاز افراد شامل تھے، جن کی رہنمائی اور سرکردگی مولانا اشرف علی تھانوی کر رہے تھے۔ وہ علمائے دیوبند میں ایک عالم اور صوفی کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ سیاسی مطمحِ نظر کے لحاظ سے وہ ہمیشہ دو قومی نظریہ کی ترویج کرتے رہے۔ اس اعتبار سے انہیں کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت پسند نہ تھی۔ وہ کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کو ان کی دینی موت کے مترادف سمجھتے تھے۔ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کبھی حقیقی اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انہوں نے تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدمِ تعاون میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی شرکت کی مخالفت کی تھی۔ اس مخالفت کو باضابطہ شکل دینے کے لیے انہوں نے ایک فتویٰ بھی جاری کیا تھا کہ کانگریس کی تحریکِ عدمِ تعاون اور سول نافرمانی اگر ہندوؤں کے اشتراک سے کی جائے تو مسلمانوں کی مذہبی اور اقتصادی زندگی کے لیے نقصان دہ ہے اور ان میں مسلمانوں کی شرکت شرعاً حرام و ناجائز ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندو قائدین کے پیچھے چلیں۔ تاریخ کے ایک طویل دور میں جب ہندو اور مسلمان متحد نہ رہ سکے اور ان کے درمیان ہمیشہ اختلافات موجود رہے تو اب اس دور میں بھی مسلمانوں کو ہندو قائدین سے کوئی بہتر توقع نہ رکھنی چاہیے۔

ہندو سیاست کی مخالفت اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے عقائد اور نظریات کی وجہ سے ان کے تعلقات "جمعیۃ العلمائے ہند" اور علمائے دیوبند کے ایک طبقے سے بہتر نہ رہ سکے۔ اس لیے انہوں نے نہ صرف اس کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا بلکہ دیوبند سے بھی علیحدگی اختیار کر لی، جس سے وہ ایک طویل عرصے سے وابستہ تھے۔ وہ ایک حساس اور باخبر عالم تھے، جنہیں اس وقت مسلمانوں کے زوال اور ان کے مصائب کا مکمل احساس اور شعور تھا۔ وہ اپنی قوم کے جملہ امراض سے واقف تھے اور ان کا علاج بھی کرنا چاہتے تھے۔ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس بات کے آرزومند تھے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو، سارے قوانین کا اجراء احکامِ شریعت کے مطابق ہو اور جہاں شرعی عدالتیں قائم ہوں اور بیت المال قائم ہو اور نظامِ زکوٰۃ رائج ہو۔ وہ کہتے تھے کہ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس مقصد کے لیے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیے اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہیے۔

مسلمانوں کے آئینی اور دینی مفادات کی خاطر ان کی جدوجہد بھی ان کے ملی شعور اور قومی احساسات پر مبنی تھی۔ مسلمانوں کے دستوری معاملات کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرانے کے لیے عدالتوں میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک سب سے پہلے انہوں نے ہی شروع کی۔ پنجاب میں مسلمانوں کو شرعاً وراثت دلوانے کی مہم کی ابتدا بھی انہی کی تحریک پر ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں کانگریسی حکومتوں کے زیرِ اثر جب بعض صوبوں میں دینی مدارس بند کیے جانے لگے تو ان کی بحالی کی بھرپور اور کامیاب تحریک بھی مولانا اشرف علی تھانوی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے سیاسی تحریکوں میں خود کبھی کوئی عملی حصہ نہ لیا، لیکن علماء کی ایک ایسی جماعت کی تربیت کی جس نے آگے چل کر تحریکِ پاکستان میں بھرپور اور سرگرم حصہ لیا۔ اور وہ خود ہمیشہ ایک علیحدہ مسلم مملکت کے لیے دعاگو رہے۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم اور قائداعظم کو سچا اور پکا مسلمان سمجھتے تھے۔ قائداعظم کی لیاقت اور صلاحیت کے قائل تھے اور ان سے خط و کتابت کا رشتہ قائم تھا۔ وہ اس وقت کے حالات میں مسلمانوں کی تنظیم اور قوت کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ چاہتے تھے کہ مسلمان لیگ میں شامل ہو کر اپنی تنظیم اور لیگ کی قوت اور اصلاح کی کوشش کریں۔ ایک "مجلس دعوت الحق" بھی تشکیل دی تھی جس کا مقصد لیگ کے لیے دینی شعائر کی روشنی میں راہِ عمل تجویز کرنا اور اس کی اصلاح کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے متعدد مواقع پر لیگ کے جلسوں میں اور قائدین کے پاس تبلیغی وفود بھیجے جاتے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے نہ صرف پاکستان کی بھرپور تائید کی تھی بلکہ وہ اسے مسلمانوں کی حیاتِ قومی کے لیے ضروری بھی سمجھتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء ہی میں، اس وقت جبکہ ابھی قراردادِ پاکستان بھی منظور نہ ہوئی تھی، قیامِ پاکستان کی پیشگوئی کر دی تھی۔ ان کی اس بشارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیامِ پاکستان ان کے احساسات سے کس قدر قریب تھا۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ خود موجود نہیں رہے لیکن ان کے زیرِ تربیت علماء اس کشت کی آبیاری کے لیے ہمہ تن مصروف تھے اور اس طرح ان کا فیض اور ان کی آرزو حقیقت کا روپ دھار رہی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان میں علماء کا حصہ (۳)

مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا شبیر احمد عثمانی ایک عالم باعمل تھے۔ انہوں نے اپنی شخصیت کی تعمیر میں ایسے مقتدر علماء سے اثرات قبول کیے تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں سرگرم حصہ لیا تھا اور دیوبند میں ایک ایسے ادارے کی تشکیل کی تھی، جس کا ایک بڑا مقصد مسلمان طلبہ کی سیاسی تربیت بھی تھا۔ مولانا عثمانی نے اپنی صلاحیتوں کے طفیل بہت جلد اپنے لیے ایک مرکزی جگہ حاصل کرلی۔ ابتداءً اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے ہندوؤں کے ساتھ مناظرے کیے۔ مولانا محمود الحسن کی انقلابی جمعیت "مؤتمر الانصار" میں شمولیت اختیار کی، جنگِ بلقان کے دوران ترکی کے ہلالِ احمر کے لیے چندہ جمع کیا اور تحریکِ خلافت کے سرگرم کارکن بنے۔ مولانا محمود الحسن "تحریک ریشمی رومال" کی پاداش میں انگریزوں کی شہ پر مالٹا میں قید کردیے گئے تو مولانا شبیر احمد عثمانی نے، جو ان کے رفیقِ خاص کی حیثیت حاصل کرچکے تھے، حکومت کی اس حرکت کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے سارے ملک کا دورہ کیا اور اپنی پرجوش اور مؤثر تقریروں سے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف جذبات مشتعل کیے۔ تحریک خلافت کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں میں وقتی اور مصنوعی اتحاد کی جو فضا پیدا ہوگئی تھی، اس میں اس اتحاد کو تقویت پہنچانے کے لیے رواداری کے طور پر مسلمانوں میں گائے کی قربانی کو ترک کرنے کی تجویز بھی سامنے آئی تھی، چنانچہ علماء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی بھی ایک پرزور اور مؤثر مخالفانہ آواز تھی کہ یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے دب گیا

تحریک خلافت کی ابتدا میں جب علماء کی ایک جماعت "جمعیت العلمائے ہند" قائم ہوئی تو مولانا شبیر احمد عثمانی بھی اس کے رکن منتخب ہوئے اور اس کے کاموں میں شرکت کی۔ لیکن صرف اس وقت تک جب تک یہ جمعیتہ کانگریس کے زیر اثر اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی منکر نہ ہوئی تھی۔ وہ ہندو سیاست کے رویے سے خوب آشنا تھے اور ہندو مسلم اتحاد پر یقین نہ رکھتے تھے۔ وہ کسی ایسی تحریک یا جماعت کو بھی پسند نہ کرتے تھے جس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شامل ہوں۔ کانگریس اور اس کے نظریے سے وہ شدید اختلاف رکھتے تھے۔ انہیں یہ بات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پسند نہ تھی کہ جمعیت کانگریس کی ہمنوا بنے۔ اسی بنا پر انہوں نے جمعیۃ سے علیحدگی اختیار کرلی اور تصنیف و تالیف کے عالمانہ اور بلند پایہ کام میں منہمک ہوگئے۔ لیکن جب جمعیت کے سرکردہ علماء نے کانگریس کی شہ پر متحدہ قومیت کا پرچار شروع کیا اور اپنی مستقل تحریروں کے ذریعے اسے "جمعیۃ العلمائے ہند" کا سرکاری موقف قرار دیا تو اس سے بحث کا جو ایک ہمہ گیر سلسلہ شروع ہوگیا، اس میں مولانا عثمانی نے بھی بھرپور حصہ لیا اور متحدہ قومیت کے نظریے کا رد پیش کیا۔ قائداعظم نے جب مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام شروع کیا اور پاکستان کی تحریک کو پھیلا دیا تو کانگریس کے زیرِ اثر علماء نے بڑی شدت کے ساتھ پاکستان کی مخالفت شروع کردی۔ مسلم لیگ کے لیے یہ ایک بڑا نازک موقع تھا کہ اگر اس کا مؤثر سدباب نہ کیا جاتا تو اس کی تحریک اور عام مسلمانوں کی دیرینہ خواہش ناتمام رہ جاتی اور مسلمانوں کا قومی وجود ہندو قومیت میں ضم ہوجاتا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ان علماء میں تھے جنہوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ پھر عملی سیاست کی طرف متوجہ ہوئے اور اس بات کی کوشش کی کہ ایسے علماء کو متحد کرلیں جو دو قومی نظریے کے قائل ہیں اور اس اعتبار سے تحریک پاکستان کے حامی ہیں۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگئے اور اپنی کوششوں سے ایک جمعیۃ "جمعیۃ العلمائے اسلام" کی تشکیل کی۔ اس جماعت کا قیام علماء کے ایک بہت بڑے اجلاس میں عمل آیا، جو کلکتہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کو اس نئی جمعیۃ کا صدر منتخب کیا گیا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے "جمعیۃ العلمائے اسلام" کی مدد سے تحریکِ پاکستان کی حمایت شروع کی اور پاکستان کے مخالفوں کے اعتراضات کے مدلل جواب دیے۔ تقسیم ہند کے منصوبے میں پاکستان کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے شرط بھی لگائی گئی تھی کہ صوبۂ سرحد اور مشرقی میں سلہٹ صرف اسی وقت پاکستان میں شریک ہوسکیں گے جب وہ علاقے رائے شماری کے ذریعے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ ظاہر کردیں گے۔ ان علاقوں میں کانگریس کا بڑا اثر تھا اور سلہٹ میں ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ اسی دوران مولانا عثمانی نے مسلم لیگ کے ایک سالانہ اجلاس کی صدارت بھی کی۔ اس موقع پر انہوں نے جو خطبۂ صدارت دیا وہ کئی اعتبار سے اہم تھا۔ اس میں انہوں نے نظریۂ پاکستان کی مفصل وضاحت کی اور اس کے حصول کی اہمیت سمجھائی اور مسلمانوں کو آنے والے انتخابات کی اہمیت جتائی کہ وہ مسلمانوں کے مستقبل کے لیے کس قدر فیصلہ کن اور اہم ہیں۔ قائداعظم مولانا عثمانی سے بہت متاثر تھے اور ان کے اثرات کا بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہیں اندازہ تھا۔ چنانچہ صوبۂ سرحد میں، جہاں کانگریس نواز مسلمانوں کا بڑا اثر تھا، مسلمانوں کو ہم خیال بنانے کے لیے اور رائے شماری میں پاکستان کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے قائداعظم نے بطور خاص انہیں صوبۂ سرحد کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس وقت سے لے کر قیام پاکستان کے بعد قرارداد مقاصد، کی منظوری تک مولانا عثمانی کی جدوجہد ایک راسخ اور مثبت جدوجہد کا اعادہ کرتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان میں علماء کا حصہ (۴)

مولانا ظفر احمد عثمانی

مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ فیض سے وابستہ تھے۔ سیاسی مسلک کے لحاظ سے بھی اسی طرز و فکر کے حامل تھے کہ جس پر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کاربند رہے۔ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور دو قومی نظریہ پر کلی یقین تھا۔ تحریکِ خلافت اور تحریک عدمِ تعاون کے دوران یہ بھی کانگریس کے ساتھ مل کر جدوجہد کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے اور ایسی ہر تحریک کو ناجائز خیال کرتے تھے کہ جو غیر مسلم اقوام کے ساتھ مل کر چلائی جائے۔ اپنے نقطۂ نظر کے لحاظ سے نہ صرف مولانا اشرف علی تھانوی کی پیروی کرتے تھے بلکہ سیاسی معاملات میں ان کے دستِ راست اور تحریری و تقریری امور میں ان کے معاون رہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے سیاسی سطح پر اصلاح و تبلیغ کی جو مجلس تشکیل دی تھی یہ اس کے اہم رکن تھے اور تقریباً تمام اہم وفود میں شریک رہتے۔ قائداعظم اور مسلم لیگ سے بھی ان کا مسلسل رابطہ رہا۔ مسلم لیگ کی تحریک کو وہ قومی مقاصد کے لیے ضروری اور مفید سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک حد تک اس کی کامیابی کے لیے ہر موقعہ پر سرگرم رہے۔ دستور ساز اسمبلی کے ایک ضمنی انتخاب میں نوابزادہ لیاقت علی خان امیدوار تھے اور ان کے مقابلے میں کانگریس کی طرف سے مولانا ظفر احمد عثمانی کے ایک عزیز امیدوار تھے، یہ انتخاب مسلم لیگ کی عزت و وقار کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کا احساس کرتے ہوئے مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنے اصولوں کو اہمیت دی اور عملی جدوجہد سے رائے عامہ کو لیگ کے حق میں ہموار کرتے رہے، چنانچہ اس انتخاب میں لیگ کو واضح کامیابی حاصل ہوئی۔

تحریکِ پاکستان کے نازک لمحات میں جبکہ دو قومی نظریہ اور تحریکِ پاکستان کے حامی علماء کی ایک تنظیم کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا، جن علماء نے اس تنظیم کے قیام کو عملی صورت دینے اور علماء کو متحد کرنے کی کوشش کی، ان میں مولانا ظفر احمد عثمانی بھی پیش پیش رہے۔ کلکتہ میں علماء کے ایک بہت بڑے اجتماع میں "جمعیۃ العلمائے اسلام" کی تشکیل کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ ساتھ مولانا ظفر احمد عثمانی کی صدارت میں ایسی کئی قراردادیں منظور ہوئیں جن میں مسلم لیگ کی جدوجہد کی حمایت کی گئی تھی۔ ایک قرارداد میں اس رائے شماری میں مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کے لیے کہا گیا تھا، جو تقسیم ہند کے منصوبے کے تحت سلہٹ اور صوبۂ سرحد میں ہونے والے تھے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی کو علماء کی اس نئی تنظیم کی نائب صدارت تفویض ہوئی۔

پاکستان کے لیے ہونے والے فیصلہ کن انتخابات خود پاکستان اور ان لوگوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے، جو ایک طویل عرصے سے اس کے قیام کی جدوجہد کر رہے تھے۔ مسلم لیگ اور قائداعظم کی خواہش پر اس نازک صورتِ حال میں علماء رائے شماری میں لیگ کے مؤقف کی کامیابی کے لیے سرگرم و مستعد ہوئے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے تقریباً چار ماہ تک مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور پاکستان کے لیے رائے عامہ کو مزید ہموار کرتے رہے۔ اس مقصد کے لیے ایک موقعہ پر انہوں نے لیگ کی حمایت اور کانگریس اور اس کے معاونین کے رد میں ایک فتویٰ بھی جاری کیا۔ رائے شماری میں پاکستان کے موقف کی کامیابی کے لیے انہوں نے بالخصوص سلہٹ کے علاقے کو اپنی تبلیغی جدوجہد کے لیے منتخب کیا۔ وہاں کانگریس اور کانگریس کے حامی علماء کا اثر تھا۔ یہ ایک دشوار گزار مرحلہ تھا لیکن مولانا ظفر احمد عثمانی کی مستقل جانفشانی اور تبلیغی کوششوں کے طفیل پاکستان کے مؤقف کو کامیابی حاصل ہو گئی۔ اسی جدوجہد کا ثمر تھا کہ سلہٹ کا علاقہ پاکستان میں شامل کر لیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ ڈھاکہ ہی میں تھے۔ قائداعظم کی ہدایت کے مطابق پاکستانی پرچم لہرانے کی رسم انہی کے سپرد کی گئی اور حکامِ سلطنت میں پہلے پہل چیف جسٹس سے انہوں نے ہی حلف لیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان میں علماء کا حصہ (۵)

مفتی محمد شفیع

مفتی محمد شفیع تحریک پاکستان کے علماء میں ایک ہمہ گیر امتیاز رکھتے ہیں۔ فراغتِ تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے تھے۔ لیکن عالمِ اسلام اور مسلمانوں کی عام قومی و سیاسی بدحالی کے تقاضے میں عملی سیاست میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔ بلقان کی جنگوں کا زمانہ ان کی نوعمری اور طالب علمی کا تھا۔ اس اعتبار سے یہ ان کی عملی اور قومی سیاست کا بھی ابتدائی عہد تھا کہ جس میں وہ پرخلوص اور سرگرم رضاکارانہ حصہ لے کر مسلمان مجاہدین کی امداد کے لیے چندہ جمع کرتے رہے۔ لیکن اس کے بعد کا ایک بڑا حصہ وہ خاموشی اور متانت کے ساتھ محض علمی و دینی تصنیف و تالیف کے نہایت بلند پایہ اور عالمانہ کاموں میں مصروف رہے۔ اس قسم کے کسی بھی عالم سے، جو ان تھک اور مسلسل تصنیفی کاموں میں منہمک رہتا ہو، بہت کم عملی جدوجہد کی توقع کی جاسکتی ہے، لیکن مسلمانوں کے زوال اور ان کی سیاسی غلامی کے شدید احساس کا نتیجہ تھا کہ ایسے علماء بھی قوم کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا دینے کے لیے کمربستہ ہوگئے اور عملی سیاست کو شعار بنالیا۔ اس وقت علماء کے پیش نظر یہ مسئلہ خاصی اہمیت رکھتا تھا کہ آخر وہ سیاست اور قومی زندگی میں کس رخ کو اختیار کریں؟ آیا کانگریسی اور ہندو نقطۂ نظر کو اختیار کریں اور غیر مسلموں کے ساتھ اپنے قومی وجود کو وابستہ کریں یا اپنے منفرد قومی وجود کو تحفظ دیں اور اس کے فروغ کی جدوجہد میں شریک ہوجائیں اور مسلم لیگ کے ساتھ حصولِ پاکستان کے مقاصد میں تعاون کریں۔ مفتی محمد شفیع ان حالات اور مقاصد سے پہلوتہی نہ کرسکتے تھے جو ہندو سیاست اور کانگریس کے غلبہ کے نتیجے میں مسلمانوں کے قومی وجود کو ختم کردینے کے درپے تھے۔ اپنے اس نقطۂ نظر کے تحت انہوں نے کانگریس کی ماتحت "جمعیۃ العلمائے ہند" سے اختلاف رائے کی بنیاد پر دارالعلوم دیوبند سے مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی پیروی میں ترک تعلق کرلیا۔ یہ فیصلہ ان حضرات کے لیے جس قدر صبر آزما اور رقت انگیز تھا۔ اس کا صحیح اندازہ لگانا آج ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے بچپن، جوانی اور بڑھاپے تک کے تمام شب و روز اسی کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چار دیواری میں گزارتے تھے۔ زندگی کی ولولہ انگیز توانائیاں اس کی تعمیر میں صرف کی تھیں۔ یہ ان کے لیے صرف ایک درس گاہ ہی نہیں امیدوں اور تمناؤں کا مرکز بھی تھا۔ لیکن اب ملک و ملت کی خاطر اسے خیر باد کہنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ "جمعیۃ العلمائے ہند" اور دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی کے بعد جب راسخ الخیال علماء نے "جمعیۃ العلمائے اسلام" تشکیل دی تو مفتی محمد شفیع اس کی مجلسِ عاملہ کے رکن منتخب ہوئے اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اس جمعیت کے قیام سے تحریک پاکستان کی وسعت اور مقبولیت میں بہت نمایاں اضافہ ہوا۔ اسی کے ساتھ مفتی محمد شفیع کی علمی اور تصنیفی کاوشیں اس کے ہمہ گیر اضافے کا سبب بنیں۔ انہوں نے پاکستان کے مطالبے کو برحق ثابت کرنے کے لیے متعدد رسالے تحریر کیے اور ایک بہت سیر حاصل اور مؤثر فتویٰ مرتب کیا۔ اس موضوع پر ان کی ایک مستقل تصنیف "کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" بہت مدلل اور مفصل ہے۔ انہوں نے اس میں مطالبۂ پاکستان کے سیاسی مقاصد کے علاوہ خاص طور پر اس کی شرعی حیثیت کو نہایت تفصیل سے بیان کیا۔ اس مسئلے پر یہ پہلی علمی کتاب تھی، جس میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے روابط، مصالحت اور تعاون کی تمام صورتوں کے علیحدہ علیحدہ شرعی احکام بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ جمع کیے گئے تھے۔ دلائل میں انہوں نے قرآن و حدیث اور فقہی عبارات کی نہایت معتبر شہادتیں پیش کیں۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ تحریکِ پاکستان کی مقبولیت اور کامیابی کے لیے انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض کے دورے کیے اور ہر جگہ تقریروں کے ذریعے فضا کو ہموار کیا۔ خاص طور سے قیام پاکستان کے لیے رائے شماری کے موقع پر صوبۂ سرحد میں، جہاں کانگریسی رہنماؤں کا بڑا اثر اور عمل دخل تھا، پاکستان کی حمایت کے لیے تبلیغی دورے کیے اور کانگریسی اثرات کو زائل کیا۔ تحریکِ پاکستان کے لیے یہ ان کا ایک تاریخی و انقلابی اقدام تھا کہ جس کے نتائج حصولِ پاکستان کے لیے بڑے بار آور ثابت ہوئے۔

یہ ایسے ہی علماء کا اثر تھا کہ عام مسلمانوں میں آزادی کا شوق اور حصولِ پاکستان کے لیے جدوجہد کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور ان کی ایسی کوششوں سے مسلم لیگ کے مقاصد کو حمایت حاصل ہوئی اور وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک پاکستان میں صحافیوں کا حصہ

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کچھ عرصے تک صحافت کا لب و لہجہ قدرے نرم اور مصلحت آمیز تھا اور زیادہ تر اخبارات کی توجہ سیاست کے بجائے مغربی علوم و فنون کی اشاعت پر مرکوز رہی۔ لیکن اس وقت بھی اخبارات ملکی مسائل کے تعلق سے دبی زبان میں حکومت پر نکتہ چینی کر لیتے تھے۔ اس قسم کے اخبارات میں "شعلۂ طور"، "خیر خواہِ خلق"، "اخبار العالم" اس اعتبار سے نمایاں تھے کہ ان میں سیاسی اور قومی خبریں عام طور پر شائع ہوتی تھیں اور ان میں انتظامی امور کے سلسلے میں حکومت کو مشورہ دیا جاتا اور بعض اوقات نکتہ چینی بھی کی جاتی۔ بعض اخبارات بالخصوص مسلمانوں کی زبوں حالی کی مختلف صورتوں میں تصویر کشی کرتے اور ان میں قومی و ملی شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے۔ سید احمد خاں نے اپنی تحریک کا ایک آلۂ کار اپنے رسالہ "تہذیب الاخلاق" اور "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی" کو بھی بنایا۔ ان اخبارات کا مجموعی مقصد سید احمد خان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ ایک طرف حکومت اور انگریز قوم کو ہندوستانیوں کے خیالات اور احساسات سے آگاہ کیا جائے، دوسری طرف ہندوستانیوں میں سیاسی ذوق پیدا کیا جائے اور انہیں انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کیا جائے۔ پھر وہ ان اخبارات کے ذریعہ سے قوم کے اندازِ فکر کو نئے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان میں جو خیالات اور نظریات پیش کیے جاتے تھے وہ پہلے پہل عام مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ تھے لیکن رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرے میں ان کا اثر پھیلتا گیا۔ لوگ متوجہ ہوئے اور کچھ افراد نے ان کے زیرِ اثر اپنے طور پر بھی کام شروع کیا۔ مدارسِ اسلامیہ قائم ہوئے، مسلمانوں میں ترقی کا جذبہ بیدار ہوا، جدید علوم سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اعتماد اور اپنی مدد آپ کا احساس رونما ہوا۔ قومی شعور اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں سید احمد خان کی صحافیانہ کاوشوں کا خاص حصہ ہے۔ ان کے زیرِ اثر معاصر اخبارات نے بھی اس روش کو اختیار کیا۔ "آگرہ اخبار" اس اعتبار سے بہت نڈر اور جری ثابت ہوا کہ اس نے اخبار نویسی کو محض بہانہ قرار دیا اور اس کا اصل مقصد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"ہندوستان میں آزادی کا پھیلانا" تھا۔ اس عہد کے دیگر اخبارات میں "خیر المواعظ"، "دبدبۂ سکندری"، "منشورِ محمدی" "ردِّ عیسائیت" میں پیش پیش تھے اور عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ بعض اخبارات عالمِ اسلام کے احوال و کوائف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں میں اخوت اور ملی احساسات کی پرورش کرتے تھے۔ ایسے اخبارات میں "شمس الاخبار" "ناصر الاخبار" "احسن الاخبار" خاص اہمیت کے حامل تھے۔

سید احمد خان کے بعد جن افراد نے صحافت کو اپنے سیاسی نظریات کی ترویج کا ذریعہ بنایا، ان میں عبدالحلیم شرر کو بڑی انفرادیت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے جرائد "دلگداز" اور "اتحاد" کو مسلمانوں کی قومی و سیاسی بیداری کا بھی ایک ذریعہ بنایا لیکن صحافت میں ان کا زیادہ منفرد کارنامہ ان کا رسالہ "مہذب" ہے۔ سیاسی اعتبار سے شرر مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے قائل تھے اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہیں۔ "مہذب" میں انہوں نے ایک اداریہ لکھا تھا جس میں اپنے زمانے کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور علیحدگی کا نظریہ پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ہندو مسلم مسئلے کا یہی واحد حل ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی آبادیاں علیحدہ کر لیں۔ صحافت میں بعد میں اس قسم کے مزید خیالات سامنے آئے۔ لیکن یہ اپنی نوعیت کی پہلی مثال تھی۔ ان کے عہد میں "پلیسہ اخبار" اور "وکیل" جدید رجحانات اور تقاضوں کے حامل تھے۔ حسرت موہانی کا "اردوئے معلیٰ" پرجوش اور ہنگامی سیاست کا علمبردار تھا، اس کے مضامین میں حسرت نے ہمیشہ غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنے مجاہدانہ خیالات پیش کیے۔ اپنے کامل آزادی کے خیالات کو انہوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی الجھنوں کا حل وہ اس میں متعدد مرتبہ بیان کرتے رہے۔ اپنے لب و لہجے کی بنا پر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

بیسویں صدی کی صحافت کا لازمی مزاج سیاست تھا۔ اخبارات نے متعدد سیاسی تحریکوں اور ہنگاموں میں عوام کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور اکثر ان کی رہنمائی اور قیادت بھی کی ہے۔ ابتدائی دور میں "زمیندار" "الہلال" اور "ہمدرد" نے انگریزی حکومت کے خلاف مسلمانوں کے جذبات کو، جو پہلے ہی اشتعال کی حالت میں تھے، اور زیادہ مضطرب اور مشتعل کر دیا، مولانا ظفر علی خاں کا "زمیندار" ہمیشہ مسلمانوں میں بہت مقبول اور مؤثر رہا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.kitabosunnat.com

مولانا ابوالکلام نے "الہلال" کے ذریعے ابتدائی عہد میں ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کی سیاست سے وابستہ کرنے میں نمایاں کام کیا ہے۔ مولانا محمد علی کے "ہمدرد" اور "کامریڈ" قومی مسائل میں مسلمانوں کے جذبات کی پرجوش ترجمانی کرتے تھے۔ خصوصاً مولانا ظفر علی خاں نے ہندو سیاست کے داؤ پیچ کا مؤثر جواب دیا ہے۔ اور کانگریس کے اثر کو زائل کرنے میں قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کے زیرِ اثر "انقلاب" نے بھی ہنگامی اور قومی سیاست میں مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ان کے جذبات کی ہر موقع پر مؤثر ترجمانی کی۔ متعدد تحریکوں میں یہ ہمیشہ دوش بدوش رہا۔ اس کا ایک بہت نمایاں کارنامہ "مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن" کے قیام کا نعرہ تھا۔ اس کی پیشانی پر یہ نعرہ ایک عرصہ تک تحریر ہوتا رہا۔ تحریکِ خلافت کے دوران اخبار "خلافت" نے بھی قومی جذبات کی ترجمانی کی اور یہ بعد میں دو قومی نظریہ کا ترجمان بنا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اس کی کامیابی کے لیے جو اخبار کوشاں رہے ان میں "ایمان"، "احسان"، "منشور"، "تنویر"، "نوائے وقت"، "سرحد"، "ملت"، "الاسلام" "جمہور" اور "تنظیم" بہت پرجوش اور سرگرم رہے۔ یہ اخبارات ان لاتعداد اخبارات میں سے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی تحریکوں کو وسعت اور کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ان میں قومی اور ملی شعور عام کیا اور حصولِ پاکستان کی اہمیت اور ضرورت کی وضاحت کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان میں اردو کا حصّہ

مجدد الف ثانیؒ سے قیام پاکستان تک جس قدر اسلامی تحریکات رونما ہوئیں، ان تحریکات کے حلقۂ اثر میں سارا جنوبی ایشیا اور ان کے مقاصد کے اعتبار سے بالخصوص تمام مسلمان تھے۔ ہر تحریک کا اظہار و بیان زبان ہی کے سہارے ممکن ہے۔ جنوبی ایشیا کی تمام تحریکیں، جو سیاسی اور قومی اہمیت کی حامل ہیں، اردو زبان کے عام استعمال اور اس کے عروج و ترقی کے دور میں رونما ہوئیں۔ چونکہ اردو اٹھارویں صدی تک اپنے وسیع اور عریض ماحول میں عام استعمال کی واحد زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس لیے ان تحریکات کے لیے اردو زبان کا استعمال ناگزیر تھا۔ تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں اس زبان کا استعمال سارے برعظیم کے لیے بڑی حد تک کافی تھا۔ اس صورت میں اسلامی تحریکوں کے علاوہ دیگر قوتوں کی تحریکیں بھی اسی زبان کو استعمال کرنے پر مجبور ہوئیں۔ کیونکہ غیر مسلموں کو بھی اپنی سیاسی تحریکوں کی کامیابی کے لیے مسلمانوں کا تعاون درکار ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے بحیثیت قوم اس زبان کو پروان چڑھایا اور اسے اظہار کا بھرپور اور مؤثر ذریعہ بنایا۔ مسلمانوں نے اس زبان کو چونکہ اپنی کل متاع اور ساری روایات دے دی تھیں، اس لیے ان کے لیے اردو کو ہر موقع پر استعمال کرنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ان کی ہر تحریک بالخصوص اسی زبان کے ذریعے مقبول اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

مجدد الف ثانیؒ کے پیروؤں اور خلفاء نے اسی زبان میں شاعری کی اور اصلاحی کتابیں تصنیف کیں جن کا موضوع یہ تھا کہ اسلامی اصولوں اور قدروں کو ان کی خالص پاکیزگی کے ساتھ قائم رکھا جائے اور انہیں خارجی اثرات سے آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔ شاہ ولی اللہ کے پیروؤں نے اس زبان کے ذریعہ بہت مؤثر کام کیا۔ انہوں نے شاہ صاحب کے افکار کے مطابق اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لیے عام جلسے منعقد کیے اور ان کی تعلیمات کو اردو زبان میں لکھنا شروع کیا۔ ان کی زبان ایسی تھی کہ کم پڑھے لکھے افراد بھی آسانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے سمجھ سکتے تھے۔ شاہ صاحب کے فرزندوں نے متعدد اصلاحی کتابیں تصنیف کیں اور قرآنِ حکیم کے ترجمے کیے۔ یہ خود اردو میں مقصدی اور قومی ادب کی ابتدا کا دور تھا۔ اب اردو اس قابل ہو رہی تھی کہ تمام موضوعات کو سمیٹ سکے اور دوسرے اس زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اس امر کا تقاضا کر رہی تھی کہ یہ اب فارسی کی جگہ لے لے جو ایک طویل عرصہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ ان دو ابتدائی تحریکوں کے بعد کا دور اردو زبان کے عروج اور ترقی کا زمانہ ہے۔ ہر تحریک کے لیے اب اس زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنانا ضروری تھا بلکہ سید احمد شہید کی تحریک اور اس کے بعد رونما ہونے والی ایسی تمام تحریکیں، جو عام مسلمانوں کو مخاطب کرتی تھیں، اسی زبان میں اپنی سرگرمیاں انجام دیتی رہیں۔

برعظیم میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم رکھنے کے لیے اسلام کے بعد بلاشبہ اردو ہی اہم عنصر ہے۔ اگر بیسویں صدی میں برعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کا جائزہ لیا جائے تو یہ پہلو نمایاں نظر آتا ہے کہ یہی زبان تھی جس نے انہیں سیاست میں سرگرم رکھا۔ اس عرصے میں اردو ہندی تنازعہ زبان کے مسئلے سے ہٹ کر مذہبی اور تہذیبی مسئلہ بن گیا تھا۔ مختلف تہذیبی اور مذہبی اقدار کے علاوہ اردو زبان نے بھی مسلمانوں کی توجہ ان کی علیحدہ اور منفرد قومیت کی حفاظت اور اس کے استحکام کی طرف پھیر دی تھی۔ ہندوؤں کی اردو دشمنی کے سبب مسلمانوں کی قومی زندگی میں اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کے تحفظ کا جذبہ بیدار ہوا۔ ان میں دو قومی نظریہ کا احساس، جو ابتدا ہی سے ان میں موجود تھا، اب زیادہ قوی اور شدید ہو گیا۔ اردو ہی کے طفیل مسلمانوں کی قومی زندگی میں وحدتِ خیال و عمل پیدا ہوئی اور مشترک مقاصد کے لیے مل کر کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس زبان کے ذریعے اس کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، عالموں اور جماعتوں نے اور بالخصوص تحریک پاکستان نے اسی کے طفیل ہی قبولیتِ عام حاصل کی۔

یہ زبان برعظیم کے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کی مظہر اور ایک ایسا مجلّیٰ اور مصفّیٰ آئینہ ہے جس میں ان کی زندگی اور تہذیب کے خط و خال پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ اسی لحاظ سے اس کا ادب تمام قومی تحریکات اور اجتماعی کوششوں کا بھی مظہر ہے، جو اس کی حیاتِ اجتماعی کو متاثر کرتی رہی ہیں۔ متعدد عوامل کے نتیجے میں جب قومی تحریکوں کا رخ تحریکِ پاکستان کی صورت اختیار کر گیا تو اردو نہ صرف ان تحریکات کی جدوجہد کو پیش کرتی ہے بلکہ عملاً خود بھی ان میں شریک نظر آتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان میں شاعروں کا حصّہ

برعظیم کے مسلمانوں میں اجتماعی روح پیدا کرنے، ان کے ملّی اور قومی شعور کو بیدار کرنے، اسے تقویت دینے اور سیاسی انتشارات کی مختلف تباہیوں اور بربادیوں کے بعد ان کے مردہ دلوں کو حرارت سے آشنا کرنے میں اردو زبان و ادب نے جو اہم کردار ادا کیا، وہ بہت موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ اردو ادب کے نمایاں خط و خال کے ابھرنے سے قبل برعظیم کے سیاسی جذبات کے اظہار کی تمام خصوصیات، اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق، فارسی ادب میں نظر آتی ہیں۔ اس عرصے میں دکن میں اردو ادب اور بالخصوص شاعری ابتدائی تشکیل کے مراحل طے کر رہے تھے اور وہاں قومی شاعری کی روایات مستحکم ہو رہی تھیں۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا مستقل رواج اورنگ زیب اور اس کے بعد طوائف الملوکی اور سیاسی انتشار کے دور میں فارسی کے پہلو بہ پہلو بڑھنے لگا تھا۔ جب ایہام گوئی یا فضول گوئی کے خلاف مجدد الف ثانیؒ کے پیروؤں اور ان کے حلقے سے تعلق رکھنے والے شاعروں نے تحریک شروع کی تو اردو شاعری کے فروغ اور مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا۔ اب شاعروں کے کلام میں حبِ وطن کے جذبات یا سیاسی انتشار، معاشی بدحالی اور گریز کے احساسات عام طور پر نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں شاعروں کا حساس ذہن نہ صرف اپنے ہی دکھ درد کے احساس سے معمور تھا بلکہ اپنے ماحول اور معاشرے کے اجتماعی انتشار اور اس کی بدحالی سے پوری طرح آگاہ اور متاثر تھا۔ بعض شاعروں نے اس ماحول اور صورتِ حال کے ذمہ داروں پر تنقید اور نکتہ چینی بھی کی اور انہیں معاشرے کی خرابیوں کی اصلاح کی طرف متوجہ بھی کیا۔ اس دور میں میرؔ، سوداؔ، نظیرؔ اور دیگر چھوٹے بڑے بے شمار شاعر اپنے طور پر یہ کام انجام دیتے رہے۔ ان شاعروں نے سلطنت کے زوال کو محض دیکھا ہی نہیں، اس کے نتائج سے وہ متاثر بھی ہوئے تھے۔ سکھوں، مرہٹوں اور پھر انگریزوں کے حملوں میں انہوں نے دکھ اٹھائے اور صدمے برداشت کیے تھے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں اپنے سیاسی اور سماجی ماحول کی ترجمانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہی نہیں، صورتِ حال کو بہتر بنانے کی خواہش کا اظہار بھی ملتا ہے۔ آتش، ناسخ، مصحفی، جرأت اور دیگر متعدد شاعروں کے کلام میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ ذوق، مومن، غالب اور بہادر شاہ ظفر کے کلام میں ماحول کا اضطراب، سیاسی زوال اور محکومی کا احساس تلخ حقائق کی صورت میں نمایاں ہے۔ اکثر شاعروں نے لکھنؤ اور دہلی کے سقوط پر المناک مرثیے بھی لکھے۔ منیر شکوہ آبادی، ظہیر دہلوی، داغ اور حالی نے لکھنؤ اور دہلی کو موضوع بنا کر قوم کے زوال کا مرثیہ کہا۔ اس دور میں جو اسلامی تحریکیں سرگرم رہیں ان میں سے تحریک شاہ ولی اللہ، تحریکِ مجاہدین اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے والوں میں شاعروں کی بھی ایک خاصی تعداد عملی طور پر شریک تھی یا اپنے پرجوش اور ولولہ انگیز کلام سے تحریک کے مقاصد کو عام کرتے رہے۔ معروف شاعروں میں مرزا مظہر جانِ جاناں، خواجہ میر درد، شاہ حاتم خان آرزو اور مصطفےٰ خاں شیفتہ، مجدد الف ثانیؒ کی تحریک سے متاثر ہو کر شعر کہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک سے قمر الدین منت، نظام الدین ممنون، قادر بخش صابر، ذوق، مومن، صدر الدین آزردہ اور شمس الدین فقیر وغیرہ وابستہ تھے۔ تحریک مجاہدین سے مومن بہت قریبی وابستگی رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ خرم علی بلہوری، حاجی امداد اللہ، یعقوب نانوتوی، قاسم نانوتوی وغیرہ بھی تحریکِ مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے اور شاعر تھے۔ جنگِ آزادی کے مجاہدین شعراء میں امام بخش صہبائی، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ، منیر شکوہ آبادی، کفایت علی کافی کے علاوہ متعدد دیگر نام تاریخ کا حصہ ہیں۔

جنگِ آزادی کے بعد علیگڑھ تحریک کے مقاصد کو پورا کرنے میں جن شاعروں نے شہرت حاصل کی ان میں حالی، شبلی اور اسماعیل میرٹھی کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس عہد میں جدید تقاضوں کے پیشِ نظر شاعری میں حقیقت پسندانہ موضوعات پر بکثرت طبع آزمائی کی گئی۔ مولانا شبلی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال نے قومی اور ملی احساسات کو بڑے مؤثر انداز میں اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان شاعروں اور بالخصوص علامہ اقبال نے مسلمانوں میں ملی اور قومی شعور پیدا کرنے اور ان میں آزادی اور اتحادِ اسلامی کے جذبات بیدار کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان شاعروں نے عام مسلمانوں میں ایک آزاد اسلامی مملکت کے قیام کے تصور کو مقبول بنانے میں بھی خاص حصہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ سیماب اکبر آبادی، مولانا ظفر علی خاں، میاں بشیر احمد، محمود اسرائیلی، نعیم صدیقی، اسد ملتانی وغیرہ، قوم کے سیاسی نصب العین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو اپنی نظموں کے ذریعے عام کرتے رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ لاتعداد معروف اور غیر معروف شاعروں نے پاکستان کے حق میں اپنے جذبات و تصورات کو نظموں میں پیش کیا، عوامی نعرے نظم کیے اور پاکستان کے ترانے لکھے۔ بعض شاعروں نے کانگریس اور ہندو سیاست پر نکتہ چینی کی اور ان کے رد میں پرجوش نظمیں لکھیں۔

حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں انہی پرجوش اور ولولہ انگیز نظموں کے ذریعے شاعروں نے اپنے حلقۂ اثر کو بہت متاثر کیا۔ ان کی شاعری کے موضوعات اور مقاصد تحریک پاکستان کی عملی جدوجہد کے مطابق اور حصولِ پاکستان میں معاون اور مؤثر رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان میں ادیبوں و افسانہ نگاروں کا حصّہ

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء قدیم و جدید کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ناکامی کے اثرات اور پھر برعظیم میں رونما ہونے والے بیشمار سیاسی اور معاشرتی عوامل نے بالخصوص مسلمانوں کی زندگی پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ اس کے نتیجے میں ادب اور شاعری بھی متاثر ہوئے اور اپنے عہد کی تحریکات و رجحانات کی ترجمانی کر کے معاشرے کو بھی متاثر کرتے رہے۔ علیگڑھ تحریک نے اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ سید احمد خاں نے پہلی مرتبہ ہر قسم کے موضوعات پر صاف اور سادہ زبان میں ادبی تخلیق کی روایت قائم کی۔ اس کوشش کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ اسی طرز پر لکھنے والوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا، جس نے قوم کے ساتھ اپنے روابط کو اپنی تحریروں کے ذریعے مزید وسعت دی۔ ادب میں مضمون نگاری، ناول، افسانہ اور تنقید کا بھی آغاز ہوا اور قومی مسائل اور موضوعات بھی ادیبوں کے غور و فکر کا ایک حصہ بنے۔ ادب کا یہ دور اپنے مقصد اور موضوع کے لحاظ سے اصلاحی تھا۔ علیگڑھ تحریک کے زیرِ اثر ادیبوں نے ادب اور اس کی مختلف اصناف کے ذریعے پوری قوم کی اصلاح کی تدابیر اختیار کیں۔ سید احمد خاں اس گروہ کے رہنما اور قائد تھے، ان کے علاوہ حالی، شبلی، نذیر احمد، شرر اور محسن الملک اس کے اہم اور ممتاز ادیب تھے۔ انہوں نے ادب میں مقصدیت پیدا کی اور اسے اصلاحِ احوال اور تہذیبِ اخلاق کا ذریعہ بنایا۔ ان کا دل درد قومی سے لبریز تھا اور وہ مسلمانوں کو پستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا نہایت دردمندی اور خلوص کے ساتھ قوم کی بھلائی اور ترقی کے لیے لکھا۔ ان کی تحریروں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، انہیں اپنی پستی اور محکومی کا احساس دلایا اور پھر اس پستی اور ذلت سے نکلنے اور فلاح و ترقی کے راستے پر گامزن ہونے کا حوصلہ دیا۔ ان کی تخلیق کیے ہوئے ادب نے مسلمانوں میں قومی اور سیاسی شعور پیدا کیا اور انہیں اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کر لینے یا حصولِ آزادی کی طرف مائل کیا۔ ان کے زیرِ اثر بہت جلد ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے عہد کی قومی تحریکوں کو بھی تقویت پہنچائی اور نہ صرف برطانوی حکومت پر مناسب موقعوں پر کھلی اور بے باک تنقید کی بلکہ اپنے آزادی کے رجحانات بھی پیش کیے۔ ان میں مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ مولانا ابو الکلام آزادؒ بھی اپنے ابتدائی عہد میں اس طبقے میں شامل رہے۔ مولانا سلیمان ندوی نے اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں میں تاریخی اور قومی اہمیت کا حامل ادب تخلیق کیا۔ دیگر ادیبوں میں مولانا ظفر علی خان، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، مولوی عبدالحق اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے معاصر قومی اور سیاسی مسائل پر بکثرت تحریروں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ بعض رسائل خاص طور پر قومی و سیاسی موضوعات پر مختلف ادیبوں کی تحریریں شائع کرتے تھے۔ "تہذیب الاخلاق"، "الندوہ"، "مخزن"، "الہلال"، "البلاغ"، "دکن ریویو"، "دلگداز"، "علیگڑھ منتھلی"، "الناظر"، "ہمایوں" اور "نیرنگ خیال" وغیرہ قومی و سیاسی مضامین کے اعتبار سے اس لیے ممتاز تھے کہ ان میں جذبات کا پرجوش اور بیباک اظہار ہوتا تھا۔

اردو کے ڈرامہ نگاروں اور افسانہ نگاروں نے بھی مسلمانوں میں ملی اور سیاسی شعور پیدا کرنے اور پھر تحریک پاکستان کو مقبول بنانے میں حصہ لیا۔ اسلامی سلطنت کا دورِ زوال افسانوی ادب میں خصوصاً داستانوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ یہ صنفِ ادب دورِ انتشار میں گریز پائی کی نمایاں مظہر ہے۔ لیکن اس وقت بھی بعض داستانوں میں سیاسی محکومی اور سلطنت کے چھن جانے کا احساس نظر آتا ہے۔ چنانچہ اردو کی معروف داستان "باغ و بہار" میں یہ احساس بہت نمایاں ہے۔

حکومتِ برطانیہ کے عہد میں ناول نگاری ماحول کا فطری تقاضا تھی۔ اور یہ ایسے دور میں شروع ہوئی تھی جب مسلمان پورے طور پر محکوم ہو چکے تھے۔ اور ان میں اصلاحی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ مولوی نذیر احمد اور عبدالحلیم شررؔ ابتدائی ناول نگاروں میں بہت ممتاز ہیں۔ نذیر احمد نے اصلاحی ناولیں لکھیں اور شررؔ نے تاریخی ناولیں لکھیں اور مسلمانوں کو ماضی کی تصویریں دکھا کر انہیں مستقبل اور حال کی تعمیر کا احساس دلایا۔ تاریخی ناول نگاروں نے مسلمانوں میں ملی، قومی اور سیاسی شعور پیدا کرنے میں بہت مؤثر کردار ادا کیا۔ محمد علی طبیبؔ، مرزا محمد سعید، سلطان حیدر جوشؔ، راشد الخیریؔ اور دیگر متعدد ناول نگاروں نے تاریخی اور اصلاحی ناولیں لکھ کر قوم کے مزاج اور رجحانات کی تعمیر میں مناسب حصہ لیا۔ یہی کام آخری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دور میں ایم اسلم، رئیس احمد جعفری، قیسی رامپوری اور اشتیاق حسین قریشی نے انجام دیا۔ مختصر افسانہ نگاروں میں سلطان حیدر جوش اور راشد الخیری نے بالخصوص اصلاحی افسانے لکھے۔ جدید افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی اور ابراہیم جلیس نے اپنے دور کی سیاسی تحریکوں اور آزادی کے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے کئی افسانے تخلیق کیے۔ ڈراموں میں جو موضوع سب سے زیادہ مقبول ہوا وہ تاریخی اور اصلاحی تھا۔ اسلامی تاریخ کے موضوع پر لاتعداد ڈرامے لکھے گئے ایسے تمام ڈرامے پرجوش اور ولولہ انگیز جذبات کے حامل نظر آتے ہیں۔ سیاسی موضوعات کو بھی عام طور پر جگہ دی گئی۔ ڈراموں میں عوام کی بیداری اور ملک کی آزادی کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ مطالبۂ پاکستان کے حق میں بھی بعض ڈرامے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ سید بادشاہ حسین، فضل حق قریشی کے ڈرامے اور خاص طور پر ضیاء سرحدی کا ڈرامہ "پاکستان"، تحریک پاکستان اور مطالبۂ پاکستان کی تائید و حمایت میں اہم اور مؤثر ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان میں طلبہ کا حصّہ

تحریکِ پاکستان میں طلبہ کے حصہ لینے کی روایت کافی قدیم ہے۔ علیگڑھ کالج کے توسط سے سید احمد خان نے مسلمان طلبہ کی ایک ایسی نسل تیار کر دی تھی جس نے بہت جلد ان کے نظریات و مقاصد پر عمل شروع کر دیا اور تحریک آزادی میں سرگرمی سے شمولیت اختیار کی۔ سید احمد خان کی تعلیمی تحریک اور اس کے تحت علیگڑھ کالج کا قیام اپنے نتائج کے لحاظ سے بڑا دور رس اور موثر ثابت ہوا۔ اپنے مقاصد کے اعتبار سے سید احمد خان انگریزوں کے بہت بڑے باغی ثابت ہوئے۔ اگر وہ علیگڑھ کالج نہ قائم کرتے تو برعظیم میں اس قدر سیاسی ہلچل پیدا نہ ہوتی۔ نہ وہ کالج قائم کرتے، نہ نوجوانوں کی ایک پرجوش نسل نکلتی، نہ تحریکِ آزادی اس قدر شدت اختیار کرتی اور نہ برطانوی حکومت کا عرصہ کم ہوتا۔

سید احمد خان نے نوجوانوں میں جن نظریات اور مقاصد کی آبیاری کی، انہوں نے بعد کے عرصے میں ابھرنے والی تمام تحریکوں میں اپنا شدید اظہار کیا ہے۔ مسلم لیگ کے قیام اور مسلم یونیورسٹی کی تشکیل کے لیے جدوجہد میں طلبہ ہراول دستے کے طور پر شریک رہے۔ اس وقت یہ سمجھا جا رہا تھا کہ جو تعلیم حکومت کے زیرِ اثر ہو گی وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کے لیے فائدہ مند اور ان کے قومی تقاضوں کے مطابق نہیں ہو سکتی۔ علیگڑھ کالج سے فارغ التحصیل طلبہ کا ایک پرجوش طبقہ اس خیال کے تحت چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم میں حکومت کا عمل دخل کسی طرح نہ رہے۔ چنانچہ تحریکِ خلافت کے دوران جب عدمِ تعاون کی تحریک شروع ہوئی اور تمام سرکاری اداروں، ملازمتوں اور امداد کو ترک کیا جانے لگا تو تعلیمی ادارے بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ جس قرارداد کے تحت حکومت سے عدمِ تعاون کا فیصلہ کیا گیا تھا اس میں یہ سفارش بھی کی گئی تھی کہ جن تعلیمی اداروں کو حکومت خود چلاتی ہے، یا جن کو امداد دیتی ہے، ان سے طلبہ کو اٹھا لیا جائے۔ اس تحریک کے دوران سرکاری مدارس سے طلبہ کی علیحدگی کی صورت حال نے طلبہ کی ایک کثیر تعداد کو تحریک میں رضاکارانہ حیثیت سے کام کرنے کے لیے آزاد کر دیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ اس سے طلبہ کے سیاست میں حصہ لینے کی روایت عام ہوئی۔ اس تحریک کے دوران طلبہ کے ایک طبقہ کو جب علیگڑھ کالج کی سرکاری امداد کو جاری رکھنے کے فیصلے پر اعتراض ہوا تو انہوں نے ایک جداگانہ درس گاہ "جامعہ ملیہ" قائم کر لی اور اسے خود اپنے وسائل سے باقی رکھا۔ اس وقت عام مسلمانوں اور بالخصوص نوجوانوں پر علامہ اقبال، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خان کے خیالات اور ان کی تحریروں کا بہت نمایاں اور واضح اثر قائم ہو رہا تھا۔ خصوصاً علامہ اقبال کے اتحاد اسلامی، آزادی اور علیحدہ مسلم مملکت کے خیالات نے انہیں بہت زیادہ مشتعل اور مضطرب کر دیا تھا۔ اب نوجوانوں اور طلبہ میں بھی ایسے تصورات اور خیالات جگہ پا رہے تھے جو قوم کے مستقبل کی تعمیر میں ان کے عزائم اور نصب العین کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اس صورتِ حال میں اپنے مسلم رہنماؤں کے نقشِ قدم پر بھی چلتے رہے اور ان میں سے بعض نے اپنے لیے علیحدہ لیکن مثبت راہوں کا انتخاب بھی کیا۔ مولانا محمود الحسن کی تحریک "ریشمی رومال" کا بیشتر دارومدار طلبہ پر ہی منحصر رہا، جس کے تحت طلبہ نے بیرونِ ملک جا کر بھی آزادی کی جدوجہد کو مؤثر اور عام کیا۔

ایسے طلبہ، جنہوں نے بذاتِ خود اپنے تصورات اور مقاصد کو ایک عملی صورت دینے کی کوشش کی اور مسلمانوں کے لیے آزاد اسلامی مملکت کے قیام کی جدوجہد کی، ان میں چوہدری رحمت علی کا نام زیادہ ممتاز اور مسلمانوں میں منفرد ہے۔ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں، اس وقت جبکہ وہ اسلامیہ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے اور مسلمانوں میں آزاد اسلامی مملکت کے تصورات ابھی بہت عام نہیں ہوئے تھے، آزاد اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ بعد میں جب وہ انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے تو مسلم طلبہ کو اپنا ہم خیال بنانے اور ان کو یکجا کرنے کے لیے "پاکستان نیشنل لبریشن موومنٹ" نامی جماعت تشکیل دی، جو طلبہ اور نوجوانوں ہی کے لیے مخصوص رہی۔ اس تنظیم کے تحت انہوں نے متعدد اہم کتابچے شائع کیے اور پاکستان کے حصول کے لیے ایک منظم اور طویل جدوجہد جاری رکھی۔ بہت جلد انہوں نے اپنی تحریک کو انگلستان سے برعظیم تک پھیلا دیا اور طلبہ اور نوجوانوں کی ایک ایسی جمعیت تیار کی جو تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں بہت سرگرم اور فعال ثابت ہوئی۔

اس دوران برعظیم کی دیگر تنظیمیں بھی اپنے اپنے دائرۂ اثر میں کام کرتی رہیں، لیکن ایک بہت سرگرم اور مستعد تنظیم "مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن" کے نام سے ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئی۔ اس کے محرک علیگڑھ کالج کے ایک ممتاز طالب علم محمد نعمان تھے۔ اس تنظیم نے بہت جلد اپنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاخیں ملک کے کئی صوبوں میں قائم کر دیں۔ نوجوانوں میں تحریک پاکستان کو مقبول بنانے میں اس تنظیم نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس نے مسلمان طلبہ کو منظم کرنے اور ان میں اتحاد و اتفاق کی خصوصیات پیدا کرنے اور انہیں حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں سرگرم ہونے کی ترغیب دی۔ اس کے مقاصد اور اس کے دائرۂ کار کے سبب اسے بہت جلد قائداعظم اور دیگر مسلم زعماء اور مسلم لیگ کی ستائش حاصل ہو گئی۔ خود اس تنظیم نے قائداعظم اور مسلم لیگ کی جدوجہد میں ہر مرحلے پر اپنے آپ کو شامل رکھا اور قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں طلبہ کے کردار کی نمائندگی کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان میں خواتین کا حصّہ

خواتین معاشرے کا ایک حساس اور موثر طبقہ ہوتی ہیں۔ معاشرے کے انقلاب اور اضطراب سے اس طبقے کا متاثر ہونا یقینی ہوتا ہے۔ برعظیم کے معاشرے میں قومی اور سیاسی سطح پر جو صورتِ حال بیسویں صدی کے اوائل میں تھی، وہ کئی حیثیتوں میں مسلمانوں سے ایثار و قربانی اور سعی و عمل کا تقاضا کرتی تھی۔ عام مسلمانوں میں قومی و سیاسی بیداری بھی مختلف وقتوں میں ایسی ہی صورتِ حال کا نتیجہ تھی۔ خواتین اپنے آپ کو اس تقاضے اور اس صورتِ حال سے بہت دور نہ رکھ سکتی تھیں۔ یہ وہ وقت بھی تھا کہ جب مختلف معاشرتی انقلابات اور تہذیبی نشیب و فراز کے نتیجے میں خواتین میں تعلیمی اور سیاسی شعور عام ہو رہا تھا اور ان کی معاشرتی اصلاح کے لیے مختلف انفرادی و اجتماعی کوششیں روبہ عمل تھیں۔ ان میں تعلیم عام ہو رہی تھی اور انہوں نے اب قومی اور معاشرتی امور میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ان میں قومی سیاست میں حصہ لینے کی روایت تحریکِ خلافت کے دوران شروع ہوئی۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی والدہ بی اماں نے قومی سیاست میں پیش قدمی کی تھی لیکن ان کا یہ اقدام بعد کی تحریکوں میں خواتین کی ایک بڑی تعداد میں شمولیت کے ذریعے عام ہو گیا۔ ابتداءً بیگم مولانا محمد علی اور دیگر خواتین نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور اس کی نشستوں اور اس کے جلسوں میں حصہ لینا شروع کیا۔

خواتین کے عملی محاذ پر کام کرنے کی صلاحیتوں سے قائداعظم خوب واقف تھے اور ان کی طرف سے پُر امید بھی تھے۔ مسلم لیگ میں شمولیت اور اس کی تحریکوں کو آگے بڑھانے کی کوششوں پر وہ خواتین کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ۱۹۳۵ء کا دستور نافذ ہونے کے بعد جب مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کی گئی اور اسے ہر پہلو سے ایک منظم، فعال اور مکمل عوامی جماعت بنانے کی کوشش کی گئی تو اس مقصد میں بھرپور کامیابی کے لیے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی خاص طور پر زور دیا گیا، جن پر اب تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نوجوانوں اور طلبہ کو منظم اور مستعد کرنے اور خواتین کو بھی اپنے دوش بدوش سرگرم رکھنے کے لیے متعدد طریقۂ کار اختیار کیے گئے۔ مسلمان طالبات کے لیے "مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن" میں ایک متوازی اور ذیلی تنظیم قائم کی گئی، جو بالخصوص نسوانی تعلیمی اداروں اور گھروں میں مسلمان طالبات کو ہم خیال بنانے اور مسلم لیگ کے مقاصد سمجھانے کے لیے مستعد ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسی عرصہ میں عام مسلمان خواتین کو بھی مسلم لیگ سے وابستہ کرنے اور اس کی جدوجہد میں شریک کرنے کے لیے "خواتین مسلم لیگ" کو بہت منظم اور وسیع پیمانے پر مستعد کیا گیا۔ ۱۹۳۸ء سے یہ کام ایک بڑے منصوبے کے تحت کیا گیا۔ ہر صوبے میں خواتین مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی گئیں اور پھر اسی طرح ہر شہر میں ذیلی شاخیں قائم ہوئیں۔ مسلم لیگ کے عام محاذ پر بھی اس سے وابستہ خواتین کی ایک تعداد شریک کار رہی۔ قومی سطح پر خواتین کی نمائندگی کرنے کے لیے اور انتخابات کے موقع پر عام مسلمان خواتین کو ہم خیال بناتے اور پھر مسلم لیگ اور اس کی جدوجہد کے لیے چندہ کی فراہمی میں خواتین مسلم لیگ کی ارکان سرگرم اور فعال رہیں۔ ان کی ان سرگرمیوں کے سبب مسلم لیگ اور قائداعظم کو اپنے مقاصد اور اپنی جدوجہد میں بڑی سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہوتی رہیں۔ خصوصاً انتخابات کے موقع پر، جن میں سے بیشتر انتخابات مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لیے بہت اہم اور فیصلہ کن تھے، خواتین کی عملی جدوجہد نے کامیابی کو اور قریب کیا۔ قائداعظم نے خواتین کی ان کوششوں کو ہمیشہ سراہا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ بالعموم انہیں ہدایتیں اور مشورے بھی دیتے۔ قیام پاکستان سے چند ماہ قبل قائم ہونے والے عام انتخابات میں مسلم لیگ اور پاکستان کے موقف کی کامیابی کے بعض اہم عوامل میں ایک خواتین کی سرگرم جدوجہد بھی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۱)

نواب محسن الملک

نواب محسن الملک حقیقی معنوں میں سید احمد خان کے نائب اور رفیقِ خاص تھے۔ سید احمد خان سے ملاقات کے بعد سے اپنی زندگی کا سارا حصہ انہوں نے سید احمد خان کے مقاصد اور ان کی تحریک کو فروغ دینے میں صرف کیا۔ ۱۸۶۴ء میں وہ "سائنٹیفک سوسائٹی" کے رکن بنے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے بڑی محنت اور خلوص سے کام کیا۔ سیرت طیبہ پر عیسائی مشنریوں اور بالخصوص سر ولیم مور کے اعتراضات کے جواب میں سید احمد خان کی تصنیف "خطباتِ احمدیہ" کو مکمل کرنے میں ان کی مدد کی اور اپنے مضامین کے ذریعے رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں علیگڑھ تحریک کی حمایت مختلف پہلوؤں سے بڑے مؤثر انداز میں کرتے رہے۔ سید احمد خان کے ہر قومی کام میں شریک ہوتے اور ان کی مدد کرتے۔ مسلمانوں کی مختلف پہلوؤں سے اصلاح اور ان کی ترقی کے لیے سید احمد خان نے جو جماعتیں اور ادارے تشکیل دیے، مثلاً "خزینۃ الصناعت"، "انجمن خواستگارانِ تعلیم مسلمانان" اور "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" میں عملی طور پر حصہ لیتے تھے اور اس کے جلسوں میں اپنی مفید اور عالمانہ تقریروں سے مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بناتے۔ سید احمد خان کی طرح وہ بھی مسلمانوں کی قومی زندگی میں انقلاب ضروری سمجھتے تھے اور انہیں اقرار تھا کہ صرف تعلیم ہی اب مسلمانوں کے لیے ایک امید ہے۔

سید احمد خان کے انتقال کے بعد ان ہی کی خواہش کے مطابق ان کے صاحبزادے سید محمود علیگڑھ کالج کے سکرٹری بنے، لیکن اس وقت پیش آنے والے واقعات کے تقاضوں میں نظرِ انتخاب نواب محسن الملک پر پڑی اور پھر انہیں کالج کے انتظامات کو سنبھالنا پڑا۔ جس طرح علیگڑھ کالج سید احمد خان کے خوابوں کی مکمل تعبیر نہیں تھا اسی طرح نواب محسن الملک اس کالج کو مسلمانوں کے لیے ناکافی سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے جدوجہد شروع کی اور کالج کو یونیورسٹی کے درجے تک ترقی دینے کے لیے چندے جمع کرنے کا آغاز کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے عام مسلمانوں کے دلوں میں علیگڑھ تحریک کے متعلق اختلافات بہت کم کر دیے۔ علیگڑھ کالج کی تقریبات اور "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے جلسوں میں مختلف الخیال علماء کو شریک کر کے جو رکاوٹ جدید اور قدیم تعلیم یافتگان میں عرصے سے چلی آتی تھی، اسے بڑی حد تک دور کیا۔ اور اس طرح بڑی حد تک تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے میں کامیابی حاصل کی۔ اردو ہندی کشمکش نے ان کے زمانے میں شدت اختیار کر لی تھی، محسن الملک نے اردو کے تحفظ اور اس کی حمایت کے لیے ایک انجمن قائم کی اور اس میں پرجوش حصہ لیا، لیکن کالج کو برقرار رکھنے کی مصلحتوں کے پیش نظر انہیں اس کام میں مزید شرکت سے باز رہنا پڑا۔

علیگڑھ تحریک میں محسن الملک کا زمانۂ قیادت مفید اور نتیجہ خیز قومی کاموں کے لیے ممتاز ہے۔ انہوں نے ہمیشہ وہی کیا جسے قوم کے صحیح مفاد کے لیے ضروری اور مناسب خیال کیا۔ اس زمانے میں علیگڑھ کالج اور قوم کو جن مسائل کا سامنا تھا، ان کے حل کرنے کے لیے ایسی ہی تدابیر اور فہم و فراست کی ضرورت تھی جو ان کی شخصیت میں یکجا تھیں۔ ایک موقعہ پر جب انہیں معلوم ہوا کہ حکومت ۱۸۹۲ء اور ۱۹۰۴ء کے بعد دستوری اصلاحات کی ایک اور قسط دینا چاہتی ہے جو دستور ساز مجلسوں میں توسیع اور انتخابات کے میدان کو مزید وسیع کر دے گی، تو انہوں نے مسلمانوں کے آئینی تحفظ کے لیے وائسرائے کے پاس نمائندہ مسلم رہنماؤں کا ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا اور پھر اس وفد کی تنظیم کی۔ اس وفد نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو محض ایک اقلیت نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے حقوق اور ذمے داری کا تحفظ دستور کے ذریعے ہو۔ وفد کے خیال میں یہ مقصد دستور ساز مجلس اور حکومت دونوں میں مسلمانوں کی مناسب اور جداگانہ حق نمائندگی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔

اس وفد کی تنظیم کے دوران نواب محسن الملک نے مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے ایک علیحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کی ضرورت شدت سے محسوس کی۔ یہ ضرورت ۱۹۰۶ء کے اواخر میں نواب سلیم اللہ خان کی دعوت پر برعظیم کے مسلمانوں کے ایک نمائندہ اجتماع میں مسلم لیگ کے قیام سے پوری ہوئی۔ اس کے قیام میں نواب محسن الملک بھی پیش پیش رہے اور پھر اس کے جوائنٹ سکرٹری منتخب ہوئے۔ مسلم لیگ کے قیام کے سلسلے میں ان کی کوششیں سید احمد خان اور علی گڑھ تحریک کی سیاسی منزل کے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۲)

نواب وقار الملک

سید احمد خان اور نواب محسن الملک کے بعد مسلمانوں کی قیادت نواب وقار الملک کے ہاتھوں میں آئی۔ انہیں قوم کے دیگر رہنماؤں میں اپنی متانت، بردباری اور درد قومی کے لحاظ سے بڑا امتیاز حاصل ہوا۔ اکثر قومی امور میں سید احمد خان کے ساتھ تعاون کیا اور ان کے شریک رہے۔ ۱۸۶۶ء میں "سائنٹیفک سوسائٹی" کے رکن منتخب ہوئے۔ دو سال بعد ایک مدرسہ "مفید الخلائق" قائم کیا۔ رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے اجراء کے بعد سے اس کے مستقل مضمون نگار بن گئے۔ "سائنٹیفک سوسائٹی" اور اس کے مطبع اور "تہذیب الاخلاق" کا انتظام سید احمد خان نے انہی کے سپرد کر رکھا تھا۔ قوم کی اصلاح اور ترقی کے لیے سید احمد خان کی تعلیمی حکمتِ عملی کو پسند کرتے تھے اور ان کی تعلیمی تحریک میں پیش پیش تھے۔ نواب محسن الملک کی وفات کے بعد علیگڑھ کالج کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ انہی کے عہد نظامت میں مسلم یونیورسٹی کی تجویز منظر عام پر آئی۔ نواب محسن الملک کے عہد میں کالج کا انگریز عملہ مختار کل بن گیا تھا اور انتظامی معاملات میں سکرٹری یا ٹرسٹی بڑی حد تک بے دست و پا ہو گئے تھے۔ وقار الملک نے اختیارات سنبھالتے ہی ٹرسٹیوں کی حیثیت بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس بنا پر پرنسپل اور انگریز عملے نے کالج میں بحران پیدا کرنے کی کوشش کی اور مستعفی ہونے کی دھمکی دی۔ اس موقعہ پر صوبے کے گورنر نے انگریز عملے کی تائید کی اور اس طرح خاصی نازک صورتِ حال پیدا کر دی۔ نواب وقار الملک نے ٹرسٹیوں کو ہم خیال بنا کر فیصلہ کیا کہ جب تک انگریز پرنسپل اور انگریز عملہ انتظامی معاملات میں ٹرسٹیوں کی برتری تسلیم نہ کرے گا اور اپنی ملازمانہ حیثیت میں نہ رہے گا، وہ اطمینان سے نہ بیٹھیں گے چنانچہ انہوں نے بڑی دانشمندی، تدبر اور استقامت سے اس معاملے میں کوششیں کیں۔ یہاں تک کہ گورنر اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور ہو گیا اور انگریز عملہ نواب وقار الملک کی مرضی کے مطابق کام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاری رکھنے پر آمادہ ہوا۔ وہ پہلے ہی کالج میں انگریز عملے کی موجودگی کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ کالج کو انگریزی اور سرکاری اثرات سے محفوظ رکھنے کی یہ پہلی کامیاب کوشش تھی۔

نواب وقار الملک کو قومی سیاست میں سید احمد خان کے نقطۂ نظر سے کُلّی اتفاق تھا۔ دراصل مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کی کوششیں بھی ان کے اسی نقطۂ نظر کا ایک حصہ تھیں۔ ان کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کی پرجوش تحریک اس نقطۂ نظر کے اظہار کا اگلا مرحلہ تھا۔ لیکن حکومت برطانیہ کی نا انصافی اور مخالفت کی وجہ سے یہ یونیورسٹی نواب وقار الملک کی زندگی میں قائم نہ ہو سکی۔ مسلمانوں کی قومی اور سیاسی حالت کے پیشِ نظر ان کی حالت کو بہتر بنانے اور ملکی معاملات میں ان کی مناسب نمائندگی کے لیے ایک خالص مسلم سیاسی انجمن کی ضرورت بھی وہ محسوس کرتے تھے۔ اس ضرورت کے تحت انہوں نے ایک تنظیم کا منصوبہ پیش کیا تاکہ ہندوستان کے مسلمان تمدنی اور سیاسی معاملات کے لیے ایک انجمن قائم کریں، جو اپنی ضروریات اور مطالبات حکومت کے سامنے پیش کرے اور مسلمانوں کی نمائندگی کرے۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء کے اواخر میں "محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن" کا قیام عمل میں آیا۔ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود انہوں نے اس انجمن کی تنظیم اور اس کی شاخیں قائم کرنے کے لیے سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور مختلف شہروں میں اس کے اغراض و مقاصد بیان کر کے مسلمانوں کو اس میں شرکت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ نواب وقار الملک کو اس جماعت کی تنظیم میں نواب محسن الملک اور دیگر رہنماؤں کا تعاون حاصل رہا۔ اس انجمن کا ایک نتیجہ اس صورت میں نکلا کہ مسلمانوں میں عام طور پر سیاسی معاملات میں حصہ لینے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ انجمن تقریباً تین سال تک کام کرتی رہی لیکن باقاعدہ تحریک اور تنظیم کا دور کچھ مدت کے بعد مسلم لیگ کے قیام سے شروع ہوا۔

نواب وقار الملک قوم کے اکثر سیاسی اور قومی امور میں شریک رہتے تھے۔ آغا خان کی سربراہی میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لیے شملہ جانے والے وفد میں انہوں نے مسلمانانِ امروہہ کی نمائندگی کی۔ ان واقعات کے نتیجے میں، جو مسلم لیگ کے قیام کا سبب بنے، ڈھاکہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک نشست کے دوران، جو نواب وقار الملک کے زیرِ صدارت تھی، مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں انہوں نے خطبۂ صدارت پیش کیا۔ پھر وہ مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے۔ ہر وقت قومی و سیاسی خدمات میں مصروف رہتے، یہاں تک کہ جنگِ بلقان و طرابلس کے موقع پر اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۰

گاؤں کا ایک حصہ فروخت کر کے سارا روپیہ امدادی چندے میں دے دیا۔ تقسیم بنگال کے فیصلے کے منسوخ ہونے پر کانپور کی ایک مسجد کے شہید ہونے پر اور ایران میں روس کی مداخلت جیسے واقعات پر بڑی آزادی اور دلیری کے ساتھ تنقید اور نکتہ چینی کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آئندہ حالت کے موضوع پر ایک بہت پر خلوص اور مدلل مضمون تحریر کیا، جس میں سید احمد خان کے سیاسی نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے کانگریس اور ہندو سیاست پر کڑی نکتہ چینی کی۔ یہ مضمون مسلمانوں کی آئندہ حکمتِ عملی کا سنگِ بنیاد بنا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۳)

نواب سلیم اللہ خان

انگریزوں نے جنوبی ایشیا میں ہمیشہ ایسی حکمتِ عملی اختیار کی ہے کہ اپنے اقتدار کو مستحکم اور دیرپا رکھنے کے لیے ملک کی اکثریت ہندوؤں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کریں اور انہیں مطمئن رکھیں۔ جہاں جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوا اور اگر درمیان میں انگریز آئے تو انہوں نے وہی کیا جو ہندو چاہتے تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنی مخصوص حکمتِ عملی کی وجہ سے مشرقی بنگال کو، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، جان بوجھ کر پسماندہ رکھا اور تعلیمی، تجارتی اور سیاسی امور میں اسے نظر انداز کر کے مغربی بنگال کو، جہاں ہندو اکثریت میں تھے، ترقی دینے کی کوشش کی۔ ان حالات میں جن رہنماؤں نے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کی مستقل جدوجہد کی، ان میں نواب سلیم اللہ خان ممتاز اور نمایاں رہے۔

ان کی شخصیت کی تعمیر ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی اصلاح اور فلاحی و رفاہی کاموں میں مشہور تھا۔ ان کے سامنے اپنے خاندان کی قومی و فلاحی خدمات کی طویل روایات موجود تھیں۔ انہوں نے ان روایات کو برقرار رکھا اور پھر ان میں تعلیمی اور سیاسی سرگرمیوں کا اضافہ بھی کیا۔ "انجمن مطیع الاسلام" کے نام سے ایک تعلیمی اور سماجی فلاح و بہبود کی انجمن تشکیل دی جس کے تحت متعدد مدرسے قائم کیے گئے، یتیم خانے بنائے گئے اور کئی شہروں میں مسلمانوں کے مستحق تعلیمی اداروں کو امدادی رقوم دی گئیں۔ علیگڑھ کالج بھی ان کی امداد سے فیض پاتا رہا ہے۔ سید احمد خان کی تحریک سے وہ اس حد تک متاثر اور متفق تھے کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی طرف متوجہ ہوئے اور اب حالات کے پیشِ نظر سیاست میں بھی ان کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔

تقسیمِ بنگال کے واقعہ نے مسلمانوں میں بے پناہ سیاسی شعور پیدا کیا تھا اور ان کو اپنے سیاسی، تہذیبی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کا احساس دلایا تھا۔ اس موقعہ پر نواب سلیم اللہ خان نے بنگالی مسلمانوں کو ایک پرجوش اور مثالی قیادت فراہم کی۔ انہوں نے اس واقعہ پر اپنے تاثرات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیان کرتے ہوئے کہا کہ تقسیم بنگال نے ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کیا ہے اور ہمیں جدوجہد پر آمادہ کیا ہے۔ لیکن ہندوؤں پر اس تقسیم کا شدید ردعمل ہوا۔ حکومتِ برطانیہ نے یہ صوبہ محض اس لیے تقسیم کیا تھا کہ اس سے انتظامی آسانیاں پیدا ہوتی تھیں۔ اس کا ایک اتفاقی نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی۔ ہندو اس صورتِ حال پر کبھی مطمئن نہ ہو سکتے تھے، جس میں ان کے مقابلے میں مسلمانوں کو کسی طرح کا بھی کوئی فائدہ پہنچ جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کے خلاف انہوں نے مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا اور متعدد احتجاجی اور انقلابی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ کانگریس ان سرگرمیوں میں پیش پیش رہی۔ وہ جماعت، جو قومی ہونے کی دعویدار تھی، اب اپنے اصل مقاصد کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے تھی۔ اس وقت مسلمانوں کو بھی ایک ایسی جماعت کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ جو ان میں نظم و ضبط پیدا کر سکے اور ان کے احساسات کی نمائندگی کر سکے۔ اس ضرورت کو نواب سلیم اللہ خان نے زیادہ شدت سے محسوس کیا، جو یہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوؤں کے ناروا اور بے جا احتجاج کے نتیجے میں برطانوی حکومت کا رویہ تبدیل ہو رہا ہے اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم کا فیصلہ منسوخ ہو جائے گا۔ اس احتجاج کے مقابلے میں مسلمانوں کا مؤقف پیش کرنے کے لیے انہوں نے مسلمانانِ ہند کے نام ایک تجویز شائع کی کہ "آل انڈیا مسلم کنفیڈریشن" کے نام سے جلد از جلد ایک جماعت قائم کی جائے۔ پھر انہوں نے نمائندہ مسلمان رہنماؤں کو ڈھاکہ میں جمع ہونے کی دعوت بھی دے دی۔ اسی عرصے میں "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا سالانہ اجلاس بھی منعقد ہونے والا تھا۔ نواب سلیم اللہ خان کی دعوت پر یہ اجلاس بھی ڈھاکہ میں مدعو کیا گیا۔ اسی طرح ان کی کوششوں سے دسمبر ۱۹۰۶ء کے اواخر میں مسلم ہندوستان کے نمائندہ رہنماؤں کا ایک پُرہجوم اجتماع ڈھاکہ میں منعقد ہوا اور جس کا ایک اہم اور تاریخی اہمیت کا حامل نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی قومی اور سیاسی معاملات میں نمائندگی کے لیے ایک بہت مؤثر تنظیم "مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا۔ مسلم رہنماؤں کا یہ ایک تاریخی اقدام تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی سیاست ایک مستقل اور متوازی راہ پر آگے بڑھی ہے اور کبھی ہندو سیاست کے جال میں گرفتار نہ ہوئی۔ نواب سلیم اللہ خان اس کے بعد بھی، اپنے انتقال ۱۹۱۵ء تک، قومی و سیاسی امور میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے امرتسر میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔ اور ۱۹۱۲ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۴)

سید امیر علی

سید امیر علی اپنے عہد میں ایک ممتاز اور منفرد شخصیت کی حیثیت میں نمایاں ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی اور قومی بیداری میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ مسلمانوں کی قومی سیاست اور تحریک آزادی کے معماروں اور رہنماؤں میں ان کو ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہے۔ دورِ جدید کے مسلمان مفکروں اور اسلامی قانون کے ماہروں میں ان کی ایک خاص اور مسلمہ حیثیت ہے۔ اسلام اور اسلامی تاریخ، اسلامی قانون اور سیرتِ طیبہ پر ان کی تصانیف کو نہ صرف اسلامیات بلکہ انگریزی ادب میں بھی ایک گرانقدر اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی اور اسلامی قوانین پر کئی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں اور اسلامی شریعت کے ماہر تسلیم کیے گئے۔ اپنی بے پناہ لیاقت کے سبب زندگی کے ہر مرحلہ میں ممتاز اور نمایاں رہے۔ اسی بنا پر کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ہندوستان میں یہ اعلیٰ ترین عدالتی عہدہ تھا، جو کسی مسلمان کو مل سکتا تھا۔ سبکدوشی کے بعد انگلستان میں مستقل سکونت اختیار کی اور زندگی کے اس دور میں بھی ممتاز اور باوقار رہے۔ ان کو سلطنتِ برطانیہ کے اعلیٰ عدالتی ادارے کی قانونی مجلس کا رکن بنایا گیا جو ایک اعلیٰ ترین اعزاز تھا۔

سید امیر علی اپنی ان تمام حیثیتوں میں اپنے مزاج اور اپنے جذبہ کے طفیل مسلمانانِ ہند کی قومی اور سیاسی حالت سے چشم پوشی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی قومی اور سیاسی بیداری میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اس صورت میں انہوں نے ہندوستان کے مسلم رہنماؤں میں ایک ممتاز مرتبہ حاصل کیا اور مسلمانانِ ہند کے قومی اور سیاسی حقوق کے لیے آئینی جدوجہد اس کامیابی سے کی کہ ان کی کوششیں قومی تاریخ کا ایک اہم حصہ بن گئیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں سید امیر علی کی شخصیت مسلمانوں کے لیے ایک منفرد سیاسی رہنما کی تھی۔ اس دور کے مسلمان رہنماؤں میں صرف وہی ایک ایسے شخص تھے جنہوں نے مغربی اقوام کے سیاسی افکار اور جمہوری تصورات کا بغور مطالعہ کیا تھا اور انگریزوں کی قومی روایات،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاسی نظریات و رجحانات اور جمہوری اداروں سے بخوبی واقف تھے۔ انگریزوں کے بارے میں ان کی معلومات ذاتی واقفیت اور گہرے مشاہدے کا نتیجہ تھیں اور انگریزی عہدِ حکومت میں وہ ہندوستان کے مستقبل کا واضح شعور رکھتے تھے۔ اب وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان میں عنقریب سیاسی جدوجہد کا دور شروع ہو جائے گا اور اس دور میں وہی قوم اپنے حقوق اور مفادات کا تحفظ کر سکے گی جو سیاسی اعتبار سے متحد و منظم ہوگی۔ اپنے اس خیال کے تحت انہوں نے مسلمانانِ ہند کی ایک ملک گیر تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور "سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک قومی و سیاسی جماعت قائم کر دی۔ یہ جماعت کانگریس کے قیام سے بھی نو سال پہلے قائم ہوئی تھی اور یہ سید امیر علی کی سیاسی بصیرت اور دور اندیشی کو ظاہر کرتی تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی مسلمان سیاسی جدوجہد کے ایک نئے اور ولولہ انگیز دور میں داخل ہو رہے تھے۔ اپنے سیاسی حقوق اور جداگانہ حق نمائندگی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا اور مسلم لیگ قائم ہو رہی تھی۔ اس وقت سید امیر علی انگلستان میں مقیم ہو چکے تھے۔ ان کی سیاسی فراست سے یہ حقیقت چھپی نہ رہی کہ ہندوستان کو ملنے والی دستوری اصلاحات میں مسلمانوں کے قومی حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے جنگ دو محاذوں پر لڑی جائے تو زیادہ کامیابی ہوگی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے مسلم لیگ کے قائم ہو جانے پر انہوں نے مسلم لیگ کی ایک شاخ لندن میں قائم کی اور وہاں ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کے حق میں آواز بلند کرنے اور مسلمانوں کا سیاسی مستقبل محفوظ کرنے میں بڑی مدد دی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو سید امیر علی کی اس دور اندیشی اور ان کی قومی خدمات کا اعتراف تھا، چنانچہ وہ کل ہند مسلم لیگ کے بھی صدر منتخب ہوئے۔

سیاسی اور قومی نقطۂ نظر کے لحاظ سے سید امیر علی اس بات کے پرجوش مبلغ تھے کہ مسلمان ہر حیثیت میں ایک علیحدہ اور منفرد قومیت رکھتے ہیں اور اس اعتبار سے ہندوستان کے مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ جداگانہ قوم ہیں اور تمام باشندوں میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہیں جن کو قومیت کے جدید مفہوم کے اعتبار سے ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ قومیت کا یہی تصور تھا کہ سید امیر علی ہندوستانی مسلمانوں کو ملتِ اسلامیہ کا ایک جزو سمجھتے تھے۔ اس طرح ان کی سرگرمیاں بھی صرف اسلامی ہند تک ہی محدود نہیں رہیں۔ انہوں نے تمام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی دنیا کے حقوق و مفادات کی حمایت کی۔ جنگِ بلقان اور جنگِ طرابلس کے دوران عربوں اور ترکوں کی امداد کے لیے "انجمن ہلالِ احمر" قائم کر کے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ترکوں سے انہیں والہانہ محبت تھی۔ چنانچہ ہر نازک موقعہ پر ان کی پر زور حمایت کی۔ "خلافت" کے پرجوش حامی تھے اور اس کو دنیائے اسلام کے اتحاد اور استحکام کی علامت سمجھتے تھے۔ جب "خلافت" کا خاتمہ ہوا تو انہوں نے شدید رنج اور غم کا اظہار کیا۔ اپنے عہد کے تمام قومی احساسات اور سیاسی مطالبات کے اظہار میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اپنی علمی، قومی اور سیاسی خدمات کے لحاظ سے وہ ہر بڑے سے بڑے رہنما کی ہمسری کرتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۵)

آغا خان سوم

سر آغا خان سوم کی حیثیت جہاں ایک کثیر التعداد مسلک اسماعیلیہ کے امام کی ہے اور ان کے ذمے اپنے لاکھوں ماننے والوں کی مذہبی تنظیم و تعلیم، ثقافت اور دنیوی ترقی کی رہبری و امامت کا بھی بارِ عظیم تھا، دوسری طرف وہ برعظیم کے عام مسلمانوں کے رہنما بھی تھے۔ انہوں نے اس حیثیت میں اپنی امامت کا سارا عرصہ اپنی دولت، اپنی قابلیت اور اپنی سیاسی بصیرت اور اپنے اثر و نفوذ اور اقتدار سے دلی جوش اور خلوص کے ساتھ اپنی ملت کی مؤثر خدمات انجام دیں۔

انہیں برعظیم کے سیاسی معاملات سے گہری دلچسپی رہی۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے تعلیمی ترقی کو انہوں نے خاص اہمیت دی۔ اس خصوصیت کے پیشِ نظر سید احمد خان نے انہیں ۱۸۹۷ء میں علیگڑھ کالج میں مدعو کیا اور ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ان کی شخصیت پر نواب محسن الملک کا بھی اثر قائم ہوا، جس کے زیرِ اثر سر آغا خان مسلمانوں کے تعلیمی و سیاسی جیسے خاص مسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ توجہ روز بروز وسیع ہوتی رہی۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں انہوں نے "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔ اس موقعہ پر اپنے خطبے میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی اہمیت و ضرورت پر اظہارِ خیال کیا۔ علیگڑھ کالج کو ترقی دینے میں بھی خاص دلچسپی لی اور اس سلسلے میں سائنس کی تعلیم کے فروغ کے لیے خطیر امدادی رقم بھی کالج کے چندے میں دی۔ اور یورپ میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے طلبہ کو بھیجنے کے لیے اپنے نام سے ایک وظیفہ جاری کیا اور اس وظیفے کے لیے ایک معقول رقم فراہم کی۔ کالج کو مسلم یونیورسٹی کا درجہ دلانے میں بھی ان کی کوششوں کو خاصہ دخل حاصل رہا۔ اس مقصد کے لیے قائم ہونے والی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے اور اس کے لیے سارے برعظیم کا دورہ کیا اور چندہ جمع کیا۔

مسلمانوں کے سیاسی حقوق حاصل کرنے کی تحریکوں اور کوششوں میں بھی مستقل سرگرم اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مستعد رہے۔ ۱۹۰۶ء میں جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ حکومت آئینی اصلاحات کی ایک قسط دینا چاہتی ہے جو حلقہ ہائے انتخابات کو مزید وسیع کر دے گی تو اس وقت مسلمانوں نے اپنے لیے جداگانہ انتخابات کے مطالبے کو پیش کرنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے نواب محسن الملک مستعد ہوئے۔ انہوں نے نمائندہ مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد ترتیب دیا تاکہ وہ شملہ میں وائسرائے کے پاس جا کر مسلمانوں کے مطالبات پیش کرے۔ اس وفد کی قیادت کے لیے انہوں نے سر آغا خاں کو آمادہ کیا۔ اس وفد کی قیادت سر آغا خان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس موقعہ پر انہوں نے وائسرائے کے سامنے جو خطبہ پڑھا وہ مسلمانوں کی سیاست اور ان کے مطالبات کا ایک بنیادی نمونہ ہے جس پر چند ہی ہفتوں بعد مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس مرحلے پر مسلمان رہنما ایک ایسی سیاسی جماعت کے قیام کے بارے میں سوچ رہے تھے جو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کر سکے اور ضرورتاً ان کی نمائندگی کر سکے۔

آغا خان نے اس خیال کے تحت ایک تجویز پیش کی تھی کہ فوری طور پر ہر صوبے میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے انجمنیں قائم کی جائیں اور پھر ایک مرکزی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے، جس سے یہ صوبائی جماعتیں وابستہ ہوں۔ مسلم لیگ کا قیام اس ضرورت کی ایک تکمیل تھی دیگر رہنماؤں کے ساتھ ساتھ آغا خان بھی اس کے قیام میں پیش پیش رہے اور ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک مستقل اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کی تمام جدوجہد مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کے مطالبات کے حق میں رہی۔ ان کی کوششوں سے عالم اسلام اور بالخصوص ترکی اور خلافت کے مسائل بھی علیحدہ نہ رہے۔ ممالک اسلامیہ اور ترکی کے ان مسائل میں بھی، جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد پیش آئے، وہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے رہے۔ اس مقصد کے لیے لندن سے ایک اخبار "مسلم آؤٹ لک" جاری کیا تاکہ تمام دنیا میں مسلمانوں کے جذبات اور خیالات کی اشاعت عام ہو۔

"نہرو رپورٹ" کے جواب میں مسلمان رہنماؤں نے جو "کل جماعتی کانفرنس" کا اہتمام کیا تو اس کے ایک اجلاس کی صدارت آغا خان نے کی اور جداگانہ انتخاب کی ضرورت پر زور دیا۔ گول میز کانفرنس میں بھی انہوں نے مسلمانوں کے حقوق کی پرزور حمایت کی۔ بعد میں گو کہ عملی سیاست میں شریک نہ رہے لیکن مسلمانوں کے حقوق، صوبہ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی اور قائداعظم اور تحریکِ پاکستان کی حمایت کرتے رہے اور قیامِ پاکستان کے خواہش مند رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک پاکستان کے قائدین (۶)

حاجی عبداللہ ہارون

حاجی عبداللہ ہارون کا نام تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان کے ان ممتاز رہنماؤں میں شامل ہے جنہوں نے بے لوث خدمت اور خلوص کے سبب تاریخ میں اپنا نام محفوظ کر لیا ہے۔ بظاہر وہ تجارت و صنعت کے منافع بخش کاروبار سے وابستہ تھے، لیکن ان کی زندگی کا سرمایہ قومی اور فلاح و بہبود کے کاموں میں صرف ہوتا رہا۔ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی کو دور کرنے اور ان میں تعلیم کی ترقی کے لیے ان کی کوششیں مثالی اور مؤثر تھیں۔ پھر وہ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور ان کی بیداری کے لیے بھی ہمیشہ کوشاں رہے۔ عورتوں کے حقوق اور ان کی تعلیمی ترقی کے لیے بھی انہوں نے بڑی مفید خدمات انجام دیں۔ ان کی کوششوں سے دستور ساز اسمبلی میں ایک قانون منظور ہوا جس کی رو سے مسلمان عورتوں کو قانونِ شریعت کے مطابق والدین کی جائیداد سے حصہ ملنے لگا۔ ۱۶ سال تک انہوں نے مرکزی اسمبلی میں اپنے صوبہ سندھ کی نمائندگی کی۔ تحریکِ خلافت کے دوران عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا — اور اس وقت سے تمام قومی تحریکوں میں شامل رہے۔ علی برادران سے ان کے روابط بڑے قریبی اور دوستانہ تھے۔ قائداعظم کے وہ بڑے معتمد دوست اور رفیق تھے۔ علامہ اقبال اور دوسرے ممتاز رہنماؤں سے بھی ان کے قریبی اور ذاتی تعلقات تھے۔ کراچی میں ان کی رہائش گاہ ہندوستان بھر کے ممتاز قائدین کی مہمان گاہ اور قومی و سیاسی جدوجہد کا مرکز تھی۔

سندھ میں تحریکِ خلافت کو ان کی وجہ سے بڑی تقویت اور وسعت حاصل ہوئی۔ وہ ابتدا ہی سے صوبۂ سندھ کی خلافت کمیٹی کے صدر رہے اور پھر مسلم لیگ کی صوبائی شاخ کے بھی صدر منتخب ہوئے۔ وہ کل ہند مسلم لیگ کی مرکزی مجلسِ عاملہ کے بھی رکن رہے۔ مسلم لیگ اور اس کی تحریکوں سے انہیں بڑی دلچسپی رہی۔ اس کی تنظیم اور مقبولیت کے لیے انہوں نے بڑی لگن اور تندہی کا ثبوت دیا۔

صوبۂ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کی تحریک میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ انگریزوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی مخصوص حکمتِ عملی کے تحت سندھ کو بمبئی کے ساتھ ملا دیا تھا، چونکہ اس طرح بعض علاقوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہو گئی تھی اور پھر بمبئی کے ہندو سندھ کے مسلمانوں کے مفادات کو سخت نقصان پہنچایا کرتے تھے، اس لیے مسلمان چاہتے تھے کہ سندھ بمبئی سے علیحدہ ہو جائے تاکہ مسلمانوں کے حقوق محفوظ ہو سکیں۔ انگریز چونکہ ہمیشہ سے ہندوؤں کے فائدے کا خیال رکھا کرتے تھے، اس لیے انہوں نے سندھ کی علیحدگی کے مطالبہ کو اہمیت نہ دی۔ لیکن طویل جدوجہد کے بعد، جس میں حاجی عبداللہ ہارون بھی سرگرم رہے، سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر لیا گیا۔ اگرچہ سندھ ایک علیحدہ صوبہ تو بن گیا لیکن یہاں کے مسلمان متحد اور منظم نہ ہو سکے، لہٰذا ہندوؤں اور کانگریس نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا۔ یہ اسی صورتِ حال کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت ہونے والے انتخابات کے بعد وہ مجموعی طور پر اکثریت میں ہونے کے باوجود سندھ میں مستحکم وزارت نہ بنا سکے۔ حاجی عبداللہ ہارون کو مسلمانوں کی اس کمزوری کا احساس تھا چنانچہ انہوں نے سندھ کے مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے سخت محنت کی اور انہیں کامیابی بھی ہو گئی۔ کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے سندھ میں مسلم لیگ ان ہی کی کوششوں سے منظم ہوئی۔

ہندوؤں اور کانگریس کے عزائم کو دیکھتے ہوئے وہ اب اتحاد کے خیال سے مایوس تو تھے ہی —— لیکن اس مرحلے پر کہنے لگے تھے کہ "ہم اب اس مقام پر آ پہنچے ہیں جہاں سے ہمیں علیحدہ علیحدہ راستے اختیار کرنے ہیں۔ حالات اب اس حد تک خطرناک صورت اختیار کر چکے ہیں کہ مسلمان مستقبل کی حفاظت کے لیے اپنے علیحدہ تہذیبی خطے یا علیحدہ وطن قائم کر لیں۔" اپنی ایک ذاتی تجویز میں حاجی عبداللہ ہارون نے دو علیحدہ وفاقوں میں ہندوستان کی تقسیم کا خیال پیش کیا تھا۔ ان کے خیال میں مسلم وفاق کا مرکزی حصہ شمالی مغربی علاقے اور کشمیر پر مشتمل ہونا چاہیے۔

یہ وہ وقت تھا کہ جب مسلمانوں میں علیحدگی کے اس طرح کے تصورات عام ہو رہے تھے اور اب خود مسلم لیگ بھی علیحدگی کے اس تصور کو "قراردادِ پاکستان" کی صورت دینے والی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی اور مسلمان حصولِ پاکستان کی تحریک میں سرگرم ہو گئے۔ حاجی عبداللہ ہارون نے اب سندھ میں تحریکِ پاکستان کی ترتیب و تنظیم شروع کی، لیکن اس عرصہ میں ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت وہ سندھ مسلم لیگ کے صدر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے اور اس کی تحریک کو کامیاب بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ لیگ کی تنظیم اور تحریکِ پاکستان میں ان کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک پاکستان کے قائدین (۷)

مولانا محمد علی جوہر

مولانا محمد علی جوہر نے اپنی شخصیت اور اپنے نظریات میں ان متعدد رجحانات کا امتزاج پیش کیا ہے جو اس وقت قوم کے پیش نظر تھے چونکہ انہوں نے جدید تعلیم حاصل کی تھی اس لیے اس کا شعور رکھتے تھے کہ یہ تعلیم قوم کو اپنے مسائل حل کرنے کے قابل بنانے میں کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔ وہ سید احمد خان کے کام کی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے سیاسی آزادی کی ضرورت پوری طرح محسوس کی۔ اجنبی حکومت کی جانب ان کے جذبات مخالفانہ اور باغیانہ ہی رہے انہوں نے ابتدا ہی میں ایسی صلاحیتوں کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کو مادی آسائشوں کے ساتھ کامیابی سے گزار لیتے، لیکن انہوں نے صحافی بننے کا فیصلہ بڑے غور و خوض کے بعد کیا اور "کامریڈ" جاری کر دیا۔ ان کے خیال میں یہی ایک راستہ تھا جس پر چل کر وہ قوم کو اپنی سیاسی زندگی میں اپنا مناسب حصہ لینے کے لیے مدعو کر سکتے تھے۔ اس وقت دنیائے اسلام کے حالات کے نتیجے میں مسلمانوں میں اتحادِ اسلامی کے جذبات عام ہو رہے تھے۔ اپنے بعض دیگر معاصر رہنماؤں کی طرح مولانا محمد علی بھی اتحادِ اسلامی کے جذبات عام کرتے رہے اور اس کے لیے سرگرم رہے۔ ان کی سیاست جہاں ایک طرف ہندوستان سے وابستہ تھی اور وہ مسلمانوں کے لیے ان کی جداگانہ ہستی کے مطابق سیاسی حقوق حاصل کرنا چاہتے تھے وہاں وہ دوسری طرف اسلام کی عالمی ملت کا ایک حصہ بھی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک عالمی اسلامی اخوت مسلمانوں کو دنیا کے تمام مذاہب کے تسلط سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ "کامریڈ" کے ذریعے انہوں نے اپنے اتحادِ اسلامی کے خیالات کی بڑے پیمانے پر اشاعت کی۔ برعظیم کے سیاسی افق پر وہ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں نمودار ہوئے تھے۔ یہ زمانہ عالمِ اسلام اور خصوصاً ترکی کے لیے سخت دشواریوں اور خطرات کا حامل تھا۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں سے برعظیم کے مسلمان بھی مضطرب تھے۔ مولانا محمد علی نے متاثرین کی امداد کے لیے چندے کی فراہمی اور طبی وفد کی روانگی میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اسی دوران اندرون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملک ایک حادثے نے بھی ان کے جذبات کو سخت تکلیف پہنچائی تھی۔ کانپور کی ایک مسجد کا حصہ گرا دیا گیا تھا، جس سے مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس پر فوج نے مسلمانوں پر گولی چلا دی اور مسلم رائے عامہ کو مزید مشتعل کر دیا۔ مولانا محمد علی نے پہلے ہندوستان میں حکومت کے طرزِ عمل میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر وہ انگلستان گئے اور حکومت کے طرزِ عمل میں قدرے نرمی پیدا کی۔

پہلی جنگِ عظیم میں جب ترکی جرمنی کا حلیف بنا تو لندن کے ایک اخبار "لندن ٹائمز" نے ترکوں کے خلاف ایک سخت اداریہ شائع کیا، جس کے جواب میں مولانا محمد علی نے "ترکوں کا انتخاب" نامی اداریہ تحریر کیا۔ جس کی پاداش میں اخبار کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اس دوران انہوں نے ایک اردو اخبار "ہمدرد" بھی جاری کیا۔ جس نے برعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری میں اہم اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اس وقت مولانا محمد علی ہندوستان کے معروف اور اہم سیاسی رہنما کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اب وہ برملا کہہ سکتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ حکومت نے ان کی انقلابی سرگرمیوں کو روکنے کی غرض سے انہیں ۱۹۱۵ء میں پانچ سال کے لیے قید کر دیا۔ جہاں سے وہ ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے۔ اس وقت تک ہندوستان عوامی تحریکوں اور سیاسی شورشوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں فوج نے نہتے ہزاروں افراد پر گولی چلائی اور قتلِ عام کیا۔ اس واقعہ نے سارے برعظیم میں ہلچل پیدا کر دی۔ اسی زمانے میں ترکی اور خلافت کی حمایت میں تحریک خلافت شروع ہوئی تو مولانا محمد علی اس کے سب سے سرگرم اور ممتاز قائد بن گئے۔ ان کی پرجوش اور ولولہ انگیز قیادت میں اس قدر ہمہ گیر تحریک شروع ہوئی کہ جس کی مثال برعظیم کی کسی اور تحریک میں نہیں ملتی۔ وہ سارے جذبات، جو ایک عرصے سے ضبط کی حدود میں تھے، ایک ایسی تحریک کی شکل میں پھوٹ نکلے جس نے دوسری تمام تحریکوں سے بڑھ کر برعظیم میں حکومتِ برطانیہ کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ حکومت سے عدمِ تعاون کا منصوبہ بنایا گیا جو بہت کامیاب اور مؤثر ثابت ہوا۔ مولانا محمد علی ان تحریکوں میں پیش پیش رہے۔ ہندوستان اور یورپ میں مختلف وفود بنا کر رائے عامہ کو ہموار کرتے رہے۔ حکومت کے ذمے داروں سے ملاقاتیں کیں اور انہیں مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا۔ اپنی تحریک کو مزید مؤثر بنانے کے لیے عدمِ تعاون کے ساتھ ساتھ احتجاجی جلسے کیے۔ پرجوش اور ولولہ انگیز تقریریں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیں اور سارے برعظیم کا دورہ کر کے مسلمانوں میں قومی اور سیاسی بیداری عام کرتے رہے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر مسلمانوں میں رشتہ اخوت مضبوط ہوا اور انہوں نے سیاسی تربیت حاصل کی۔ اس تحریک کو عام کرنے اور اسے ولولہ انگیز بنانے میں مولانا محمد علی کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔

تحریکِ خلافت کے بعد ہندوؤں نے جب "شدھی" اور "سنگھٹن" کی تحریکیں شروع کیں تو مولانا محمد علی کانگریس اور ہندوؤں سے سخت مایوس ہوئے اور انہوں نے دونوں قوموں کے درمیان اتحاد کے خیال کو ترک کر دیا۔ "نہرو رپورٹ" نے ان کے جذبات کو مزید ٹھیس پہنچائی۔ اب اس کے نتیجے میں وہ مسلمانوں کی تنظیم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی ساری کوششیں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور برطانیہ سے آزادی کے حصول میں صرف کر دیں۔ یہاں تک کہ گول میز کانفرنس کے موقع پر اپنے انہی عزائم کا اظہار کیا۔ لیکن ناکامی کی صورت میں وہیں جان بحق ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۸)

مولانا ظفر علی خان

مولانا ظفر علی خان کی حیثیت قومی رہنماؤں میں ایک بے باک صحافی، جرأت مند مقرر اور ولولہ انگیز شاعر کے طور پر ممتاز رہی ہے۔ ان کی تربیت اور ان کی نشو و نما سید احمد خان اور علیگڑھ تحریک کے دیگر اکابر کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کی شخصیت میں وہ اوصاف بھرپور صورت میں ظاہر ہوئے ہیں، جنہوں نے قوم کی رہنمائی، آزادی اور اس کی سیاسی بیداری میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا ظفر علی خاں کو نواب محسن الملک کی صحبت میں رہنے اور ان سے قومی معاملات میں رہبری اور تنظیم کے اصول سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ مسلم لیگ کے قیام میں ان کی عملی کوششیں بڑی سرگرم اور مؤثر تھیں۔ وہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کی قرارداد کی تائید کرنے والوں میں شامل تھے اور پھر اس کی تنظیم اور اس کی وسعت میں بھی پیش پیش رہے اور سرگرمی سے کام کرتے رہے۔ کچھ ہی عرصے میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اخبار "زمیندار" کی ادارت سنبھالی اور بہت جلد اسے مسلمانوں کا مقبول اور ہر دلعزیز اخبار بنا دیا۔ چونکہ اس کا لب و لہجہ اور انداز خطیبانہ اور پرجوش تھا، اس لیے یہ جلد اپنے معاصر اخبارات پر چھا گیا اور مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا ترجمان سمجھا جانے لگا۔ اس کے سیاسی اداریے، بلند آہنگ اور خطیبانہ انداز اور بے باکی اس دور کی طوفانی سیاست اور قومی زندگی کے نشیب و فراز کی مظہر تھی۔ مولانا ظفر علیخان اتحادِ اسلامی کے زبردست داعی اور پرجوش کارکن تھے۔ چنانچہ ان کا اخبار بھی اتحادِ اسلامی کے جذبات کو مسلمانوں میں عام کرنے اور مقبول بنانے میں سرگرم اور مستعد رہا۔ ملکی سیاست کی صورتِ حال میں ایک عرصے تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "زمیندار" اور مولانا ظفر علی خاں ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی اور علمبردار تھے اور اس کے لیے کوششیں کرتے تھے، لیکن ہندوؤں کی ایسی تحریکیں جو مسلمانوں کے ساتھ اتحاد اور تعاون کے جذبات پر مبنی نہیں تھیں، بلکہ اس کے برعکس اسلام اور مسلمانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے خلاف نفرت انگیز اور مخالفانہ مقاصد رکھتی تھیں، جیسے "شدھی" اور "سنگھٹن"، تو نہ صرف مولانا ظفر علی خان ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے مایوس ہوئے بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سرگرم ہوئے۔ اب ان کی ہر کوشش مسلمانوں کے لیے سیاسی حقوق کے حصول اور ان کی کامل آزادی کے لیے تھی۔

"شدھی" اور "سنگھٹن" کے خلاف اور ان سے تحفظ کے لیے مسلمانوں نے اپنی "تنظیم" اور "تبلیغ" کی تحریکیں شروع کی تھیں، چنانچہ "زمیندار" نے ان تحریکوں کو وسعت دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ سیاسی مسلک اور قومی نصب العین میں اب مولانا ظفر علی خان مسلم لیگ کے شریک اور اس کی کامیابی کے لیے سرگرم ہوئے اور "زمیندار" نے عام قومی مسائل میں مسلمانوں کے مقاصد اور عزائم کی ترجمانی کی۔ ہندو مسلم فسادات کے دوران مسلمانوں کے حق میں متعدد مضامین کی اشاعت کے سبب کئی مرتبہ اخبار کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی۔ تحریک آزادیٔ کشمیر، مسجد شہید گنج کی تحریک اور پھر تحریک پاکستان میں اس اخبار نے عام مسلمانوں کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ان کی رہنمائی بھی کی اور ان تحریکوں کو مقبول بنانے میں نمایاں بھی رہا۔

اس اخبار نے اپنے دور میں مجموعی طور پر عوام میں سیاسی بیداری اور ملی شعور پیدا کرنے میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ اولاً یہ سیاسی بیداری گو کسی واضح نصب العین کے لیے نہیں تھی، لیکن اس سے آنے والی سیاسی تحریکوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ اپنی حق گوئی اور قوم کی آزادی کے لیے مولانا ظفر علی خان اور "زمیندار" نے قید و بند کی متعدد تکلیفیں برداشت کیں، پریس ضبط ہوتے رہے اور انہیں خطیر سرمایہ جرمانے کی صورت میں ادا کرنا پڑا۔ یہ ان کی مستقل جدوجہد کے نتیجے میں ایک معمول سا بن گیا تھا۔

سیاسی سرگرمی کے میدان میں بھی مولانا ظفر علی خان کی زندگی مسلمانوں کے ایک پرجوش رہنما اور حکومتِ برطانیہ کے ایک جرأت مند مخالف کے طور پر نمایاں رہی۔ ان کی جدوجہد کا رخ حکومت سے بغاوت کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی تحریکوں کے رد میں بھی رہا۔ وہ عالمِ اسلام کے سیاسی زوال سے بھی مضطرب تھے۔ ان کی کوششوں کا ایک بڑا حصہ اتحادِ عالمِ اسلامی اور عام مسلمانوں کی سیاسی اور قومی فلاح اور آزادی کی جدوجہد میں صرف ہوا۔ ہندوستان میں تحریکِ خلافت کو ان کی جدوجہد سے بڑی تقویت حاصل رہی۔ وہ اس کے سرگرم اور فعال کارکن رہے۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے موقع پر ترکوں کی امداد کے لیے عام مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور چندے کی فراہمی میں وہ اور ان کا "زمیندار" پیش پیش رہے۔ کانگریس کے ہندو نقطۂ نظر سے احتجاج کرتے ہوئے وہ اس سے علیحدہ ہوئے اور مسلم لیگ میں شریک ہو کر ان کی تحریکوں میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا۔ پنجاب میں وہ قائداعظم کے دست و بازو تھے۔ اور ان کے اخبار "زمیندار" نے پنجاب میں مسلم لیگ کو مقبول بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے وہ مجلس دستور ساز کے رکن بھی منتخب ہوئے اور تحریکِ پاکستان کو تقویت دیتے رہے۔ سیاسی رہنما اور صحافی کے علاوہ مسلمانوں کے لیے ان کی حیثیت ایک مؤثر اور ولولہ انگیز قومی اور سیاسی شاعر کی بھی تھی۔ اپنی شاعری کے ذریعے انہوں نے سیاسی ہنگامی مسائل اور قومی معاملات میں اپنے جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی کی اور عام مسلمانوں کے جذبات میں ہلچل اور اضطراب پیدا کرنے میں امتیاز حاصل کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۹)

مولانا حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی اپنے دور کے ایک پرخلوص سیاسی رہنما اور نڈر صحافی تھے۔ ان کی ساری زندگی برطانوی اقتدار اور ظلم وستم کے خلاف مسلسل اور شدید جدوجہد سے عبارت تھی۔ وہ سیاست میں ایک پرجوش اور جرأت مند رہنما کی حیثیت سے ممتاز ہوئے اور ادب وشاعری میں ایک صاحبِ طرز ادیب، حقیقت پسند پرگو شاعر اور بلند پایہ صحافی کے طور پر نمایاں ہوئے۔ علیگڑھ کالج سے فارغ التحصیل تھے اور اسی اعتبار سے علیگڑھ تحریک سے وابستہ اور متاثر رہے لیکن قومی زندگی میں ان کے جوش اور ولولے نے انہیں ہمیشہ منفرد اور نمایاں رکھا۔ وہ کبھی کسی ایک مقام پر مطمئن نہ رہے۔ ان کا اضطراب اور باغیانہ مزاج ہمیشہ انہیں ظلم وجور کے خلاف صف آرا کرتا رہا اور وہ زندگی اور ماحول کے تعلق سے اپنے مخصوص تصورات اور نظریات کو قومی زندگی میں جاری وساری دیکھنے کے لیے کوشاں رہے۔ وہ بیسویں صدی میں پہلے مسلمان رہنما تھے جنہوں نے سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل کو زینت بخشی۔ پھر وہ متعدد مرتبہ جیل گئے۔ پہلی مرتبہ انہیں جیل اس لیے ہوئی تھی کہ انہوں نے اپنے رسالے "اردوئے معلیٰ" میں برطانوی حکومت پر ایک تنقیدی مضمون شائع کیا تھا۔ اس کے بعد وہ بغاوت کے الزامات میں اور بھی کئی مرتبہ جیل جاتے رہے۔ ہر دور میں تحریک آزادی کے پرجوش حامی اور کارکن رہے۔ اپنی عملی جدوجہد اور اپنی تحریروں میں انہوں نے ہمیشہ غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنے باغیانہ خیالات پیش کیے۔ انہیں دیگر رہنماؤں کے مقابلے میں یہ امتیاز اور برتری حاصل ہوئی کہ انہوں نے کامل آزادی کا نعرہ سب سے پہلے بلند کیا۔ وہ ہر قیمت پر مکمل آزادی کے طلبگار تھے۔ ابتداءً کانگریس کی تائید کرتے رہے، اس کی انقلابی تحریکوں میں شریک ہوتے لیکن بہت جلد اس سے بددل ہو گئے۔ جب بیسویں صدی کے اوائل میں سودیشی تحریک شروع ہوئی، تاکہ صنعت وحرفت اور تجارت میں ہندوستانیوں کی حوصلہ افزائی اور امداد کے لیے انگریزی سامان کا استعمال ترک کر دیا جائے، تو مولانا حسرت موہانی اس تحریک کے پرجوش کارکن بن گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس مقصد کے لیے انہوں نے مضامین لکھے، تنظیمی دورے کیے اور عوام کو ملکی اشیاء کے استعمال کی ترغیب دلائی، تحریک کی حمایت میں علماء سے فتوے حاصل کیے اور انہیں مشتہر کیا۔ دیسی اشیاء کی فراہمی کے لیے خود ایک دوکان بھی کھولی جو کئی سال تک، جب کہ وہ ۱۹۲۲ء میں پھر گرفتار ہوئے، کامیابی سے چلتی رہی۔ ان کی ان کوششوں سے یہ تحریک مسلمانوں میں کافی مقبول ہوئی۔

علیگڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی کا درجہ دلانے کے لیے جب تحریک شروع ہوئی تو مولانا حسرت اس میں بھی پیش پیش رہے۔ مسلمانوں کے حقوق اور ان کی فلاح و بہبود انکی جدوجہد کا محور رہی۔ ان کی نظر عالمِ اسلام کے زوال اور اس کے سیاسی انحطاط پر بھی تھی۔ وہ اتحادِ اسلامی کے پرجوش حامی تھے اور ان کا رسالہ "اردوئے معلیٰ" اس قسم کے جذبات کو متواتر پیش کرتا تھا۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے زمانے میں ترکوں کی امداد کے لیے انہوں نے بڑی سرگرمی سے چندہ جمع کیا اور "اردوئے معلیٰ" میں متعدد مضامین ترکوں کی حمایت میں لکھے۔ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے مقصد سے جو "انجمن خدامِ کعبہ" قائم ہوئی تو یہ اس میں بھی فعال ہوئے۔ تحریکِ خلافت کے دوران ان کی سرگرمیاں خلافت اور ترکی کے مسلمانوں کے لیے ان کے جوش اور ولولے کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ تحریکِ خلافت کے ایک ممتاز رہنما کی حیثیت سے پیش پیش رہے۔ اس وقت جو سیاسی صورتِ حال تھی اس میں انہیں گاندھی کا رویہ سخت ناپسند تھا۔ وہ گاندھی کی قیادت کے خلاف بھی تھے اور ان کے سیاسی نقطۂ نظر کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ تحریکِ خلافت کو ختم کرنے کے لیے گاندھی نے جو حربے اختیار کیے انہیں دیکھتے ہوئے وہ کانگریس سے بھی بددل ہو گئے اور اس سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کر لی۔ بعد میں ان کی سیاسی سرگرمیاں مسلم لیگ کے ساتھ تعاون اور اشتراکِ عمل سے جاری رہیں اور وہ مسلم لیگ کی تحریکوں میں مستعد اور فعال رہے۔ مولانا حسرت نے کانگریس کے ایک اجلاس میں آزادیٔ کامل کے مطالبے پر مبنی ایک قرارداد پیش کرنی چاہی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس طرح ہندو سیاست کے حقیقی مقاصد اب ان کے سامنے تھے، چنانچہ انہوں نے وہ قرارداد خلافت اور مسلم لیگ کے جلسوں میں پیش کی۔ "نہرو رپورٹ" کی مخالفت میں مسلمانوں کے دیگر رہنماؤں کے علاوہ مولانا حسرت کی آواز بھی بہت شدید اور پرزور تھی۔ ۱۹۳۷ء میں جب مسلم لیگ کی تشکیلِ نو ہوئی تو مولانا حسرت بھی اس میں زیادہ سرگرمی اور مستعدی سے حصہ لینے لگے۔ پھر وہ تحریکِ پاکستان کے لیے سرگرم ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی طرف سے انتخابات میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دستور ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔ ان کا رسالہ "اردوئے معلیٰ" ان کی علمی جد و جہد اور ان کے نقطۂ نظر کا آئینہ دار رہا۔ ان کی شاعری بھی، جو ایک نمایاں حد تک پر کیف رومانی جذبات سے آراستہ ہے، ان کے قومی اور سیاسی نقطۂ نظر کی مظہر بھی ہے اور اس کا ایک بڑا حصہ جذبۂ حریت اور غلبۂ اسلام کی تمنا کا اظہار کرتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۱۰)

مولوی فضل الحق

مولوی اے۔ کے فضل الحق بڑے جرأت مند، پرخلوص اور مستعد رہنما تھے۔ چونکہ ان کی ابتدائی جدوجہد کا محور زیادہ تر ان کا آبائی خطہ بنگال رہا، اس لیے وہ اپنی عملی اور ذہنی صفات کے لحاظ سے "شیرِ بنگال" کی عرفیت سے مشہور ہوئے۔ بنگالی مسلمانوں میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اعلیٰ تعلیمی لیاقت کے اعتبار سے امتیاز حاصل کیا۔ قانون میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں نائب مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب ہندوستان اور بالخصوص پورا بنگال ۱۹۰۵ء کی انتظامی تقسیم کے فیصلے کے نتیجے میں ہندوؤں کی احتجاجی تحریکوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ حکومت نے بنگال کو مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ محض اس مقصد سے کیا تھا کہ اس طرح بعض انتظامی سہولتیں پیدا ہوتی تھیں اور وہ علاقے جو بہت پس ماندہ اور سرکاری سرپرستی اور انتظام سے بالکل محروم تھے، ان پر توجہ کرنا آسان ہو جاتا تھا۔ اس تقسیم کا اتفاقی نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی حصے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی۔ اب فائدہ جو بھی حاصل ہوتا وہ ایک حد تک مسلمانوں کے حق میں رہتا۔ یہ صورتِ حال ہندوؤں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو سکتی تھی، جو نفسیاتی طور پر مسلمانوں کو بہتر حالت میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس فیصلے کے خلاف اختلاف اور احتجاج کا ایک شدید طوفان کھڑا کر دیا۔ حکومت نے، جو عام طور پر ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ کرتی رہی ہے، تقسیم کے فیصلے کو منسوخ کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ صورتِ حال افسوسناک اور تکلیف دہ تھی۔ انہیں ہندوؤں اور حکومت کے اس طرزِ عمل سے سخت صدمہ پہنچا۔ مولوی فضل الحق نے اس طرزِ عمل کے احتجاج میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور قومی اور سیاسی محاذ پر سرگرم ہوئے۔ اس وقت ہونے والے ایک مقامی ضمنی انتخاب میں حصہ لیا اور صوبائی کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۱۵ء میں انہوں نے بنگال میں کسان تحریک کا آغاز کیا اور اس سلسلے میں مسلمان کسانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ایک مجلس تشکیل دی۔ ان کی ان کوششوں کے نتیجے میں تھوڑے ہی عرصے میں علاقے کی مشہور اور مخلص شخصیتوں نے ان کے ساتھ تعاون شروع کیا، چنانچہ یہ مجلس بہت جلد مؤثر اور مقبول ہو گئی۔ اس کا ایک نمایاں اثر ان دستوری اصلاحات میں دیکھا جا سکتا ہے جو ۱۹۲۸ء میں نافذ ہوئیں اور جن کی رو سے مزارعین کو بہت سی رعایتیں حاصل ہوئیں۔ یہ مجلس، جو کسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے قائم ہوئی تھی، ۱۹۲۴ء میں ایک سیاسی جماعت میں تبدیل ہو گئی۔

مولوی فضل الحق نے بنگالی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر خاص توجہ دی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ۱۹۲۰ء میں ایک اسلامیہ کالج قائم کیا۔ بعد میں بھی وہ اس نوعیت کے دیگر تعلیمی ادارے قائم کرتے رہے۔ خصوصاً ۱۹۳۷ء میں، جب ۱۹۳۵ء کے قانون کے مطابق انتخابات ہوئے اور بنگال میں انہیں حکومت بنانے کا موقع ملا، تو انہوں نے تعلیم کا محکمہ اپنے پاس رکھا اور اس دوران مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے مفید اور مؤثر اقدامات کیے۔ کئی تعلیمی ادارے قائم کیے اور مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام میں بھی مولوی فضل الحق کی کوششیں بہت راست اور مستقل تھیں۔ اس کے قیام سے بنگال میں مسلمانوں کو تعلیمی لحاظ سے بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ نے، جو اپنے بزرگوں کی جدوجہد کے نتیجے میں سیاسی شعور سے آراستہ ہو رہے تھے، تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مولوی فضل الحق کا تعلق مسلم لیگ سے بڑا قریبی اور مستقل رہا۔ وہ اس کی تمام تحریکوں میں شریک اور پیش پیش رہے۔ اس کے سالانہ جلسوں کی صدارت بھی کی اور کئی موقعوں پر اس کی نمائندگی بھی کرتے رہے۔ قومی معاملات اور ملی مسائل کے تعلق سے ان کا نقطۂ نظر بہت واضح اور مثبت رہا۔ انہیں جہاں قومی و سیاسی مسائل سے گہرا تعلق رہا وہ عالمِ اسلام کے سیاسی زوال اور اس کے حادثات سے بھی لاتعلق نہیں تھے۔ ان تمام حادثات اور مسائل پر، جو عالمِ اسلام کے مسلمانوں کے لیے اہمیت رکھتے تھے، وہ اپنے ہمدردی اور خلوص کے جذبات ہر موقع پر ظاہر کرتے رہے۔ ان کی نظر میں عالمِ اسلام کو پیش آنے والے سیاسی حادثات صلیبی جنگوں کی سی اہمیت کے حامل تھے۔ وہ مغرب کی عیسائی حکومتوں کی خود غرضانہ حکمتِ عملیوں کی مذمت کرتے رہے۔ ترکی اور خلافت کے تحفظ کے لیے جب ہندوستان میں مجلسِ خلافت تشکیل دی گئی اور اس کا پہلا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو اس کی صدارت مولوی فضل الحق نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انجام دی۔ اس تحریک میں وہ بہت سرگرم رہے۔ مسلم لیگ کی تحریکوں کو بھی ان کی حمایت اور ان کا عملی تعاون ہمیشہ حاصل رہا۔ انہیں یہ امتیاز بھی حاصل ہوا کہ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں قرارداد پاکستان پیش کی۔ اس زمانہ میں وہ بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے اور مسلمانوں کی خدمت اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے کوشاں تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۱۱)

علامہ اقبال

اپنے وقت کے فکری اور جذباتی رجحان کو تبدیل کرنے میں علامہ اقبال کا حصہ عصرِ حاضر کے عالمِ اسلام میں سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے انحطاط کے حقیقی اسباب کا جائزہ لیا تھا اور ان کی تشخیص کے بعد اسلام کی جو تشریح و توضیح انہوں نے کی ہے اس کی امتیازی خصوصیت اس کا حرکی اور انقلابی پہلو ہے۔ اپنے مقاصد کے اعتبار سے انہوں نے ایک تو اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کی اور اسلامی قومیت کے حقیقی تصور کو اجاگر کیا اور دوسرے مغربی افکار اور ان کے زیرِ اثر رونما ہونے والی مختلف تحریکوں پر سخت تنقید کی اور قوم کو تمدنی اور سیاسی اعتبار سے اسلام کی تعلیمات کو اختیار کرنے کی تلقین کی اور خاص طور پر ان کے جذبۂ عمل کو بیدار کیا۔ اس لحاظ سے وہ موجودہ صدی میں ملتِ اسلامیہ کے ذہن کے اولین معمار ہیں۔ ان کے خیالات نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں اتحادِ اسلامی کے جذبات کو بڑی تقویت پہنچائی، جو اب عام مسلمانوں میں مقبول ہو رہے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زندگی پر ان کے اثرات بیسویں صدی کے اوائل ہی سے قائم ہونے شروع ہوئے۔

علامہ اقبال نے قوم پرستی کو، جسے وطنیت کا جدید نام دیا گیا ہے، مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن اور مذہب کے منافی بتایا ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ مسلم ملت اور دنیائے اسلام ناقابلِ تقسیم ہیں۔ ساتھ ہی بے عملی اور جمود سے انہیں سخت نفرت تھی۔ وہ ایسے عقائد کے بھی قائل نہ تھے جو اپنے آپ کو عمل میں منتقل نہ کر سکیں۔ پختگیٔ رائے اور ابتدائی دور کے جذبات کی ترجمانی کے بعد ان کی شاعری میں ایک مستقل مزاجی پیدا ہو گئی تھی وہ سیاسی اور تہذیبی مسائل کو ایک مفکر شاعر کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ یورپ کے مشاہدات نے ان کی فکر و نظر میں جو وسعت پیدا کی تھی، مسلم ممالک کے مسائل اور حادثات سے ہم آہنگ ہونے کے بعد اس میں مفکرانہ گہرائی پیدا ہو گئی تھی اور وہ ملی نقطۂ نظر سے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ اب ان کی توجہ زیادہ تر مستقبل کے امکانات پر تھی۔ عالمِ اسلام کے سیاسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زوال اور مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کو روکنے کی جو کوششیں ہو رہی تھیں وہ ان کے معترف تھے۔ شاہ ولی اللہ اور مجاہدین کی تحریکوں اور ان کی جد وجہد کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اپنے سے قریبی عہد کے مفکرین میں ایک طرف وہ سید جمال الدین افغانی کے معتقد تھے اور دوسرے سید احمد خان اور ان کی تحریک کے حامی تھے۔ دنیائے اسلام میں سید احمد خان اور جمال الدین افغانی کے بعد دراصل اقبال ہی کی شخصیت ہے جس نے مسلمانوں کے احیاء کے لیے نہ صرف ایک مربوط اور ٹھوس فکر پیش کی بلکہ عالمِ اسلام کی آزادی، خود مختاری اور بہتر مستقبل کی تعمیر کا واضح اور مؤثر پیغام بھی دیا۔

علامہ اقبال نے اگرچہ شاعری ہی کے ذریعے شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کی لیکن شاعری میں محض کیف و سرور کبھی ان کا مطمحِ نظر نہ رہا۔ ان کا مقصدِ عین یہ تھا کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو۔ وہ اپنا پورا وقت وکالت یا ملازمت میں بسر کرتے تو بلند مرتبہ پر پہنچ جاتے، لیکن ملتِ اسلامیہ کی خدمت کے جذبے نے انہیں مال و جاہ کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ انہوں نے عملی سیاسیات میں بہت کم حصہ لیا۔ ہندوستان میں اسلام کا مستقبل انہیں پیہم مضطرب رکھتا تھا۔ سیاسیات میں ان کا نصب العین اسلامی مقاصد کے تحفظ اور مسلمانوں کی بہبود کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ مسلم لیگ کے رکن رہے اور اس کی جانب سے ۱۹۲۶ء میں پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ سیاسیات میں وہ بعض بنیادی مسائل میں اپنی فکر و رائے پر پوری استقامت کے ساتھ قائم رہے۔ جداگانہ انتخاب کے مسئلے کو وہ مسلمانوں کی حیاتِ قومی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ "نہرو رپورٹ" کے مخالف رہے۔ اس مسئلے پر مسلمانوں کا موقف طے کرنے کے لیے منعقد ہونے والی "کل جماعتی مسلم کانفرنس" میں شریک ہوئے اور مسلمانوں کے مطالبات کی ترتیب میں حصہ لیا۔ یہ فکرِ اقبال کے ایک نئے دور کا آغاز تھا اور اسی طرح یہ مرحلہ ملتِ اسلامیہ کی مزاجی کیفیت کی نئی تعمیر اور تغیر کے عمل کی ابتدا تھی، جس کا نتیجہ بعد میں ایک آزاد قوم کے احیاء اور ایک اسلامی مملکت کے قیام کی صورت میں نکلنے والا تھا۔ یہ ان کا مطمحِ نظر تھا کیونکہ ان کے خیال میں ہر قوم کے لیے ایک ملک ضروری ہے۔ ہندوستان میں اس خیال کو عملی صورت دینے کے لیے انہوں نے ایک انتہائی تعمیری انداز میں سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۲۷ء میں ایک مشترکہ مجلس کے سامنے پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ کے صوبوں کو آپس میں ایک دوسرے میں ضم کر دینے کی ایک تجویز پیش کی۔ ۱۹۳۰ء میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم لیگ کے اجلاسِ الہ آباد کے لیے صدر چنے گئے، جہاں انہوں نے اپنا تاریخی اہمیت کا خطبہ پڑھا اور مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا پہلا مکمل تصور پیش کیا۔ گول میز کانفرنس کے آخری دو اجلاسوں میں بھی شریک ہوئے۔

مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اسلامی نصب العین کے تحفظ اور مسلمانوں کے قومی حقوق کے حصول کے لیے انہوں نے انتہائی استقامت سے کام لیا۔ ایک موقع پر کہ جب قائداعظم نے انگلستان میں سکونت اختیار کر لی تھی، انہیں ہندوستان واپس آنے اور پھر مسلم لیگ کی تشکیلِ نو کرنے پر آمادہ کیا۔ اس کے بہت دور رس نتائج سامنے آئے۔ تشکیلِ نو کے بعد مسلم لیگ عوامی اور مسلمانوں کی مقبول جماعت بن گئی اور محمد علی جناح مسلمانوں کے قائداعظم بن گئے۔ یہ صورتِ حال پاکستان کے قیام کا اہم سبب بنی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱۲)
تحریکِ پاکستان کے قائدین

نواب بہادر یار جنگ

نواب بہادر یار جنگ کی سیاسی زندگی گو بہت مختصر تھی لیکن انہوں نے ایک مختصر عرصے میں جدوجہد، حق گوئی اور طرزِ خطابت کے لحاظ سے مقبولیت اور شہرت کی ایک مثال قائم کی۔ قوم کو بہت کم ایسے افراد حاصل ہوئے ہیں جو اپنی بھرپور صلاحیتوں اور خلوص کا اس قدر حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ نواب بہادر یار جنگ کا عروج قومی زندگی کے ایک ایسے مرحلے پر ہوا جب منظر پر علامہ اقبال اور قائداعظم کی حکمرانی تھی۔ اپنی متنوع اور بھرپور صلاحیتوں اور زورِ خطابت کے سبب بہت جلد نواب بہادر یار جنگ قائداعظم کے معتمد رفیق بن گئے۔ قائداعظم ان کے خلوص، ان کی صداقت، قائدانہ صلاحیتوں اور طرزِ خطابت سے بخوبی واقف اور متاثر تھے۔ دل سے ان کی قدر کرتے اور انہیں محبوب رکھتے۔ یہ قدر و منزلت بعد میں کسی اور رہنما کے حصے میں نہیں آئی۔ نواب بہادر یار جنگ کو بھی قائداعظم سے بڑی عقیدت رہی۔ اس زمانے میں سمجھا جاتا تھا کہ اگر ہندوستان نے دوسرا محمد علی جوہر پیدا کیا ہوتا تو وہ نواب بہادر یار جنگ کے سوا کوئی اور نہ ہوتا۔ دونوں میں خلوص، مذہبی جوش و خروش، بے پناہ جذبۂ خدمت و زورِ خطابت اور دور اندیشی کی صفات مشترک تھیں۔ نواب بہادر یار جنگ کے فکر و عمل کی بنیادیں اسلام اور دنیائے اسلام کی خدمت کے جذبے پر قائم تھیں۔ اس معاملے میں وہ کسی مفاہمت کے قائل نہ تھے اور نہ کسی اثر اور دباؤ کو قبول کرتے تھے۔ ایک بے مثال مقرر کی حیثیت سے ان کی قیادت نے عوام میں ان کی مقبولیت کو بڑھا دیا تھا اور انہیں عزت اور توقیر کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ ان کی شخصیت میں مذہب سے لگاؤ کا عنصر بہت حاوی تھا، چنانچہ وہ تبلیغِ اسلام کی طرف ہمہ وقت مصروف رہے۔ اسی غیر معمولی دلچسپی کے تحت انہوں نے ایک جماعت بھی تشکیل دی اور اسے مملکتِ حیدر آباد میں ہر طرف پھیلا دیا۔ یہ وہ دور تھا جب سارے ہندوستان میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کو ہندو بنانے اور انہیں ہندو قومیت میں جذب کر لینے کے لیے "شدھی" اور "سنگھٹن" کی تحریکیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عروج پر تھیں۔ مملکتِ حیدرآباد میں آریا سماجی تحریک کا بڑا زور تھا۔ اس کے قائد دیانند سرسوتی کی سرپرستی میں اسلام دشمن کارروائیاں شدت پر تھیں۔ چنانچہ ہندوؤں نے نواب بہادر یار جنگ کی مخالفت کا بھی ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ لیکن نواب بہادر یار جنگ اپنی تبلیغی جدوجہد میں مصروف رہے۔ مجلس تبلیغِ اسلام کو وسعت دی، مبلغ تیار کیے اور ہزاروں ہندوؤں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا۔

دنیائے اسلام سے تعلق اور وابستگی کی بھی کئی نوعیتیں تھیں۔ نواب بہادر یار جنگ نے دنیائے اسلام کے مسائل اور اس کے زوال کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ ان کا یہ مطالعہ براہِ راست مشاہدے پر مبنی تھا۔ انہوں نے دنیائے اسلام کے متعدد ملکوں کی سیاحت کی اور اکابر سے روابط پیدا کیے۔ انہیں ہمیشہ دنیائے اسلام کے سیاسی زوال اور انتشار پر تشویش رہی۔

اپنے زورِ بیان سے نواب بہادر یار جنگ نے اپنی قوم کے کردار اور اس کے مزاج کی تعمیر میں بھی مؤثر حصہ لیا۔ مدت تک ان کا یہ معمول رہا کہ وہ باقاعدہ درس کی صورت میں قرآنِ حکیم کی تفسیر بیان کرتے اور سیرت النبیؐ اور فکرِ اقبال پر سلسلے وار تقریریں کرتے۔ ۱۹۳۳ء میں مملکتِ حیدرآباد کے چند نمائندہ اکابر نے، جو قومی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے، مذہبی اور سماجی انجمن "مجلس اتحاد المسلمین" قائم کی تھی جو ابتداءً محض سماجی اور مذہبی امور کے لیے مخصوص رہی، لیکن ۱۹۳۹ء میں نواب بہادر یار جنگ کے اس کے صدر منتخب ہوتے ہی اس میں بہت مفید اور ضروری تبدیلی آئی۔ ان کی قیادت میں یہ مجلس مسلمانانِ دکن کی سب سے مؤثر اور نمائندہ سیاسی جماعت بن گئی اور اس کا اثر روز بروز بڑھنے لگا۔ اس مجلس نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ایک شخصی ریاست میں عوام کے سیاسی حقوق اور مطالبات کی باتیں کرنا بڑا جرأت اور ہمت کا کام تھا۔ لیکن نواب بہادر یار جنگ نے اس کے لیے اپنی کل جائیداد اور اپنا خطاب سزا کے طور پر حکومت کو واپس کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب مطالبۂ پاکستان ایک ناگزیر اور یقینی نظریے کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کا اثر دن بدن پھیل رہا تھا۔ ریاستوں میں بھی مسلمانوں کی ضرورتوں کو محسوس کرتے ہوئے ریاستی مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جا رہی تھیں تاکہ وہ کل ہند مسلم لیگ کے ذریعے مسلمانوں کی ہمنوائی کر سکے۔ نواب بہادر یار جنگ نے حیدرآباد کی ریاستی مسلم لیگ کو فعال بنانے میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن ان سب کاموں سے قطع نظر اب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۸

ان کی حیثیت اور شخصیت ہندوستان کے تمام مسلمانوں اور مسلم لیگ کی ساری جدوجہد کیلیے بہت اہم اور ناگزیر ہو گئی تھی۔ وہ اب مسلم لیگ کے اکابر میں شمار ہوتے تھے اور قائداعظم کے دست راست تھے۔ اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ مسلم لیگ کے ہر بڑے جلسے میں وہ خاص طور پر مدعو کیے جائیں اور ان سے خطاب کے لیے کہا جائے۔ یہ اعزاز صرف انہیں حاصل ہوا کہ وہ قائداعظم کی تقریر کے بعد تقریر کریں اور وقت کی پابندی سے بے نیاز کیے جائیں۔ ان کے خطاب میں زورِ بیان، سلاست اور دلائل یکجا رہتے تھے۔

ان کا یہ ایک اہم کام تھا کہ دشوار مراحل میں وہ مسلم لیگ کی تنظیم، وسعت اور کامیابی کے لیے کوشش کریں۔ ایسے مواقع پر قائداعظم، جو ان کی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے، انہی کا انتخاب کرتے۔ چنانچہ صوبۂ سرحد میں، جہاں کانگریس اور اس کے حامیوں کا غلبہ تھا اور وہ تحریک پاکستان کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے، مسلم لیگ کو منظم کرنے اور تحریک پاکستان کو مقبول بنانے کا اہم اور دشوار فریضہ قائداعظم نے ان کے سپرد کیا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ نے مسلسل محنت کے بعد یہ کام بڑی خوبی و کامیابی سے انجام دیا۔ بعد میں پاکستان کے حق میں ہونے والے انتخابات میں یہاں مسلم لیگ کی کامیابی نواب بہادر یار جنگ کی اس جدوجہد کا ایک نمایاں پہلو تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۱۳)

چودھری رحمت علی

چودھری رحمت علی ان رہنماؤں میں تھے جن کے لیے جداگانہ مسلم مملکت کا تصور بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ تصور، جس کی بنیادیں واضح طور پر دو قومی نظریے پر مبنی تھیں، ابتدائے شعور ہی سے ان کی شخصیت میں رچا بسا تھا۔ وہ تصورات کی دنیا میں رہنے والے ان رہنماؤں میں سے تھے جنہوں نے پہلے پہل مسلم قومیت کی بنیاد پر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مسلم مملکت کا خیال پیش کیا تھا۔ اس وقت جبکہ انہوں نے ابتداءً اپنا تصور پیش کیا تھا وہ اسلامیہ کالج لاہور میں ایک طالب علم تھے۔ ۱۹۱۵ء میں ان کی عمر محض ۲۳ سال تھی لیکن انہوں نے جنوبی ایشیا کے حساس طبقوں کو یہ کہہ کر شدید حیرت میں ڈال دیا کہ "ہندوستان کا شمالی علاقہ مسلم اکثریت پر مبنی ہے اور اس وجہ سے اسے مسلمان ہی کہیں گے، ہم اسے ایک آزاد مسلم ریاست بنائیں گے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم متحدہ قومیت کو خیرباد کہہ دیں اور ملکی طور پر ہندوستان سے قطع تعلق کر لیں۔ جتنی جلد یہ ہو جائے یہ ہمارے ملک اور ہمارے مذہب دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔"

یہ نظریہ انہوں نے "بزمِ شبلی" کو خطاب کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ "بزمِ شبلی" مختلف مذاہب کے طلبہ کی ایک زیرِ زمین مشترکہ تنظیم تھی، جو برطانوی اقتدار کے خلاف مصروفِ عمل تھی۔ اس بزم کی تنظیم دراصل اس صورتِ حال کا اظہار تھی کہ اب برِعظیم کے طلبہ میں برطانوی اقتدار کے خلاف جذبات شدت اختیار کر رہے تھے۔ اگرچہ چودھری رحمت علی کے اس نظریے کو اس وقت کے سیاسی حالات کی وجہ سے مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، لیکن اس نظریے نے برعظیم کے مسلمانوں کے سامنے ایک آزاد اسلامی مملکت کے تصور کا ایک دھندلا سا عکس ضرور پیش کر دیا تھا۔ "بزمِ شبلی"، چونکہ مختلف اقوام کے طلبہ کی مشترکہ جماعت تھی اس لیے اس جماعت کے توسط سے صرف مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی وجہ سے چوہدری رحمت علی کو بزم سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اس موقع پر انہوں نے مزید کہا تھا کہ "میرا یقین ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایمان ہے کہ ملّتِ اسلامیہ علیحدہ وجود رکھتی ہے، جس کے لیے مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے۔ اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لیے ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کرے۔" یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ اور کانگریس کے قائدین کے درمیان اتحاد اور تعاون کی عارضی اور مصنوعی راہ ہموار ہو رہی تھی اور "میثاقِ لکھنؤ" کا ناکام تجربہ ہونے والا تھا۔ اس صورتِ حال کا اثر نوجوانوں کے ایک طبقے پر بھی قائم ہو رہا تھا، لیکن چودھری رحمت علی نے علیحدہ راستے پر اپنا سفر جاری رکھا اور اپنے ساتھیوں میں جداگانہ قومیت کے خیالات کو پھیلانے میں مصروف رہے۔ اس راہ پر چلتے ہوئے انہوں نے مستقل مزاجی اور پامردی کی ایک منفرد مثال قائم کی۔ انہی دنوں وہ مزید تعلیم کی غرض سے انگلستان چلے گئے اور وہاں دورانِ تعلیم بھی اپنے مؤقف اور اپنی جدوجہد میں ثابت قدم رہے۔ ان کا یہ معمول رہا کہ کیمبرج میں اپنی رہائش گاہ میں مسلم طلبہ کو دعوتِ فکر دینے کے لیے جمع کرتے تھے۔ وہیں ان نشستوں میں یہ طے کیا گیا کہ اپنے تصورات کو عملی صورت دینے کے لیے "پاکستان قومی تحریکِ آزادی" کی تنظیم کی جائے۔ لہٰذا ۱۹۳۰ء میں انہوں نے یہ تحریک شروع کر دی، جو ابتداءً صرف نوجوانوں کو اپنا ہم خیال بنانے اور ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی مملکت قائم کرنے کے لیے کوشاں رہی۔ خلوص، جانفشانی اور لگن کی اس نے ایک اعلیٰ مثال قائم کی۔ اس کے تحت چودھری رحمت علی نے متعدد کتابیں شائع کیں، رسالے جاری کیے اور یادداشتیں پیش کیں۔ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر تاریخی اہمیت کا حامل ایک کتابچہ "اب یا کبھی نہیں" شائع کیا۔ اس کتابچہ میں چودھری رحمت علی نے پنجاب، سرحد، کشمیر، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل آزاد اسلامی مملکت کی تجویز پیش کی اور اپنی اس تجویز کو پہلی مرتبہ "پاکستان" کے نام سے منسوب کیا۔ گویا یہ کتابچہ ان کی تحریک کا منشور تھا۔

اس کتابچہ کی اہمیت یہ تھی کہ اس میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کا مطالبہ کیا گیا تھا اور ہندوستان کے تاریخی، معاشرتی اور سیاسی حالات کا مکمل تجزیہ کرتے ہوئے اس ضرورت پر زور دیا گیا تھا کہ آزاد مملکت کا قیام مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کتابچے کے بعد بھی چودھری رحمت علی نے کئی اور رسالے تحریر کیے، جس میں اپنے تصورات کو مزید تشریح اور وسعت کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ اگلے مراحل میں انہوں نے بنگال، آسام اور حیدرآباد دکن کو بھی مسلم مملکتوں کی حیثیت دینے کی تجویز پیش کی۔ پھر اپنے تصور میں مزید مسلم ریاستوں کو بھی شامل کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی مستقل جدوجہد اور ثابت قدمی سے چودھری رحمت علی نے جو تحریک جاری رکھی وہ بہت بارآور ثابت ہوئی۔ اس کی اہمیت ان لوگوں سے پوشیدہ نہ رہی، جو ہندوستان کے دستوری مسائل پر غور کر رہے تھے۔ بعض قائدین کی طرح ہندو رہنماؤں نے چودھری رحمت علی کے تصورات کو ایک طالب علم کا محض ناقابلِ عمل اور ناقابلِ تعبیر خواب نہیں سمجھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تصورات سے غافل اور لاپروا نہیں تھے، بلکہ وہ غصے اور ردِ عمل کی حالت میں تھے۔ اس کے باوجود چودھری رحمت علی نے اپنی کوششوں کو بڑی مستقل مزاجی سے جاری رکھا۔ اسے وسعت دینے کے لیے انگلستان کے علاوہ ہندوستان اور یورپ میں بھی متعدد تنظیمی مراکز قائم کیے وہ بالخصوص نوجوان اور مسلم طلبہ کو اپنا ہم خیال اور شریک بنا کر مستقبل کے روشن خیال طبقے کے بہترین اور سب سے زیادہ با اثر عنصر کو ہمنوا بنا رہے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۱۴)

قاضی محمد عیسیٰ

قاضی محمد عیسیٰ مسلم لیگ کے بے لوث رہنما، قائداعظم کے معتمد ساتھی اور تحریک پاکستان کے ایک پرخلوص اور مستعد کارکن تھے۔ ان کی مستقل اور بے لوث جدوجہد جہاں اس مقصد کے لیے مخصوص رہی کہ بلوچستان کو، جس سے ان کا آبائی تعلق تھا، ترقی اور خوشحالی حاصل ہو، وہیں ان کی زندگی کا ایک بڑا اور اہم مقصد یہ ہوگیا تھا کہ وہ حصولِ پاکستان کے لیے سرگرم ہوں اور بلوچستان کا صوبہ پاکستان میں شامل ہو جائے۔ عمر کے جس حصے میں انہوں نے ہوش سنبھالا، وہ عرصہ بلوچستان میں عام سیاسی و قومی شعور کی ابتداء کا تھا۔ ویسے بلوچستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کی روایات اس وقت تک کافی قدیم ہو چکی تھیں اور عام افراد میں انگریزوں کے خلاف جذبات مشتعل ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی عام سیاسی صورتِ حال کا بھی وہاں اثر پڑ رہا تھا اور اب بلوچستان کے مسلمان بھی، جو آبادی کے ۹۹ ٪ کثیر طبقہ پر مشتمل تھے، اس بات سے بخوبی واقف ہو چکے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اب اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنے قومی حقوق اور سیاسی فائدے حاصل کرنے کے لیے نہایت سرگرمی اور بے خوفی کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ہندوؤں کی اسلام دشمن تحریکوں اور مسلمانوں کے خلاف ان کی کوششوں سے اب یہ بات طے پا چکی تھی کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر ہندوستان میں نہیں رہ سکتے۔ اسی پس منظر میں ہندوؤں کی طرف سے "نہرو رپورٹ" منظرِ عام پر آئی اور مسلمانوں کی طرف سے قائداعظم نے "چودہ نکات" پیش کیے۔ ان "چودہ نکات" میں قائداعظم نے بلوچستان کی صوبائی خودمختاری کو بھی مطالبہ کی صورت میں شامل کیا تھا۔ یہی مطالبہ مسلم لیگ نے اس سے قبل ۱۹۲۷ء میں کلکتہ میں اپنے سالانہ اجلاس کی ایک قرارداد میں بھی کیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا جائے اور صوبہ سرحد اور بلوچستان کو اسی طرح صوبائی درجہ دیا جائے جیسا کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہے۔ اس مطالبے کے اثرات خود بلوچستان میں بڑے دوررس نتائج کے حامل ہوئے۔ اس وقت تک وہاں نوجوانوں کا ایک ایسا طبقہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی سرگرم عمل ہو گیا تھا جس نے علیگڑھ یونیورسٹی اور یورپ کی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کی تھی اور جدید قومی و سیاسی شعور سے آشنا ہو چکا تھا۔ قاضی محمد عیسیٰ بھی ایسے ہی پرجوش اور مخلص نوجوان تھے جو انگلستان سے قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اور قومی اور سیاسی مسائل سے بھی آگاہ تھے۔ ۱۹۳۸ء میں جبکہ وہ انگلستان سے واپس آئے تھے، مسلمانوں کے قومی و سیاسی معاملات میں حصہ لینے لگے تھے۔ اس وقت ان کی ملاقات ایک ذہین اور پرجوش نوجوان کی حیثیت سے قائداعظم سے ہوئی۔ قائداعظم نے انہیں بلوچستان میں مسلم لیگ کے قیام کا کام سپرد کیا۔ چنانچہ قاضی عیسیٰ نے نہایت لگن اور تندہی کے ساتھ بلوچستان میں مسلم لیگ کے قیام کی کوشش کی۔ اور انہیں بہت جلد کامیابی حاصل ہو گئی۔ اس وقت انہیں بعض دیگر پرخلوص اور مستعد افراد کا تعاون بھی حاصل ہوا، چنانچہ مسلم لیگ بہت مختصر عرصے میں بلوچستان میں پھیل گئی اور مسلمانوں کی ایک مقبول اور مؤثر جماعت کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ اس کو مؤثر اور فعال بنانے میں قاضی عیسیٰ کی کوششیں بہت نمایاں اور مؤثر تھیں۔ چنانچہ وہ وہاں اس کے قیام ۱۹۳۹ء سے ۱۲ سال تک اس کے مستقل صدر منتخب ہوتے رہے۔ اور پھر ۱۹۴۰ء میں مرکزی مجلس عاملہ کے بھی رکن منتخب ہوئے۔ اسی سال جب مارچ میں لاہور کے سالانہ اجلاس میں مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان پیش کی تو قاضی عیسیٰ نے بلوچستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کی تائید میں ایک مدلل اور ولولہ انگیز تقریر کی۔ اور پھر بلوچستان میں حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں نہایت سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ تنظیمی اور تبلیغی دورے کیے، مذاکروں اور جلسوں کا اہتمام کیا، ہندوستان کے نامور اور ممتاز قائدین کو بلوچستان بلا کر ان سے اپنی تحریک کو مقبول بنانے میں مدد لی۔ چنانچہ قائداعظم، نوابزادہ لیاقت علی خاں، نواب بہادر یار جنگ، چودھری خلیق الزماں، مولانا عبدالحامد بدایونی، نواب صدیق علی خاں سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ قائداعظم کے ارشاد پر قاضی عیسیٰ نے بلوچستان کے مسائل اور معاملات پر ایک انگریزی کتاب "بلوچستان کے معاملات اور مطالبات" تحریر کی۔ یہ کتاب اپنے مقصد میں بہت موثر ثابت ہوئی۔ مسلم لیگ کے مقاصد کو عام کرنے کے لیے اور تحریک پاکستان کو بلوچستان میں مقبول بنانے کے لیے انہوں نے ایک اخبار "الاسلام" بھی جاری کیا، جو وہاں مسلمانوں اور تحریک پاکستان دونوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ قیام پاکستان کے لیے ہونے والے انتخابات میں بھی ان کی کوششیں بہت مثالی اور کامیابی سے ہمکنار رہیں۔ چنانچہ ان انتخابات کی کامیابی نے قیام پاکستان کو یقینی بنا دیا۔ قاضی عیسیٰ نے قیام پاکستان کے دن، جہاں ایک لحاظ سے پاکستان کا قومی پرچم لہرایا، وہیں اپنے خلوص، مستقل مزاجی اور مثالی اور سرگرم جدوجہد کو بھی بار آور دیکھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۱۵)

پیر صاحب مانکی شریف

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی قرارداد پیش کرنے کے وقت تک صورتِ حال یہ ہو گئی تھی کہ ہندو اب اعلانیہ مسلمانوں کے خلاف جارحانہ اقدامات پر آمادہ ہو چکے تھے اور ان کے عزائم اور مقاصد اب کسی سے پوشیدہ نہیں تھے۔ مسلمانوں میں ایک آزاد اسلامی مملکت کا تصور اور ہندوؤں سے علیحدگی کے تصورات اب مستقل بھی ہو چکے تھے اور عام مسلمانوں میں مقبول بھی ہو رہے تھے۔ ملت کا ہر طبقہ اب اپنے طور پر اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے مضطرب تھا جو ہندوستان میں اس کے اکابر مختلف وقتوں اور مرحلوں میں ظاہر کرتے رہے۔ علماء بھی اس صورتِ حال میں اپنے مخصوص طرزِ فکر کی حکومت قائم کرنے کی ضرورت پوری شدت سے محسوس کر رہے تھے اور اس وقت بعض معتبر علماء ـــــ مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی محمد شفیع اور مولانا شبیر احمد عثمانی دو قومی نظریہ پر مشتمل خیالات اور تصورات مسلمانوں میں عام کر رہے تھے اور انہوں نے ایسی صحت مند صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ دیگر مخلص اور بے لوث علماء بھی تحریکِ پاکستان کے لیے سرگرم ہو جائیں۔ چنانچہ اب علماء میں یہ رجحان واضح ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ہر قسم کے غیر اسلامی اثرات سے، خواہ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، محفوظ رہ کر خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے سیاسی اقتدار ناگزیر ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کا اپنا اقتدار ہو یا ان کی اپنی ایک آزاد اسلامی مملکت ہو۔

اسی عرصہ میں ایک مفید اور بہتر صورتِ حال اس وقت بھی رونما ہوئی، جب اپریل ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ نے اپنے ایک اہم اجلاس میں یہ قرارداد منظور کی کہ پاکستان میں حکومت کتاب و سنت کی بنیاد پر قائم ہو گی۔ اس اعلان کے بعد ایک تو وہ علماء، جو کانگریس کے ہم خیال علماء کے رجحانات سے بددل ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے، اب بڑی تعداد میں لیگ کی حمایت کرنے لگے اور تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لینے لگے۔ اس مرحلے پر بعض ممتاز علماء اور مشائخ بھی تحریکِ پاکستان میں شامل ہو گئے اور مسلم لیگ کی حمایت شروع کی۔ ایسے علماء و مشائخ میں، جو ایک وسیع حلقۂ اثر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھتے تھے اور خود معتبر اور قابلِ احترام بھی سمجھے جاتے تھے، پیر صاحب مانکی شریف کو بڑا معیار اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ پیر صاحب نے صوبۂ سرحد کے مسلمانوں میں مسلم لیگ کو مقبول بنانے اور تحریکِ پاکستان کو عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کا سجادہ مانکی شریف صوبۂ سرحد، قبائلی علاقوں اور سرحدی ریاستوں میں بہت احترام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے لیکن یہاں کانگریس اور اس سے وابستہ سیاستدانوں کا اثر اور غلبہ تھا اور ایک لحاظ سے اسے کانگریس کا ناقابلِ شکست قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ پیر صاحب مانکی شریف ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور پھر اس کے لیے سرگرم ہو گئے۔ مسلم لیگ میں ان کی شرکت قائداعظم سے ان کے مذاکرات اور خط و کتابت کے نتیجہ میں ہوئی تھی۔ ان کے مسلم لیگ میں شامل ہو جانے سے صوبۂ سرحد میں تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اس وقت صوبۂ سرحد میں کانگریسی وزارت قائم تھی۔ پیر صاحب کانگریسی رہنماؤں کے خلاف سرگرم ہوئے اور تحریکِ پاکستان کی مقبولیت کے لیے جد و جہد شروع کی۔ چنانچہ نتیجہ کے طور پر جہاں انہیں قید و بند کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں وہیں وہ کامیابی کی طرف بھی بڑھتے رہے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی سرگرمیوں اور کامیابیوں کے لیے حالات سازگار کیے، اور پھر قائداعظم کو صوبۂ سرحد کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ قائداعظم سے ان کا ایسا رابطہ قیامِ پاکستان کے بعد تک قائم رہا۔ قائداعظم نے دیگر رہنماؤں اور علماء کو بھی صوبۂ سرحد کے دورے کے لیے مختلف وقتوں میں بھیجا۔ قیامِ پاکستان کے لیے ہونے والے عام انتخابات میں بھی پیر صاحب کی جد و جہد بہت مستقل اور نہایت مفید رہی۔ ایک ایسا صوبہ جو کانگریس کے زیرِ اثر سمجھا جاتا تھا اور جس کی بجائے خود ایک اہمیت تھی، مسلم لیگ کا حامی بن گیا اور اس نے قیامِ پاکستان کے حق میں رائے دے کر قیامِ پاکستان کو یقینی بنایا۔ اس مفید تغیر و تبدیلی میں پیر صاحب مانکی شریف کی پرخلوص کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۱۶)

میر جعفر خاں جمالی

میر جعفر خاں جمالی اپنے کردار کی نمایاں خوبیوں، رائے کی پختگی، خلوص، خدمتِ خلق اور کوششِ پیہم کے سبب، بلوچستان کے قائدین اور تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں میں ایک امتیاز اور احترام کے حامل رہے ہیں۔ قومی مسائل سے ہمدردی اور ملی فلاح و بہبود کی خواہش ان کی شخصیت کے اوصاف تھے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور ان کی قومی و سیاسی تحریکات سے اثر قبول کرتے رہے، اور جب تحریکِ پاکستان ایک ہمہ گیر تحریک کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور اب جبکہ اس صورتِ حال میں بلوچستان کا سیاسی مستقبل بھی زیرِ بحث آنے لگا، تو وہ اپنی دیرینہ خواہش اور بلوچستان کے بہتر مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے قائداعظم سے روابط تھے اور وہ ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی سے بھی وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔ بلوچستان کے رہنماؤں میں قاضی محمد عیسیٰ اور نواب محمد خاں جوگیزئی سے بھی ان کے قریبی اور دوستانہ تعلقات تھے اور وہ ان کی ہمراہی میں تحریکِ پاکستان کی مقبولیت اور کامیابی کے لیے سرگرم بھی رہتے تھے۔ ان کی اب یہ عین خواہش ہو گئی تھی کہ بلوچستان پاکستان کا حصہ بن جائے۔ وہ جانتے تھے کہ بلوچستان میں جغرافیائی نشیب و فراز کی وجہ سے کسی بھی اجتماعی تحریک کا منظم اور کامیاب ہونا بڑا دشوار ہے، پھر بالخصوص قبائلی علاقے، جہاں اس وقت قبائلی نظام اپنی روایتی اور حقیقی صورت میں موجود تھا، کسی بھی اجتماعی تحریک کے لیے نہایت ہی دشوار گزار تھے۔ میر جعفر خاں جمالی کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے ایسے دور دراز علاقوں میں ایک اجتماعی تحریک ـ تحریکِ پاکستان کی قیادت و رہنمائی کی۔ انگریزی دورِ حکومت میں پورے ہندوستان میں صرف بلوچستان ہی ایک ایسا علاقہ تھا جسے انگریزوں نے "حکم بردار" علاقے کی حیثیت دے رکھی تھی۔ تحریکِ آزادی کے آخری دور میں جب ۱۹۳۵ء کا قانون نافذ ہوا تو بلوچستان میں کانگریس کے نقطۂ نظر کے تحت کام کرنا زیادہ آسان تھا اور اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ ہندوؤں اور انگریزوں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خیالات کا بڑی حد تک اتفاق تھا اور انگریز ہندوؤں کی خوشنودی چاہتے تھے مسلم لیگی نقطۂ نظر کے لیے بلوچستان میں بڑی دشواریاں موجود تھیں۔ ایسے کٹھن دور میں یہ میر جعفر خاں جمالی کی ہمت اور مستقل مزاجی تھی کہ انہوں نے اپنی قوتیں مسلم لیگ کے لیے مخصوص کر دیں۔ قاضی عیسیٰ کے ساتھ انہوں نے لیگ کی تنظیم اور اس کی مقبولیت میں اضافے کے لیے شدید محنت کی۔ اس کے نائب صدر بھی منتخب ہوئے۔ اس کے تحت رفاہی اور امدادی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ اپنے علاقے میں انہوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے بھی خاص طور پر کوششیں کیں۔ اپنے صرفے سے مدرسے قائم کیے اور انہیں مالی امداد دیتے رہے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے بلوچستان کے عوام کو قبائلی سطح سے اٹھا کر اسلامی قومیت کے رشتے میں منسلک کر دیا۔ گو یہ رشتہ پہلے سے موجود تھا، مگر اس کے احساس میں اضطراب اور جوش کی کمی تھی۔ چنانچہ اس طرح جہاں بلوچستان کے عوام میں لیگ کو مقبولیت حاصل ہوئی اور پاکستان کا حصول ان کے عقیدے کا ایک حصہ بن گیا، وہیں وہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی مشکلات اور ان کے درد و غم کے بھی شریک بن گئے۔ جب بنگال میں قحط پڑا اور بہار اور دوسرے علاقوں میں شدید مسلم کش فسادات ہوئے، تو بلوچستان کے مسلمانوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ رہیں۔

قیام پاکستان کے لیے ہونے والی رائے شماری میں بھی جعفر خاں جمالی کی جدوجہد بہت مثالی اور مؤثر تھی۔ بلوچستان کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ کہتے تھے کہ "ہم ایک آزاد مملکت کی بنیاد ڈالنے والے ہیں۔ ہم کسی قیمت پر بھی ہندوؤں کی غلامی قبول نہیں کریں گے، ہم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلیں گے، بلوچستان کے عوام کی آزادی کا بہترین تحفظ صرف پاکستان میں شامل ہونے کی صورت میں ہی ممکن ہے۔"

اسی طرح جب تقسیم کے وقت ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستان یا بھارت کسی کے ساتھ بھی الحاق کر سکتے ہیں تو انگریزوں کی یہ خواہش تھی کہ ریاست قلات، جو بلوچستان کے ایک حصہ میں تھی، بھارت کے ساتھ الحاق کر لے، لیکن جعفر خاں جمالی نے بڑی جدوجہد کے بعد قلات کو بھی پاکستان میں شامل کر لینے میں کامیابی حاصل کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۱۷)

نواب محمد خان جوگیزئی

تحریکِ پاکستان کو بلوچستان کے صوبہ میں جن قائدین کی کوششوں کی وجہ سے کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں نواب محمد خان جوگیزئی کا نام بھی اپنی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے سیاسی شعور کے اظہار اور ان کی قومی جدوجہد کا دور، وہ تھا کہ جب بلوچستان میں ایک آزاد اسلامی مملکت اور تحریکِ پاکستان کے لیے فضا سازگار ہو چکی تھی۔ اگرچہ ایک عرصہ تک مسلم لیگ اور قائداعظم کا رابطہ بلوچستان کے دور دراز اور سنگلاخ علاقے تک نہ ہو سکا تھا، لیکن مسلم لیگ اور قائداعظم کو اس صوبہ کی خوشحالی اور خود مختاری سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی دوسرے صوبوں سے رہی۔ اس وقت سے، جب سے کہ لیگ نے ہندوستان میں ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کے قومی اور سیاسی حقوق کے لیے مطالبات پیش کیے، اور ان کے حصول کی خاطر جدوجہد شروع کی، بلوچستان ہمیشہ اس کی توجہ کا مرکز رہا۔ پھر جب اسے قاضی محمد عیسیٰ اور میر احمد یار خان کا تعاون حاصل ہو گیا تو اسے بلوچستان میں بھی اپنی سرگرمیوں کے لیے فضا سازگار ملی۔ چنانچہ یہاں ۱۹۳۹ء میں اپنے قیام سے لیگ کو جن دوسرے با اثر رہنماؤں کا تعاون حاصل ہوا، ان میں نواب محمد خان جوگیزئی بھی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

وہ ۱۹۰۸ء سے اپنے قبیلہ کے سردار تسلیم کیے گئے تھے اور اپنے علاقہ میں کافی با اثر تھے اور قومی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ بہت جلد مسلم لیگ کو ان کا تعاون حاصل ہو گیا۔ یہ وہ عرصہ ہے کہ جب ہندوستان کے مسلمان انگریزوں سے آزادی اور ہندوؤں سے علیحدگی کی تحریک میں اس حد تک پرجوش اور سرگرم ہو گئے تھے کہ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں انہوں نے "قراردادِ پاکستان" کو اپنی خواہش کے عین مطابق قرار دیا۔ اس کی تائید و حمایت میں یہاں متعدد جلسے ہوئے اور اس کی کامیابی کے لیے جدوجہد شروع کی گئی۔ قیامِ پاکستان کے مقصد کو عام کرنے اور اس کی تحریک کو باقاعدہ چلانے کے لیے ایک بڑے جلسے میں، جو نواب محمد خان جوگیزئی کے علاقے میں ان کی کوششوں سے منعقد ہوا، ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نواب جوگیزئی ہمیشہ مسلم لیگ کے سرگرم حامیوں میں رہے اور اس کی کامیابیوں کے لیے مستقل جدوجہد کرتے رہے۔ لیگ کے مقاصد اور اس کی تحریک سے انہیں جو لگاؤ تھا خود لیگ اور قائداعظم کو اس کا اعتراف تھا۔ چنانچہ جب بلوچستان سے دستور ساز اسمبلی کے لیے مسلمان نمائندے کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو لیگ نے نواب جوگیزئی کی حمایت کی اور ایک سخت مقابلے کے بعد کانگریس کے نمائندے کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ نواب جوگیزئی ایک واضح اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ لیگ اور تحریکِ پاکستان کی مقبولیت کا یہ ایک ثبوت تھا۔ یہ کامیابی بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کی کامیابی کا ایک سنگِ میل ثابت ہوئی۔ اس مرحلہ پر نواب جوگیزئی نے کہا کہ ــــ "پاکستان کی آزاد مسلم مملکت کے قیام کے لیے بلوچستان کے مسلمان ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہیں اور ہندوستان کے مستقبل کے لیے کوئی آئین مسلم لیگ کی شمولیت اور خواہش کے بغیر جائز نہیں ہوگا"۔ اسی مسئلہ پر جب مسلم لیگ نے مرکزی دستور ساز اسمبلی میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک احتجاجی تحریک شروع کی تو نواب جوگیزئی اس میں بھی پیش پیش رہے اور دستور ساز اسمبلی میں شریک نہ ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے لیے جو تحریک سرگرم تھی ــــ وہ اب اپنی انتہا پر تھی۔ اب یہ بات طے پا چکی تھی کہ انگریز اس ملک سے چلے جائیں گے، ہندوستان تقسیم ہو جائے گا۔ اس مسئلہ پر کہ بلوچستان پاکستان میں شامل ہو ــــ بلوچستان میں لیگ اور اس کے حامی رہنماؤں نے پھر ایک ولولہ انگیز تحریک شروع کی جس کا مقصد بلوچستان کو پاکستان کے ساتھ شامل کرنا تھا۔ اس سلسلے میں رائے دینے کے لیے جو عام انتخابات ہوئے، یہ اس تحریک کا اس وقت آخری فیصلہ کن مرحلہ تھا ــــ چنانچہ لیگ کے قائدین اور خود نواب جوگیزئی اس تحریک میں مستعد ہوئے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک پاکستان کے قائدین (۱۸)

شیخ غلام حسین ہدایت اللہ

شیخ غلام حسین ہدایت اللہ سندھ میں مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ سندھ میں مفید انتظامی اور قانونی کاموں میں صرف ہوا۔ بمبئی یونیورسٹی سے قانون کی سند حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۰۴ء سے قومی اور سیاسی زندگی میں حصہ لینے لگے اور زندگی کی آخری مدت تک سیاسی دلچسپی کو برقرار رکھا اور سندھ میں ممتاز سیاسی رہنما کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ پہلے پہل بلدیہ حیدرآباد کے نائب صدر منتخب ہوئے اور پھر حیدرآباد میں ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ کے پہلے غیر سرکاری صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں بمبئی میں مجلسِ دستور ساز کے رکن منتخب ہوئے اور اس عہدے پر ۱۹۲۰ء تک فائز رہے اور اس کے بعد ۱۹۲۸ء تک حکومتِ بمبئی میں وزیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۳۴ء تک بمبئی کی مجلسِ دستور ساز کے صدر اور گورنر کی مجلسِ انتظامیہ کے نائب صدر بھی رہے۔ اس دوران حکومتِ ہند کی طرف سے دو مرتبہ لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنسوں میں بھی شریک ہوئے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں جب بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کا اعلان ہوا تو سندھ کی مجلسِ مشاورت کے صدر نامزد کیے گئے۔ اس کے بعد وہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں جب "کیبنٹ مشن" کی تجویزوں پر بحث شروع ہوئی اور شملہ میں کانفرنس منعقد ہوئی تو انہوں نے بھی اس بات چیت میں اہم حصہ لیا۔ سندھ کی سیاست میں انہیں اس حد تک اہمیت اور مقام حاصل رہا کہ ۱۹۴۲ء سے قیامِ پاکستان اور اس کے ایک سال بعد اپنے انتقال تک اس کے وزیرِ اعلیٰ رہے۔

ان کی سیاسی اور اجتماعی زندگی زیادہ تر رفاہِ عامہ اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں بسر ہوئی۔ اس وقت بھی جب وہ ابتدا میں حیدرآباد کے بلدیاتی محکموں سے وابستہ تھے، اور بعد میں حکومتِ بمبئی میں وزیر کی حیثیت سے شامل ہونے کے وقت بھی وہ سندھ میں مسلمانوں کے عام مفاد کے مطابق کام کرتے رہے۔ حکومت میں ان کو رفاہِ عامہ کا محکمہ ہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سپرد کیا گیا تھا۔

اپنی وزارت کے زمانے میں وہ صوبہ کے مسلمانوں کے تعلیمی امور میں بھی کافی دلچسپی لیتے تھے اور چاہتے تھے کہ سندھ کے مسلمان تعلیم کی طرف خاص طور پر توجہ دیں۔ حکومتِ بمبئی میں ان کے عہدِ وزارت کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ سرکاری اور قانونی امور میں اردو زبان کو بھی استعمال کیا جانے لگا۔ اس سے قبل وہاں ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں میں قانونی امور انجام دیے جاتے تھے۔ شیخ غلام حسین ہدایت اللہ نے ۱۹۲۴ء میں ایک حکم جاری کیا جس کے مطابق اردو کو صوبۂ بمبئی میں وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو سرکاری طور پر دوسری مقامی زبانوں کو پہلے سے حاصل تھی۔ ان کا ایک اور اہم کارنامہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے اسلام کے خلاف ہندوؤں کی ایک مشہور کتاب "ستیارتھ پرکاش" کی اشاعت کو سندھ میں ممنوع قرار دیا۔ مسلمانوں کی تہذیب اور اسلام سے ان کی وابستگی کا یہ نمایاں مظہر تھا۔

قائداعظم کی شخصیت اور ان کی جدوجہد سے وہ بہت متاثر تھے اور مسلم لیگ میں شامل رہ کر اس کی تحریکوں میں پیش پیش رہے۔ ان کی تمام کوششیں اور ان کی ساری جدوجہد اس مقصد پر مرکوز رہی کہ مسلمان اپنے حقوق حاصل کر لیں اور آزادانہ زندگی گزاریں۔ قیامِ پاکستان کو وہ مسلمانوں کی اولین ضرورت اور ان کی خوشحالی و ترقی کا ضامن سمجھتے تھے۔ انہی مقاصد کے لیے وہ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کی تحریک میں بھی سرگرم ہوئے اور پھر تحریکِ پاکستان کے لیے مستقل جدوجہد کرتے رہے۔ قائداعظم کی جدوجہد اور ان کے مقاصد کا یہ ایک ثبوت تھا کہ جب حکومتِ برطانیہ "کیبنٹ مشن" کے فیصلوں پر اتفاق کرنے اور لیگ اور کانگریس کو مساوی نشستیں دینے کے وعدہ سے پھر گئی اور اس نے ہندوؤں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا تو قائداعظم نے "یومِ راست اقدام" منانے کا اعلان کیا اور سرکاری امور سے علیحدگی اور خطابات واپس کر دینے کی ہدایت کی، چنانچہ شیخ غلام حسین ہدایت اللہ نے، جنہیں "سر" کا خطاب دیا گیا تھا، اپنا یہ خطاب واپس کر دیا۔ ان کی مفید کوششوں اور تحریکِ پاکستان سے ان کے لگاؤ کے سبب قائداعظم نے انہیں قیامِ پاکستان کے بعد سندھ کا وزیرِ اعلیٰ نامزد کیا۔ وہ ۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء تک اس ذمہ داری پر فائز رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۱۹)

نواب شاہنواز خاں ممدوٹ

نواب شاہنواز خاں ممدوٹ مسلم لیگ کے ایک پرخلوص کارکن اور سرگرم منتظم تھے۔ پنجاب میں ایک ایسے وقت جب مسلم لیگ کو بڑے نشیب و فراز اور بڑی دقتوں اور رکاوٹوں کا سامنا تھا، مسلم لیگ کی تنظیم اور اس کی مقبولیت میں ان کا بڑا عمل دخل رہا۔ دراصل مسلم لیگ کو پنجاب میں اپنے قیام سے اس وقت تک، جب تک کہ وہ اپنی نئی تشکیل اور تنظیم کے بعد بہت زیادہ مستحکم اور طاقتور نہ بن گئی، بڑی رکاوٹوں اور دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پھر پنجاب میں اس کی صوبائی شاخ کے قیام ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۴ء تک کا زمانہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ پنجاب پر خصوصاً سخت آزمائش اور اضطراب کا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں قائداعظم لاہور گئے اور انہوں نے مسلم لیگ کے استحکام کے لیے نئی تدابیر اختیار کیں۔ کانگریس بھی پنجاب میں اپنے اثرات قائم کرنے کے لیے خاص طور پر جدوجہد کرتی رہی۔ پھر خود بعض علاقائی جماعتیں بھی مسلم لیگ کے مقابلے میں سرگرم تھیں۔ اس زمانے میں پنجاب کی سیاست پر یونینسٹ پارٹی کا بڑا غلبہ تھا لیکن اس کے سربراہ میاں فضل حسین کے انتقال کے بعد، جو انگریزوں کے زیرِ اثر تھے، اس کی قیادت سردار سکندر حیات خاں کے ہاتھ آئی۔ پھر اسی اثنا میں اس میں بعض مفید تبدیلیاں بھی آئیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب ہندوستان میں ۱۹۳۵ء کے قانون کا اعلان ہو چکا تھا اور اب اس قانون کے تحت ۱۹۳۷ء میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔ یہ انتخابات مسلمانوں کے مستقبل کے لیے بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ اس میں کامیابی سے مسلمان اپنی اس منزل کے قریب پہنچنے کا امکان رکھتے تھے جو ان کی زندگی کا اب ایک بنیادی مقصد بن چکی تھی ——— اور اس کا خواب وہ ایک طویل عرصے سے دیکھتے آئے تھے۔ چنانچہ قائداعظم نے ان انتخابات میں بھرپور حصہ لینے کے لیے مسلم لیگ کی نئی تنظیم و ترتیب شروع کی۔ پنجاب میں بھی لیگ کی تنظیمِ نو کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ اب انہیں وہاں علامہ اقبال کا بھی خصوصی تعاون حاصل ہو گیا تھا ——— جو اب اسی اضطراب کی حالت میں تھے کہ ایک آزاد اسلامی مملکت کے لیے اپنے پیش کیے ہوئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصور کو عملی صورت اختیار کرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پنجاب میں مسلم لیگ کی صدارت قبول کر لی۔ قائداعظم نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لیے پنجاب میں ۳۵ رہنماؤں پر مشتمل ایک تنظیمی کمیٹی قائم کی، جس میں نواب شاہنواز خان ممدوٹ بھی شامل تھے اور ان رہنماؤں میں بہت ممتاز اور با اثر سمجھے جاتے تھے۔

نواب ممدوٹ کو مسلم لیگ اور اس کی تحریکوں سے بڑی دلچسپی رہی۔ وہ ہمیشہ قومی اور سیاسی امور میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ لاہور میں مسجد شہید گنج کو، جس پر سکھوں نے قبضہ کر لیا تھا، واپس لینے کے لیے جو ایک شدید احتجاجی تحریک شروع ہوئی، نواب ممدوٹ اس میں بھی شریک رہے۔ مسلم لیگ کی مختلف تنظیمی اور دستوری تحریکوں میں اور اس کے سالانہ جلسوں میں، جو ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہوتے تھے، شامل ہوتے۔ مسلمانوں کے مستقبل کے لیے لیگ نے جو موقف اختیار کیا تھا، نواب ممدوٹ پوری طرح سے متفق بھی تھے بلکہ خود بھی اسی انداز پر سوچتے اور عمل کرتے تھے۔ چنانچہ ان دنوں، جب مختلف قائدین، ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں مختلف تجاویز پیش کر رہے تھے اور آئے دن ایسے مفید تصورات سامنے آ رہے تھے، نواب ممدوٹ نے اپنے ایک دوست میاں کفایت علی کی ایک تجویز کو، جو "ایک پنجابی" کے فرضی نام سے شائع ہوئی تھی، شائع کرنے اور عام کرنے میں حصہ لیا تھا۔ اس تجویز میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کے مفاد میں ہندوستان کو پانچ حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم اور مقبولیت کے لیے بھی وہ ہمیشہ بہت سرگرم رہے۔ اپنے خلوص، لگن اور تعاون کی وجہ سے وہ اس کے صدر منتخب کیے گئے۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کی صدارت کے دور میں مسلم لیگ کو پنجاب میں بہت تقویت، استحکام اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ تھوڑے سے ہی عرصے میں پنجاب میں لیگ کی ستائیس ضلعی شاخیں اور ایک سو چار ابتدائی شاخیں قائم ہو گئیں۔ لیگ کی مقبولیت اور وسعت کا ایسا دور پنجاب میں کبھی نہیں آیا تھا۔ انہیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ لاہور میں ۱۹۴۰ء میں لیگ کے تاریخی اجلاس کا، جس میں قرارداد پاکستان پیش کی گئی، سارا انتظام انہی کے ذریعہ ہوا۔ قرارداد پاکستان کی تصنیف میں بھی ان کا تعاون شامل رہا۔ پھر اس تاریخی اجلاس میں، جس میں کہ "قرارداد پاکستان" پیش کی گئی، نواب ممدوٹ مجلس استقبالیہ کے صدر تھے اور اپنا خطبۂ استقبالیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش کیا تھا۔ اپنے انتقال سنہ ۱۹۴۲ء تک وہ مستقل لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے اور اپنی مستقل مزاجی، خلوص اور قومی ہمدردی کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۲۰)

چودھری خلیق الزماں

چودھری خلیق الزماں برعظیم پاک و ہند کی سیاسی زندگی میں بے لوث اور سرگرم کارکن کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ علیگڑھ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد سیاسی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگے اور بہت جلد ایک ممتاز رہنما کے طور پر مشہور ہوئے۔ ان کے دل میں آزادی کا جو جذبہ پیدا ہو چکا تھا اس کا اظہار مختلف سرگرمیوں میں ہوا ہے۔ وہ ابتدا ہی سے کانگریس اور مسلم لیگ کی تحریکوں میں پیش پیش رہے۔ "میثاقِ لکھنؤ" کا واقعہ انکی سیاسی سرگرمیوں کی ابتدا میں ہوا تھا۔ اس کی تنظیم اور اس کے اہتمام میں وہ بھی شریک رہے۔ ان کے خیال میں یہ معاہدہ ہندوستان کی سیاسی زندگی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے قومی معاملات میں بڑے دور رس نتائج کا حامل تھا۔ گو کہ یہ تجربہ ناکام ہوا لیکن چودھری خلیق الزماں ان اربابِ فکر میں تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اتحاد کے اس قسم کے معاہدوں کو اس ابتدائی مرحلے پر اہمیت دیتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طویل مدت تک وہ ہندو مسلم اتحاد کے قائل رہے اور اس کے لیے کوشاں بھی تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ ہندو سیاست اور کانگریس کے عزائم اور اس کے منفی نقطۂ نظر کو دیکھتے ہوئے اس خیال سے باز آتے رہے اور ایک موقعہ پر اتحاد کے خیال سے بالکل مایوس ہو گئے اور علیحدگی اختیار کر لی۔

چودھری خلیق الزماں کی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کا بھرپور اظہار ان تحریکوں میں ہوا جو مسلمانوں کی آزادی اور بیرونِ ملک کے مسلمانوں کی ہمدردی میں شروع ہوئی تھیں۔ انہوں نے قومی خدمت کے اپنے جذبے کا اظہار پہلی مرتبہ جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کے موقعہ پر امدادی چندوں کی فراہمی کی کوششوں کے ذریعے کیا تھا۔ وہ اس طبی وفد میں شامل تھے جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ترکوں اور مجاہدین کی امداد کے لیے گیا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب ترکی مغربی طاقتوں کے استعمار کا نشانہ بنا تو اس تکلیف دہ اور دشوار مرحلے پر تحریکِ خلافت کا جاری ہوا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس جذبے کا ایک اظہار تھا جو انہیں عالمِ اسلام کے مسلمانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ہمیشہ وابستہ اور قریب رکھتا رہا ہے۔ چودھری خلیق الزمان دیگر رہنماؤں کے ساتھ خود بھی اس تحریک میں سرگرم رہے۔ وہ لکھنؤ مجلسِ خلافت کے مستعد کارکن کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ اس تحریک کو مزید وسعت اور اہمیت دینے کے لیے جب تحریک عدم تعاون شروع کی گئی اور سرکاری اداروں اور سرکاری امور سے قطع تعلق کیا جانے لگا تو چودھری خلیق الزمان نے جو ایک کامیاب اور با اثر وکیل تھے اور سرکاری عدالت سے وابستہ تھے، یہ وابستگی ختم کر دی اور وکالت ترک کر دی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک ایسی عدالت میں وکالت نہیں کر سکتے جو دراصل غیر ملکی ہو۔ اپنی بھرپور صلاحیتوں کے سبب وہ جس تحریک میں بھی شامل ہوئے اس کے ممتاز رہنماؤں میں شمار ہوتے رہے۔ تحریکِ خلافت اور کانگریس سے قطع نظر ان کی صلاحیتوں کا بہترین اظہار مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں ہوا ہے۔ مسلم لیگ کی تشکیلِ نو کے بعد وہ اس کے ممتاز رہنماؤں میں سمجھے جاتے تھے۔ اس کی قراردادوں اور تجویزوں کا ایک بڑا حصہ انہی کا تحریر کردہ ہے۔ اس معاملے میں انہیں مہارتِ تامہ حاصل تھی اور قائداعظم بھی ان کی اس صلاحیت کے معترف تھے۔ اس وقت جبکہ ایک آزاد اسلامی مملکت کا تصور عام ہو رہا تھا اور اس کے قیام کے لیے کئی تجاویز سامنے آ چکی تھیں، چودھری خلیق الزمان کا ذہن بھی اس سلسلے میں سرگرم رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے علاقوں میں حقِ خود اختیاری ملنا چاہیے۔ ان کی یہ تجویز تھی کہ مسلمانوں کے لیے دو وفاق تشکیل پائیں۔ ایک مشرق میں، جس میں بنگال اور آسام شامل ہوں اور دوسرا مغرب میں، جس میں سندھ، پنجاب اور سرحد کا صوبہ شامل ہو۔ ایک اور مرحلے پر جب انہیں عربوں کے ایک نمائندے کی حیثیت سے لندن جانے کا موقع ملا تو انہوں نے اکابرِ برطانیہ کے سامنے تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی کہ مسلم اکثریت کے علاقوں کو ہندو اکثریت کے علاقوں سے بالکل علیحدہ کر دیا جائے۔

چودھری خلیق الزمان کی سرگرمیاں مسلم لیگ کو فعال اور منظم بنانے، اس کی تحریکوں کو کامیابی دینے میں صرف ہوئیں۔ خصوصاً یوپی مسلم لیگ انہی کی کوششوں سے فعال ہوئی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران وہ قائداعظم کے معتمد ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے اور ہمیشہ ان کے شریکِ کار رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۲۱)

نوابزادہ لیاقت علی خان

نوابزادہ لیاقت علی خان نے اپنی شخصیت اور اپنی جدوجہد سے خاموش اور پرعزم رہنما کا ایک مثالی تصور پیش کیا ہے۔ ان کی ساری زندگی بہت سنجیدہ اور مؤثر قومی امور کی انجام دہی میں گزری ہے۔ انہیں ابتدائے شعور سے ہی قومی اور سیاسی معاملات سے دلچسپی رہی اور وہ اس وقت سے، جبکہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان میں مقیم تھے، ہندوستان کی سیاست میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ انگلستان میں برعظیم کے طلبہ نے ایک ہندوستانی مجلس تشکیل دی تھی۔ جس کے تحت ہندوستان کی ترقی اور سیاست سے متعلق بحث مباحثے ہوتے اور غور و فکر کیا جاتا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان اس مجلس کے سرگرم رکن تھے اور ہندوستان سے متعلق امور میں دلچسپی لیتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد جب وہ ہندوستان سے واپس آئے تو انہوں نے سیاست میں بھی عملی حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۲۶ء میں وہ اپنے صوبے کی مجلسِ قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے اور پھر اپنی انتھک جدوجہد اور اپنے خلوص کی وجہ سے مستقل اس نشست پر منتخب ہوتے رہے۔ اعلیٰ تعلیم و لیاقت کی وجہ سے انہیں انگریزی حکومت کی طرف سے اعلیٰ ملازمت کی پیشکش کی گئی، لیکن انہیں ملازمت پسند نہ تھی، چنانچہ وکالت شروع کی۔ اس وقت جبکہ مسلم لیگ مضبوط اور فعال جماعت نہ تھی اور عام لوگ کانگریس کی پرفریب تحریکوں سے متاثر ہو جاتے تھے، نوابزادہ لیاقت علی خان ہمیشہ کانگریس سے دور رہے اور کبھی اس سے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ ان کی سیاست اور ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ ہندو سیاست کے متوازی رہا اور وہ کبھی اس کے قریب نہ ہوئے۔ ان کے عزائم اور مقاصد اور ان کا مطمحِ نظر مسلم لیگ کی حمایت اور اس کے ساتھ تعاون میں تھا۔ انہوں نے عملی سیاست کی ابتدا ہی سے مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت، جب کہ ۱۹۲۶ء میں وہ اپنے صوبے سے مجلسِ قانون ساز کے لیے منتخب ہوئے تھے، بہت کم عمر تھے۔ قائداعظم نے انہیں اس پر مبارکباد دی تھی۔ اس کم عمری کے باوجود انہوں نے اپنے فرائض اور اپنی ذمے داریوں کو قابلیت اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا تھا۔ چنانچہ وہ صوبائی کونسل کی نائب صدارت کے لیے بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد نوابزادہ لیاقت علی خان کا اثر ملکی اور قومی سیاست میں نمایاں ہوتا رہا۔ "نہرو رپورٹ" کی مخالفت میں وہ بھی پیش پیش رہے اور اس کے جواب میں جب "کل جماعتی کانفرنس" منعقد ہوئی تو وہ اس میں مسلم لیگ کی طرف سے شریک ہوئے۔ قائداعظم نے انہیں "مجلس قائمہ" کا رکن بنایا تھا۔ گول میز کانفرنس کے بعد جب قائداعظم نے انگلستان میں سکونت اختیار کر لی تو نوابزادہ لیاقت علی خان ان رہنماؤں میں شامل تھے جنہوں نے قائداعظم کو ہندوستانی سیاست میں واپس لانے کی کامیاب کوشش کی۔ قائداعظم کی انگلستان سے واپسی کے بعد جب مسلم لیگ کی تشکیلِ نو ہوئی اور وہ ایک منظم، مقبول اور عوامی جماعت بن گئی، تو اس اہم مرحلے پر نوابزادہ لیاقت علی خان اس کے سکرٹری نامزد ہوئے۔ گویا اب وہ قائداعظم کے دستِ راست بھی تھے اور ان کے نائب بھی تھے۔ یہ ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے۔ وہ قیامِ پاکستان تک مسلم لیگ کے سیکرٹری رہے اور اس طویل مدت میں انہیں قائداعظم کا انتہائی معتمد نائب اور دست راست ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔ وہ ہر موقعہ پر اپنی صلاحیت اور لیاقت سے تحریک پاکستان کی تنظیم اور اس کی کامیابی میں مستعد ہوئے۔

عبوری حکومت کے زمانے میں لیاقت علی خان مسلم لیگ کی نشست پر وزیر خزانہ نامزد ہوئے اور انہوں نے متحدہ ہندوستان کا آخری بجٹ پیش کیا۔ اس بجٹ کو ہندوستان کی تقسیم کا ایک اہم سبب سمجھا گیا ہے۔ ہندوؤں اور انگریزوں کی توقع کے خلاف نوابزادہ لیاقت علی خان نے بجٹ کو اس طرح ترتیب دیا تھا کہ اس کی ضرب سرمایہ داروں اور مہاجنوں پر پڑتی تھی، جو بالعموم ہندو تھے۔ کانگریس اور ہندو رہنما اس صورتِ حال میں شدید اضطراب کا شکار ہوئے۔ چند ہی ہفتوں میں خود بعض ہندو رہنما بھی ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کی علیحدگی کو ضروری سمجھنے لگے۔ اس وقت کانگریس میں اس طبقۂ فکر کو اہمیت حاصل تھی جو اشتراکی رجحان کا حامل تھا۔ لیکن اس عوامی اور عام آدمی کے فائدے کے بجٹ پر احتجاج سے ان کے پرفریب نعروں کی حقیقت سامنے آئی اور کانگریس کی حیثیت کو نقصان پہنچا۔ یہ ایک دشوار مرحلہ تھا جسے نواب زادہ لیاقت علی خان کی دور اندیشی اور قابلیت کے سبب مؤثر کامیابی حاصل ہوئی۔ اب پاکستان کے قیام کا مرحلہ ان کے سامنے تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۲۲)

چودھری محمد علی

چودھری محمد علی ہماری قومی تاریخ کے ان رہنماؤں میں ہیں جنہوں نے اپنی ذہانت، بے لوثی اور خلوص کے ذریعے بہت کم مدت میں قوم کو بعض بہت مفید، دوررس اور خاطر خواہ نتائج سے ہمکنار کیا ہے۔ فراغتِ تعلیم کے بعد انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور محکمہ مالیات میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے، لیکن قوم کی زندگی کے نشیب و فراز اور اس کے مقاصد اور اس کی جدوجہد سے خود کو الگ نہ رکھ سکے۔ دراصل قوم کو اب اس قسم کے حالات کا سامنا تھا کہ کوئی حساس باشعور فرد، چاہے اسے کتنی ہی پابندیوں اور مجبوریوں سے واسطہ ہو، اپنے کو ان حالات سے بیگانہ نہ رکھ سکتا تھا۔ قوم کا ایک دیرینہ خواب اب ایک آزاد اسلامی مملکت کے تصور اور اس کے مطالبے کی صورت میں لوگوں کے سامنے تھا، جو خود بھی یہ خواب دیکھ رہے تھے اور اب اس خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے جدوجہد پر آمادہ تھے اور قوم کی رہنمائی کرنے والے تھے۔ چودھری محمد علی نے سرکاری ملازمت کی عاید کی ہوئی پابندیوں اور قانونی ضوابط کے باوجود اپنے قومی احساس اور ملی جذبے کا متواتر ساتھ دیا ہے۔ خاص طور پر تحریکِ پاکستان کے آخری اور اہم مراحل میں مسلم لیگ کے رہنماؤں سے ان کا بہت گہرا اور قریبی رابطہ رہا۔ اور پھر انہیں ان اہم اور دوررس واقعات میں عملی حصہ لینے کا موقع بھی ملا جنہوں نے قیامِ پاکستان کی راہ ہموار کی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں وہ حکومتِ ہند میں جنگ اور رسد کے محکموں میں مالیاتی مشیر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان اپنے عروج پر تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے ہولناک نتائج ابھی تک ظاہر ہو رہے تھے۔ برطانیہ اپنے آپ کو جنگ کے شدید اثرات سے محفوظ نہ رکھ سکا تھا اور اب وہ مختلف اندرونی و بیرونی مسائل میں گھرا ہوا تھا۔ ہندوستان میں اسے سب سے زیادہ شدید اور مؤثر مزاحمت اور مخالفت کا سامنا تھا۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کی مخالفانہ تحریکوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا اور ہندوستان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں اب اس کے دن گنے چنے ہیں۔ چنانچہ وہ اب اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ ہندوستان میں کوئی ایسا قانون نافذ کر دے جسے خود ہندوستانیوں کی مرضی سے ترتیب دیا جائے۔ مختلف مراحل کے بعد کیبنٹ مشن کی تجاویز اب مسلم لیگ اور کانگریس کے سامنے تھیں اور ان کی منظوری کے بعد ان تجاویز کی روشنی میں ایک عبوری حکومت کا قیام عمل میں آنا تھا۔ ایک طویل اور اضطرابی کشمکش کے بعد عبوری حکومت میں چند محکمے مسلم لیگ کے سپرد ہوئے۔ ان میں ایک محکمہ مالیات کا بھی تھا جو مسلم لیگ کی طرف سے نواب زادہ لیاقت علی خان کے ذمے کیا گیا۔ اس وقت چودھری محمد علی چونکہ محکمہ مالیات سے وابستہ تھے اور اس دوران ان کے روابط مسلم لیگی راہنماؤں کے ساتھ مزید گہرے ہو گئے تھے، انہوں نے نواب زادہ لیاقت علی خان کے ساتھ محکمہ مالیات کی تنظیم اور پھر نئے مالی سال پر نئے بجٹ کی تیاری میں تعاون کیا اور ایک ایسا بجٹ تیار کیا، جو برطانوی ہندوستان کی تاریخ میں پہلا عوامی بجٹ تھا۔ یہ عام آدمی کے فائدے کے لیے تھا اور اس سے سرمایہ داروں اور مہاجنوں پر ضرب پڑتی تھی جو زیادہ تر ہندو تھے۔ اس بجٹ کو تقسیم ہند کی راہ میں ایک اہم عامل سمجھا جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دراصل سماجی حیثیت میں بھی کس قدر فرق ہے۔ ہندوؤں اور کانگریس نے اس بجٹ کی مخالفت کی اور اپنے حقیقی عزائم اور مقاصد عریاں کر دیے۔

تقسیم ہند کے موقع پر تقسیم کے مسائل کو طے کرنے کے لیے جو کونسل تشکیل دی گئی تھی، اس کا صدر وائسرائے مونٹ بیٹن تھا اور باقی دو دو ارکان ہندو اور مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے قائد اعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خان اس کونسل کے رکن تھے اور چوہدری محمد علی اس کونسل کی ذیلی کمیٹی "مجلس قائمہ" کے واحد مسلمان رکن تھے جو تقسیم کے انتظامی امور کی ذمہ دار تھی۔ انہیں مسلم لیگ نے پاکستان کی نمائندگی کے لیے نامزد کیا تھا۔ چودھری محمد علی نے بہت نازک اور اہم مراحل میں اپنی ذہانت، لیاقت اور دور اندیشی سے قیام پاکستان کے حق میں فضا سازگار بنانے اور اس دشوار مرحلے کو آسان بنانے میں بہت خلوص اور جانفشانی کا ثبوت دیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۲۳)

خواجہ ناظم الدین

خواجہ ناظم الدین ان رہنماؤں میں سے ایک ہیں جنہوں نے قیامِ پاکستان کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا اور اپنے قول اور عمل سے دیانت داری، نیک نیتی اور مستقل مزاجی کا ثبوت دیا۔ ان کا تعلق ڈھاکہ کے اس نواب خاندان سے تھا جس نے انگریزی عہد میں مسلمانوں کی تعلیم اور فلاح و بہبود کے کاموں سے ہمیشہ بہت دلچسپی لی۔ بنگال کے ممتاز مسلمان رہنما نواب سلیم اللہ خان، جن کی کوششوں سے مسلم لیگ قائم ہوئی تھی، خواجہ ناظم الدین کے ماموں تھے۔

خواجہ ناظم الدین نے اعلیٰ تعلیم علیگڑھ کالج میں حاصل کی اور پھر انگلستان چلے گئے جہاں کیمبرج یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ان کے ذہن کی نشوونما میں علیگڑھ کالج کو بڑا دخل حاصل رہا۔ اس کے زیرِ اثر وہ اس اضطراب سے پہلو تہی نہ کر سکتے تھے جو ہندوستان کے مسلمانوں میں اس زمانے میں پیدا ہو رہا تھا۔ کچھ ان کے خاندان کی سابقہ روایات کا بھی اثر تھا اور کچھ اس زمانے کے حالات میں ان کے مزاج کا بھی دخل تھا کہ وہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اور سیاست میں شروع ہی سے دلچسپی لینے لگے۔ ان کی سیاسی اور قومی زندگی کا آغاز دراصل ۱۹۲۲ء سے سمجھنا چاہیے، جب وہ بلدیہ ڈھاکہ کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۲۷ء تک یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران میں وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن بھی رہے۔ اپنی بے لوث اور انتھک کوششوں کی وجہ سے وہ عوام میں اور بالخصوص مسلمانوں میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں وہ بنگال کی صوبائی کابینہ کے رکن منتخب ہوئے اور پھر ۱۹۳۴ء میں بنگال کے وزیرِ تعلیم بنائے گئے۔ ۱۹۳۵ء میں نافذ ہونے والے قانون کی اصلاحات کے تحت بنگال کی پہلی وزارت میں وزیرِ داخلہ کے منصب پر فائز ہوئے۔ مسلم لیگ کے مقاصد اور اس کے نصب العین سے ہمیشہ انہیں مکمل اتفاق رہا۔ چنانچہ اس کی سرگرمیوں اور اس کی تحریکوں میں خلوص اور سرگرمی سے حصہ لینے لگے تھے۔ مسلم لیگ سے اپنے اس تعلق کی وجہ سے انہیں بہت جلد اس کے ممتاز قائدین میں شمار کیا جانے لگا۔ وہ ۱۹۳۶ء میں لیگ کی مجلسِ عاملہ میں شامل کر لیے گئے، جو برعظیم کے ہر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصے کے ممتاز ترین رہنماؤں پر مشتمل تھی۔ اب خواجہ ناظم الدین مسلمانوں کے صفِ اول کے رہنماؤں میں تھے۔ اور وہ ان چند افراد میں بھی ایک تھے جن پر قائداعظم کو مکمل اعتماد رہا۔ وہ قیامِ پاکستان تک مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے۔ اس درمیانی عرصے میں ۱۹۴۲ء میں وہ بنگال اسمبلی میں لیگ کے اراکین کے قائد بھی بنے۔ اگلے سال انہوں نے بنگال میں مسلم لیگی وزارت بنانے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء تک وہ داخلہ اور رسول محکمے بھی سنبھالتے رہے۔

یہ ان کی مستعدی اور سرگرمی کا ایک نتیجہ تھا کہ کلکتے سے "دی اسٹار آف انڈیا" کے نام سے ایک انگریزی اخبار جاری کیا۔ اس سے پہلے انگریزی زبان میں مسلمانوں کا کوئی اخبار کلکتہ سے نہیں نکلتا تھا۔ کلکتہ میں "مسلم چیمبر آف کامرس" کی بنیاد بھی انہی کی کوششوں سے پڑی۔ تجارتی اور معاشی سطح پر اس کے قیام سے مسلمانوں کو بہت دور رس فوائد حاصل ہوئے۔

خواجہ ناظم الدین نے اپنی ساری زندگی پاکستان کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ اس مسئلے پر کسی مفاہمت کے لیے کبھی تیار نہ ہوئے۔ ان کے تدبر اور ان کی دیانت سے مسلمانوں کے موقف کو بہت تقویت حاصل رہی اور ان کی پرخلوص جدوجہد قیامِ پاکستان کی راہ میں معاون ثابت ہوئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک پاکستان کے قائدین (۲۴)

حسین شہید سہروردی

حسین شہید سہروردی اپنے زمانے کے بہت دلیر، پرخلوص اور مدبر رہنما تھے۔ اپنے خلوص، اپنی ایمانداری اور اہلیت کی صفات کی وجہ سے انہیں تحریک پاکستان کے قائدین میں ممتاز مقام حاصل ہوا۔ برعظیم کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود، سیاسی آزادی اور ان کے مقاصد کی تکمیل میں وہ اپنے جوش اور ولولے کے سبب نمایاں اور مقبول رہے۔ وہ بنگال کے اس مشہور سہروردی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کی قومی خدمت کی اپنی طویل روایات موجود تھیں۔ حسین شہید سہروردی نے انگلستان کی اعلیٰ درجہ کی معیاری درسگاہوں سے تعلیم حاصل کی اور قانون میں ایک امتیازی سند حاصل کر کے برعظیم کے ممتاز اور مثالی قانون دان کے طور پر مشہور ہوئے۔ اس ضمن میں ان کی بھرپور صلاحیتوں اور ذہانت کو بڑا دخل حاصل رہا۔ مسلسل ۲۷ سال تک کلکتہ بار کے انتخابات جیتتے رہے۔ قومی خدمات کی طویل خاندانی روایات کا حامل ہونے کی وجہ سے خود بھی قومی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں کلکتہ کارپوریشن کے ڈپٹی میئر بنے اور پھر تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا اور کلکتہ خلافت کمیٹی کے سکرٹری نامزد ہوئے۔ اپنی اعلیٰ تنظیمی لیاقت اور بے لوثی کے سبب بہت جلد ممتاز، دلیر اور پرجوش رہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔ ۱۹۲۱ء میں بنگال اسمبلی کی رکنیت کے لیے منتخب ہوئے اور اس کے بعد قیام پاکستان کے وقت تک متواتر اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے رہے۔

مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ان کی کوششیں مستقل اور بے لوث رہیں۔ مسلم لیگ کی تحریکوں اور اس کے مقاصد میں بھی وہ شریک رہے۔ بنگال مسلم لیگ کے سکرٹری رہے اور اس کی مقبولیت اور کامیابی کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی شخصیت، ذہانت اور ان کی جدوجہد سے مسلم لیگ کو نہ صرف بنگال میں بلکہ کل ہند سطح پر بھی تقویت حاصل ہوئی۔ مجلس دستور ساز میں لیگ کی نمائندگی کرتے رہے اور متعدد مواقع پر مختلف محکموں میں وزیر محنت، وزیر خزانہ، وزیر صحت اور وزیر بلدیات نامزد ہوئے۔ ان کی دلیرانہ جدوجہد اور انتظامی لیاقت کے سبب مسلمانوں کو ان سے خاطر خواہ فوائد حاصل ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کا ایک بہت نمایاں اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۴۰ء میں پیش کی جانے والی قراردادِ پاکستان سے متعلق پیدا ہونے والی ایک غلط فہمی کو مکمل اور مؤثر طریقے پر دور کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس قرارداد میں تصورِ پاکستان کے تحت مشرق و مغرب میں آزاد مسلم ریاستوں کا لفظ پاکستان کے مخالفین کی نظروں میں بعض غلط فہمیاں پیدا کر رہا تھا۔ حسین شہید سہروردی نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ۱۹۴۶ء میں لیگ کے اجلاس میں، جو دہلی میں منعقد ہوا، ایک ترمیمی قرارداد پیش کی اور قراردادِ پاکستان کی عبارت میں سے لفظ "ریاستوں" کو خارج کر کے ایک "ریاست" کا لفظ شامل کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ ان کا ایک بہت نمایاں اور پرخلوص کارنامہ ہے جو متحدہ اور مکمل پاکستان سے ان کی محبت اور ان کی باریک بینی کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک اور موقع پر کہ جب کیبنٹ مشن کی تجاویز کو نامنظور کرنے کے باوجود وائسرائے لارڈ ویول نے لیگ سے بدعہدی کرتے ہوئے کانگریس کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دے دی تو مسلم لیگ نے اپنے مطالبات کے حق میں احتجاج کرنے کے لیے "یومِ راست اقدام" منایا۔ حسین شہید سہروردی نے، جو اس وقت بنگال کے وزیرِ اعلیٰ تھے، ایک بہت دلیرانہ فیصلہ کیا اور اعلان کیا کہ "اگر وائسرائے نے مرکز میں مسلم لیگ کو نظر انداز کرتے ہوئے اور طے شدہ اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے کانگریس کو حکومت بنانے کا موقع دیا تو میں بنگال کی مکمل آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دوں گا اور اس صوبے میں متوازی حکومت قائم کر دی جائے گی۔ ہماری مملکت ایک خود مختار مملکت ہوگی اور اس کا برطانوی حکومت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔" یہ ایک بہت جرأت مندانہ اقدام تھا اور اس کے بہت دوررس نتائج سامنے آئے۔ مسلم لیگ کو بھی عبوری حکومت میں شرکت کی دعوت دی گئی اور اس طرح قیامِ پاکستان کی راہ ہموار ہوئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک پاکستان کے قائدین (۲۵)

نواب صدیق علی خان

نواب صدیق علی خان مسلمانوں کے پرخلوص راہنما، قومی کارکن اور مسلم لیگ کے ممتاز اور فعال قائد کے طور پر نمایاں ہوئے۔ صوبۂ متوسط کے ایک نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن ہندوؤں کی جانب سے ایک مسلم کش فساد کے نتیجے میں اپنے والد کی شہادت کے بعد کم عمری ہی میں عملی زندگی میں حصہ لینے لگے۔ اسی عرصہ میں ان کی قومی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ وہ ناگپور میونسپل کمیٹی، ضلعی کونسل اور لوکل بورڈ کے رکن نامزد ہوئے۔ پھر وہ "انجمن حامی اسلام" کے صدر منتخب ہوئے جو مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی ترقی کی ایک تنظیم تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں آئینی اصلاحات کے مطالبے سے بڑھ کر تحریکِ آزادی کا روپ اختیار کر چکی تھیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی سیاست آپس میں اتحاد کی تمام کوششوں کے باوجود اب متوازی راستوں پر رواں دواں تھی۔ مسلمانوں کے سامنے اب ان کی ایک علیحدہ منزل تھی، جس تک پہنچنے کے لیے وہ مختلف سمتوں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہندوؤں کی اسلام دشمن تحریکوں "شدھی" اور "سنگھٹن" اور پھر مسلم کش فسادات سے، جو آئے دن کا معمول تھے، اب وہ پوری طرح باخبر اور بیزار تھے۔ "نہرو رپورٹ" بھی منظرِ عام پر آچکی تھی اور گول میز کانفرنس کے نتائج سے بھی وہ پر امید نہیں تھے۔ ۱۹۳۴ء میں مجلسِ دستور ساز کے لیے انتخابات ہونے والے تھے۔ اپنے حلقے سے نواب صدیق علی خان بھی اس کے لیے امیدوار نامزد کیے گئے تھے۔ اس وقت صوبۂ متوسط میں مسلم لیگ کا اثر و نفوذ زیادہ عام نہیں تھا۔ اس کی جگہ بڑی حد تک "آل پارٹیز مسلم کانفرنس" نے لے لی تھی اور قوم پرست اور کانگریسی مسلمانوں کو بھی وہاں اثر و رسوخ حاصل تھا۔ اس کے باوجود نواب صدیق علی خان نے، جو مسلم لیگ سے متاثر تھے اور قائداعظم کا قرب چاہتے تھے، اس انتخاب میں سرگرمی سے حصہ لیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد سے ان کی جدوجہد کا کل محور مسلم لیگ کے مقاصد اور قائداعظم کی تحریک کے گرد گھومتا رہا۔ صوبۂ متوسط میں مسلم لیگ کو منظم اور فعال بنانے میں ان کی کوششیں بہت نمایاں تھیں۔ وہاں کانگریس کے اثرات کو زائل کرنے اور اس کی مسلم دشمن تحریکوں، جیسے اردو کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بجائے ہندی کو جبری طور پر اسکولوں میں نافذ کرنے اور مسلمان بچوں کو زبردستی ہندی اختیار کرنے کی منظم کوششوں کا رد کرتے اور "ودیا مندر اسکیم" کی ناکامی میں، جس کا مقصد مسلمان طلبہ کو ہندو تہذیب میں ضم کرنا تھا، نواب صدیق علی خان کی کوششیں بہت مؤثر اور مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہوئیں۔

مسلم لیگ کی تحریکوں میں پیش پیش رہنے کے سبب بہت جلد نواب صدیق علی خان اس کے سرکردہ رہنماؤں میں شمار کیے جانے لگے اور انہیں قائداعظم کا قریبی اور معتمد رفیق بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مسلم لیگ کے تنظیمی امور کی نگرانی اور ان کی بجا آوری کے لیے ایک رضاکارانہ تنظیم "مسلم نیشنل گارڈ" کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اپنی زبردست تنظیمی صلاحیتوں کے سبب نواب صدیق علی خاں کو اس تنظیم کا سالارِ اعلیٰ نامزد کیا گیا۔ چنانچہ اس ذمہ داری کے سبب مسلم لیگ کی سرگرمیوں اور قائداعظم کی جدوجہد میں انہیں بھی شریک رہنے کے مستقل مواقع حاصل ہوئے۔ قائداعظم نے متعدد اہم مواقع پر انہیں مسلم لیگ کی نمائندگی کے لیے اور دستور ساز اسمبلی میں لیگی اراکین کا ڈپٹی چیف بھی نامزد کیا۔ مسلم لیگ کو منظم اور فعال بنانے کے لیے جو وفود تنظیمی دوروں پر بھیجے جاتے تھے، ان میں نواب صدیق علی خاں نے کئی صوبوں کا دورہ کیا اور مسلم لیگ کے مقاصد اور اس کے نصب العین سے عام مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ صوبۂ سرحد میں ۱۹۴۶ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، جس کا افتتاح قائداعظم نے کیا تھا، صدارت نواب صدیق علی خان نے کی۔

اپنی پرخلوص اور مستقل جدوجہد سے انہوں نے تحریک پاکستان کے ایک مخلص اور جانباز سپاہی کا کردار ادا کیا ہے، جس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد حصولِ پاکستان میں دیکھا جا سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۲۶)

سردار عبدالرب نشتر

اپنی اصول پسندی، دیانت داری اور ملتِ اسلامیہ سے وفاداری کی بنیاد پر برعظیم پاک و ہند کے جن رہنماؤں کو امتیاز حاصل ہوا ان میں سردار عبدالرب نشتر بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد علیگڑھ کالج سے قانون میں سند حاصل کی اور اپنے آبائی شہر پشاور میں وکالت کا آغاز کیا۔ جلد ہی ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے شہرت حاصل کی اور پھر قوم کے بھی وکیل بن گئے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ علیگڑھ کالج سے فارغ التحصیل طالب علم قومی مسائل اور قومی امور سے بے نیاز رہے ہوں۔ وہاں کی تعلیم و تربیت اور وہاں کا ماحول ہر باصلاحیت فرد کو قومی امور میں دلچسپی لینے پر آمادہ کرتا تھا۔ پھر سردار عبدالرب نشتر کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی صحبت بھی حاصل ہو گئی تھی، چنانچہ اب یہ یقینی تھا کہ سردار نشتر بھی قومی اور سیاسی سرگرمیوں میں ان کے شریک کار بنیں۔ تحریک خلافت اور تحریک عدمِ تعاون کے ذریعے قوم کے ساتھ ان کے روابط کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ صوبۂ سرحد میں ان تحریکوں کی تنظیم اور وسعت کے لیے وہ ہمیشہ مستعد رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تقریر کا انداز اور طرزِ فکر مولانا محمد علی سے سیکھا تھا۔ تنظیمی صلاحیتوں اور مؤثر کردار و گفتار کے سبب اپنے علاقے کے لوگوں میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔

تحریک خلافت کے ساتھ ساتھ صوبۂ سرحد میں اصلاحات کی تحریک اور مسلمانوں کی دیگر تحریکوں میں سرگرم رہے۔ ۱۹۲۹ء میں پشاور میونسپل کمیٹی کے پہلے انتخابات میں کامیاب ہو کر منتخب ہوئے۔ اور پھر اگلے سال جب سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی اور صوبۂ سرحد میں ایک "وار کونسل" قائم ہوئی جس کا مقصد غیر ملکی اشیاء کے استعمال کو ترک کرنا اور شراب خانوں پر احتجاج کرنا تھا تو اس تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے سردار نشتر قید کر دیے گئے۔

اس دوران کانگریس کی مسلم دشمن تحریکوں اور "شدھی" اور "سنگھٹن" کے شروع ہونے پر سردار نشتر ہندوؤں کے عزائم اور کانگریسی سیاست کی جانب سے مایوسی کے عالم میں تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"نہرو رپورٹ" کے منظرِ عام پر آنے سے اب انہیں متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے قومی وجود کے لیے خطرات محسوس ہو رہے تھے۔ کانگریسی تحریکوں اور ہندو سیاست کے جال سے خود کو محفوظ رکھنے میں اب انہوں نے مزید تاخیر نہ کی، اس سے علیحدہ ہو گئے اور جب قائداعظم کی قیادت میں مسلمانوں کے نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوا تو سردار نشتر کسی سے پیچھے نہ رہے۔ ۱۹۳۵ء کی قانونی اصلاحات کے اعلان کے بعد صوبۂ سرحد میں پہلی مرتبہ دستور ساز اسمبلی کے انتخابات میں وہ حصہ لے کر پہلے ہی منتخب ہو چکے تھے، اب قائداعظم نے انہیں صوبۂ سرحد میں مسلم لیگ کی تنظیم کا بہت دشوار اور اہم کام سپرد کیا اور ساتھ ہی انہیں مسلم لیگ کی کل ہند مجلسِ عاملہ کا رکن نامزد کیا گیا۔ انہیں قائداعظم کا بہت زیادہ اور مستقل قرب حاصل رہا۔ سیاسی سوجھ بوجھ اور خلوص کی وجہ سے قائداعظم بالعموم انہیں مشوروں میں شامل رکھتے اور ان پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔ برطانوی حکومت اور دوسری سیاسی جماعتوں سے ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے مسئلے پر جب بھی اہم مذاکرات ہوتے قائداعظم انہیں بھی ساتھ رکھتے۔ قوم کی نمائندگی اور رہنمائی کے لیے جو صلاحیتیں اور خوبیاں درکار ہوتی ہیں قائداعظم اسی پیمانے سے اپنے رفیقوں کا انتخاب کرتے تھے۔ سردار نشتر ان کے اس معیار پر پورے اترے تھے، چنانچہ ہر کمیٹی، کمیشن اور دیگر وفود میں شامل کیے جاتے رہے۔ عبوری حکومت میں قائداعظم نے نوابزادہ لیاقت علی خان کی سربراہی میں سردار نشتر کو ایک وزارت سونپی، مواصلات کا قلمدان ان کے سپرد کیا گیا۔ سردار نشتر نے بڑی دلجمعی اور مستعدی سے قوم کی نمائندگی کا مثالی نمونہ پیش کیا اور ایسا ماحول پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی جس کی وجہ سے خود کانگریس تقسیم ہند کو ضروری سمجھنے لگی۔

سردار نشتر پرخلوص سیاسی رہنما اور ولولہ انگیز مقرر کے علاوہ شاعر بھی تھے اور ان کی شاعری ان کے جذبات کی ایک مؤثر اور دلکش تصویر بھی ہے۔ اپنی شخصیت میں وہ نہ صرف وضعداری، شرافت اور نیک نفسی کا مجموعہ تھے بلکہ اسلامی شائستگی اور مشرقی طرزِ زندگی کا نمونہ تھے۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں نمایاں تھیں جو قوم کے بہتر مستقبل کی تعمیر میں صرف ہوتی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکِ پاکستان کے قائدین (۲۷)

قائدِ اعظم

برصغیر پاک و ہند میں قائد اعظم محمد علی جناح کی شخصیت، ان کی ذہانت اور مستقل مزاجی ایک ایسے اعلیٰ مدبر کی علامت تھی جو اپنے جوہر دکھانے کے لیے مناسب وقت اور موقعہ کا انتظار کر رہی ہو۔ سید احمد خان کے بعد ملت کی تنظیم اور اس کے نصب العین کی تکمیل کے لیے قدرت نے قائد اعظم کی شخصیت میں ایک ایسے رہنما کو منظر پر نمایاں کیا ہے جس کی استقامت اور ذہن کی بھرپور صلاحیتوں نے ملت کے اس خواب کو، جسے اس کے اکابر ایک عرصے سے ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی مملکت کی صورت میں دیکھتے آئے تھے، عملی شکل دینے میں سب سے زیادہ مستعدی اور سرگرمی کا ثبوت دیا۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے برعظیم کی سیاسی زندگی میں قدم رکھا۔ اس سال وہ پہلی مرتبہ منظر پر نمایاں ہوئے اور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک انہوں نے مستقل جدوجہد، دور اندیشی، جرأت مندی اور حق گوئی کی ایک مثال قائم کی۔ برعظیم کی سیاسی زندگی میں یہ عرصہ بڑے نشیب و فراز اور کشمکش و اضطراب کا ہے۔ مسلمانوں کے پیش نظر اس کی کئی صورتیں تھیں۔ وہ ایک طرف حکومت کی بے توجہی اور ظلم و زیادتی کا شکار تھے اور دوسری طرف ہندوؤں کی نفرت، کانگریس کی مخالفانہ تحریکوں اور مسلم کش فسادات کے نرغے میں تھے۔ قائد اعظم کی اعلیٰ بصیرت اور ان کی غیر معمولی قائدانہ صلاحیتوں نے منتشر اور مضطرب مسلمانوں کو، ان کے اس مقصد اور نصب العین کے تحت جس کا خواب وہ ایک عرصے سے دیکھ رہے تھے، متحد اور منظم کرنے میں بالآخر کامیابی حاصل کی اور ملت کو اس منزل تک پہنچایا جو اس کے لیے ایک معینہ مقدر کی علامت تھی۔

ایسا بھی نہیں کہ قائد اعظم ہمیشہ ایک ہی راستے پر چلے ہوں۔ پہلے پہل وہ ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے مایوس نہیں تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اس معاہدے کی تشکیل میں، جو "میثاقِ لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہے، ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ معاہدہ ان کی نیک نیتی پر مبنی تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے سے آزادی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہت جلد حاصل ہو سکے گی۔ لیکن کانگریس نے اس معاہدے پر عمل نہ کیا۔ اور اس موقع پر تو وہ مکمل آزادی کی خواہش مند بھی نہ تھی۔ قائداعظم کانگریس کے اس طرح کے رویہ سے مایوس ہوئے اور جب اس کی مسلم دشمن تحریکیں شروع ہوئیں اور کانگریس نے ہمیشہ مسلمانوں کے قومی وجود اور ان کے موقف کو نظر انداز کیا تو قائداعظم نے نہ صرف اس کی تحریکوں سے بیزاری کا اظہار کیا بلکہ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے زیادہ مستعد ہوئے۔ اس کا ایک اچھا اظہار "نہرو رپورٹ" کے جواب میں ان کے پیش کردہ "چودہ نکات" میں ہوا ہے جو انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات کے حق میں پیش کیے تھے۔ بعد میں پھر گول میز کانفرنس اور ۱۹۳۵ء کے قانون کی اصلاحات کے جواب میں ان کے دیے گئے بیانات برعظیم کے مسلمانوں کے موقف کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں۔

اب تک قائداعظم کے سامنے حکومت اور ہندوؤں دونوں کی مسلم دشمنی کے تمام پہلو آچکے تھے۔ اب ان کی تمام کوشش اس مقصد کے لیے تھی کہ برعظیم کی زندگی میں صرف دو قوتوں کا نہیں ایک تیسری قوت مسلمانوں کا بھی حق ہے۔ ان کی جدوجہد کا اب ایک ہی مقصد رہا کہ مسلمان چونکہ ہر اعتبار سے ایک علیحدہ قوم ہیں اس لیے انہیں ان کے مخصوص اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ملنا چاہیے۔ اس صورتِ حال میں ان کی جدوجہد ایک مقررہ منزل کے حصول کی جانب مستقل آگے بڑھتی رہی اور متعدد دشواریوں اور مخالفتوں کے باوجود پیچھے نہ ہٹی۔ انہوں نے حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کو متحد کرنے اور مسلم لیگ کو منظم اور فعال بنانے اور اسے وسعت دینے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ اپنی قوم کے مزاج سے بھی واقف تھے اور مخالفوں کی نفسیات بھی خوب جانتے تھے۔ اس لیے سیاسی زندگی کے تمام مراحل و مقامات پر ان کو پوری گرفت حاصل رہی اور ان کا سیاسی ذہن بے حد منظم، مرتب اور مستحکم تھا۔ وہ ناسازگار حالات میں بھی خود اعتمادی، بلند حوصلگی اور یقین محکم کے سبب ناقابلِ تسخیر رہے۔ ان کا ایک بڑا کمال یہ بھی تھا کہ یہی اوصاف وہ اپنی قوم میں بھی پیدا کرتے رہے اور کسی حالت میں بھی قوم کو دل گرفتہ اور دل شکستہ نہ ہونے دیا۔ محض اپنی فراست، مستقل مزاجی اور بلند حوصلگی سے اپنے سے زیادہ طاقتور دشمنوں کا مقابلہ کیا اور ایک عرصے تک مذاکراتی میزوں پر اور عملی سیاست کے میدان میں جنگیں لڑیں۔

پاکستان کا حصول محض ان شخصی صفات کی وجہ سے آسان ہو سکا جو قدرت نے قائداعظم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں پیدا کی تھیں اور قائداعظم نے ان کے ذریعے سے قوم کو متحد اور اسے مستعد بنا کر اسے پاکستان کی منزل تک پہنچایا۔

---

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چند خوبصورت کتب

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

شبلی نعمانی اور سلیمان ندوی

کی شاہکار تالیف ۔ سیرت النبیؐ پر مستند کتاب

چھ شاندار جلدوں میں ۔ قیمت کامل : -/۱۸۰ روپے

محسن اعظم

ابوالقاسم رفیق دلاوری

حضورؐ کا دشمنوں کے ساتھ سلوک، اپنے موضوع پر واحد کتاب۔

"روزنامہ مشرق" کہتا ہے:

"اس موضوع پر اردو میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو تفصیل و وضاحت کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے۔" قیمت : -/۳۰ روپے

سیرت المختار

شیخ مصطفیٰ الفلاییني

مترجم : ملک غلام علی (جج وفاقی شرعی عدالت)

سیرت النبیؐ پر مختصر مگر جامع کتاب۔ آخر میں حضورؐ کے ارشادات کا خلاصہ۔

قیمت : ۹ روپے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محسنِ اعظمؐ اور محسنینؓ — فقیر وحید الدین

حضورؐ پاک اور خلفائے راشدین کی حیاتِ طیبہ ایک نئے انداز میں

قیمت : ۱۵ روپے

عربؐ کا چاند — سوامی لکشمن پرشاد

ایک ہندو نوجوان کے قلم سے سیرتِ طیبہ عاشقانہ رنگ سے لبریز۔

قیمت : ۹ روپے

حیاتِ رسولؐ — سوالاً جواباً — علی اصغر چودھری

سیرتِ رسولؐ پر معلوماتی کتاب ۹۰۰ سوال و جواب ریڈیو، ٹیلیویژن اور دیگر معلوماتی پروگراموں کے لیے گائیڈ بک

قیمت صرف ۶/۷۵

رسول اور سنّتِ رسولؐ — نعیم صدیقی

قرآن اور عقلِ سلیم کی روشنی میں سنّت کا مقام

قیمت : ۹ روپے

ارشاداتِ رسولؐ — ظفر اللہ خان

حضورؐ کے ارشادات کا حسین گلدستہ، پاکٹ سائز

قیمت : ۲/۲۵ روپے

مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اردو بازار، لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی عقیدہ

شیخ محمد غزالی

مترجم: عنایت اللہ سبحانی

مشہور اخوانی مصنف کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں مدلل انداز میں اسلامی عقیدہ پر بحث کی گئی ہے۔

قیمت : -/۳۶ روپے

عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح پر ایک نظر

سید احمد قادری

مولانا مودودی کی شہرۂ آفاق تالیف "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" پر لکھنؤ کے مولانا ابوالحسن ندوی نے تنقیدی کتاب لکھی جس کا جواب مولانا سید احمد قادری نے نہایت مدلل انداز میں دیا۔

قیمت : -/۹ روپے

اعترافِ عظمت

عین الحسین فون

سید مودودیؒ کی وفات پر مشاہیر اہلِ قلم کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی خصوصی تحریریں۔

قیمت : -/۳۹ روپے

مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اردو بازار، لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری چند دیگر مطبوعات

مناظرِ قیامت	سید قطب شہید	۳۰/- روپے
درودِ سلام	سید مودودیؒ	۱/- "
ادعیۃ القرآن	ڈپٹی نذیر احمد	
قربانی کی حقیقت	مولانا حمید الدین فراہی	۶/- "
آمۂ تلبیس (دو حصص)	ابوالقاسم رفیق دلاوری	۶۰/- "
تصویریں	اسعد گیلانی	۹/- "
روزگارِ فقیر (دو حصص)	فقیر وحید الدین	۵۴/- "
اقبال اور مودودیؒ	ابو راشد فاروقی	۷/۵۰ "
امام احمد بن حنبل	نصر اللہ خاں	۶/- "
نوجوانوں کے مسائل اور انکا حل	علی اصغر چودھری	۱۵/- "
سیرتِ اصحابِ رسولؐ	سید مودودیؒ	۱۰/۵۰ "
مسلمات	فاروق قادری	۶/- "
پھلوں سے علاج	حکیم محمد عبداللہ	۸/- "

مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، اردو بازار، لاہور

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہمارا بہترین کتب

ارشادات رسول	ظفر اللہ خاں
جوامع الکلم	مصطفیٰ الغلاییني
ادعیۃ القرآن	ڈپٹی نذیر احمد
مناظر قیامت	سید قطب شہید
درود و سلام	سید مودودیؒ
تزکیۂ نفس	حسن البنا شہید
محسن اعظمؐ	ابوالقاسم رفیق دلاوری
سیرت المختارؐ	مترجم جسٹس ملک غلام علی
عرب کا چاندؐ	سوامی لکشمن پرشاد
سید البشرؐ	قاضی محمد سلیمان منصور پوری
رسول اور سنت رسولؐ	نعیم صدیقی
محسن اعظم اور محسنین	فقیر وحید الدین
اذکار آزاد	ابوالکلام آزاد
قربانی کی حقیقت	امین احسن اصلاحی
امۃ تلبیس	ابوالقاسم رفیق دلاوری
غزوات مقدس	عنایت اللہ وارثی
روزگار فقیر	فقیر وحید الدین
اسلامی عقیدہ	شیخ محمد غزالی
یاران نبیؐ	عابد نظامی
امام احمد بن حنبل	ملک نصر اللہ خاں عزیز
اعتراف عظمت	عین الحسین لون
رسالۃ الحج	انگریزی ـــ اردو
حیات رسول (کوئز بک)	علی اصغر چودھری

ناشران :

مکتبہ تعمیر انسانیت

موچی دروازہ

اردو بازار ـــــ لاہور